اکتوبر 2014

ماہنامہ

حنا

پاک سوسائٹی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد حکیم خان حکیم 7
نعت ادا جعفری 7
پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں سید اختر ناز 8

انشاء نامہ

پیٹ کے درد میں ابن انشاء 12

انٹرویو

ایک دن حنا کے نام سدرۃ المنتہیٰ 14

ناولٹ

کھجور میں اٹکے عابی ناز 129
آخری خواہش حبیبہ طارق 168

مکمل ناول

روشنی کی خواہش میں ام مریم 16
اداس رستہ شام کا مدیحہ تبسم 62

افسانے

انما الاعمال بالنیات دعا فاطمہ 157
تم لوٹ آنا ہما راؤ 195
مسیحائی مہک فاطمہ 207
میرے بچے فرحین اظفر 213
وطن سلامت رہے حیاء بخاری 225
اک لمحہ زیست صبا جاوید 231

انتباہ: ماہنامہ حنا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، اور نہ کسی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار قسط کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کاروائی کی جا سکتی ہے۔

مستقل سلسلے

حاصل مطالعہ تحریم محمود 239
بیاض تسنیم طاہر 250
رنگ حنا بلقیس بھٹی 245
میری ڈائری سے صائمہ محمو 242
چٹکیاں شگفتہ شاہ 236
حنا کی محفل عین غین 248
حنا کا دسترخوان افراح طارق 253
کس قیامت کے یہ نامے فوزیہ شفیق 256

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماھنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

کچھ باتیں ہماری

قارئین کرام! اکتوبر 2014ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

اسلام آباد میں جاری دھرنوں کو تادم تحریر پانچ ہفتوں سے اوپر ہو گئے ہیں۔ مگر اب تک اس بحران کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا۔ اس دوران کئی ایسے واقعات پیش آئے جن سے نہ صرف امن و امان کی صورتحال مخدوش ہوئی بلکہ سسٹم کے وجود کو خطرہ لاحق ہوا۔ اسی لئے محب وطن حلقے زور دے رہے ہیں کہ دونوں فریق ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے بحران کے حل کے لئے کسی نتیجے پر پہنچیں۔ دھرنوں میں طوالت کسی فریق کے لئے بھی فائدہ مند نہیں ہے۔ ملک وقوم کا نقصان ہو رہا ہے۔ معیشت کو سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ایک کھرب روپے سے زائد کا نقصان ہو چکا ہے۔ تین ممالک کے صدور کے دورے امن وامان کی صورتحال کے باعث ملتوی ہو چکے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قومی سطح پر ہونے والے نقصان کا کسی فریق کو بھی احساس نہیں ہے۔

بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو اس بحران کی ذمہ دار حکومت ہے، اگر مخالف فریق کی شکایات پر بروقت کاروائی کی جاتی تو دھرنوں تک نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن دھرنوں کے قائدین کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ ان کا احتجاج تو ریکارڈ ہو گیا مگر اس کو طول دینے سے ملک کی معیشت کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ سیلاب جیسی قدرتی آفت نے ملک میں تباہی مچائی ہوئی ہے۔ یہ وقت تمام اختلافات بھلا کر سیلاب سے متاثرہ خاندانوں کی مدد کرنے کا ہے۔ ہمارے خیال میں دونوں فریقین کو اپنی اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سیاسی جرگے کے پیش کردہ فارمولے کے قبول کرتے ہوئے اس بحران کو حل کر لینا چاہیے۔

اس شمارے میں:۔ ایک دن حنا کے ساتھ میں سدرۃ المنتہیٰ اپنے شب وروز کے ساتھ، اُم مریم اور مدیحہ تبسم کے مکمل ناول، عابی ناز، حبیبہ طارق کے ناولٹ، دعا فاطمہ، ہما راؤ، ملک فاطمہ، فرحین اظفر، حیاء بخاری اور صبا جاوید کے افسانے سدرۃ المنتہیٰ کا سلسلے وار ناول کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

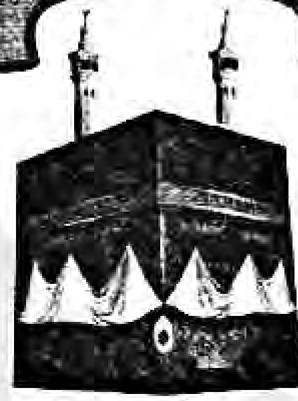

حمد
باری تعالیٰ جل جلالہ

طوفاں میں جیسے دور سے ساحل دکھائی دے
میں ان کو سوچ لوں مجھے منزل دکھائی دے

یہ اور راستے ہیں حدی خواں! سنبھل کے چل
طیبہ کا ذرہ ذرہ مجھے دل دکھائی دے

گم ہو نہ جاؤں راہ میں اے صاحب کرم
اک بار پھر جادہ منزل دکھائی دے

طرز دعا بھی سونپ رہی ہوں نگاہ کو
کیوں صرف التجاؤں میں حائل دکھائی دے

وہ راہرو نہیں ہے اسے کارواں کہو
اس در کی آرزو میں جو شامل دکھائی دے

ل جائیں گے وہیں سے اجالے جہاں ادا
تنویر لہر د ماہ بھی سائل دکھائی دے

نعت
رسول مقبول ﷺ

مین پہ اور آسماں پہ الٰہی
ر ہے ترا ہر زباں پہ الٰہی

ی دسترس سے نہیں کوئی باہر
حاکم ہے سب جہاں پہ الٰہی

تزاں رت میں گل کھلائے ہیں تو نے
م ہے ترا گلستان پہ الٰہی

لانے کو بے تاب ہیں بجلیاں
نظر ہو مرے آشیاں پہ الٰہی

مادیں دل کی وہ پا کر ہی جائے
آئے ترے آستاں پہ الٰہی

ں ہے مرا اس جہاں میں کوئی
ا نام ہے بس زباں پہ الٰہی

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں

سید اختر ناز

ممانعت

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے مقام بقیع میں دوسرے کو پکارا۔

''اے ابولقاسم!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُدھر دیکھا تو وہ شخص بولا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں پکارا تھا بلکہ فلاں شخص کو پکارا تھا (اس کی کنیت بھی ابوالقاسم ہوگی)۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''میرے نام سے نام رکھو مگر میری کنیت کی طرح کنیت مت رکھو۔''

(مسلم)

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ نام رکھنا

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔

''ہم میں سے ایک شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور اس کے اس کا نام محمد رکھا۔'' لوگوں نے کہا۔

''ہم تجھے کنیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام سے نہیں رکھیں گے، (یعنی تجھے ابومحمد نہیں کہیں گے) جب تک تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت نہ لے۔''

وہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''میرا ایک لڑکا پیدا ہوا ہے تو میں نے اس کا نام محمد رکھا تو میری قوم کے لوگ اس نام کی اجازت، مجھے دینے سے انکار کرتے ہیں (جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجازت نہ دیں)۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''میرے نام پر نام رکھو لیکن میری کنیت نہ رکھو کیونکہ میں قاسم ہوں، میں تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں (دین کا علم اور مال غنیمت وغیرہ)۔''

(مسلم)

اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین نام

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''تمہارے ناموں میں سے بہترین نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ہیں، عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔''

بچے کا نام عبدالرحمٰن رکھنا

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے ایک شخص کے لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام قاسم رکھا تو ہم لوگوں نے کہا کہ تجھے ابوالقاسم کنیت نہ دیں گے اور تیری آنکھ ٹھنڈی نہ کریں گے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور یہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اپنے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن رکھ لو۔''

(مسلم)

ہاتھ پھیرنا اور اس کے لئے دعا کرنا

عروہ بن زبیر اور فاطمہ بنت منذر بن زبیر سے روایت ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا (مکہ سے) ہجرت کی نیت سے اس وقت نکلیں تو ان کے پیٹ میں عبداللہ بن زبیر تھے، جب وہ قبا میں آکر اتریں تو وہاں سیدنا عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے، پھر انہیں لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو گھٹی دیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے لے لیا، اپنی گود میں بٹھایا پھر ایک کھجور منگوائی، ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ ہم ایک گھڑی تک کھجور ڈھونڈتے رہے۔

آخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھجور کو چبایا پھر (اس کا جوس) ان کے منہ میں ڈال دیا تو پہلی چیز جو عبداللہ کے پیٹ میں پہنچی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لعاب تھا، سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لئے دعا کی اور ان کا نام عبداللہ رکھا اور جب وہ سات یا آٹھ برس کے ہوئے تو سیدنا زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اشارے پہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کے لئے آئے تو جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آتے دیکھا تو تبسم فرمایا پھر ان سے (برکت کے لئے) بیعت کی، (کیونکہ وہ کمسن تھے)۔

عبداللہ نام رکھنا

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ابوطلحہ کا ایک لڑکا بیمار تھا تو سیدنا ابوطلحہ باہر گئے ہوئے تھے، وہ لڑکا مر گیا، جب وہ لوٹ کر آئے تو انہوں نے پوچھا۔

''میرا بچہ کیسا ہے؟'' (ان کی بیوی) ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا۔

''اب پہلے کی نسبت اس کو آرام ہے۔''

(یہ موت کی طرف اشارہ ہے اور کچھ جھوٹ بھی نہیں)

پھر اُم سلیم شام کا کھانا ان کے پاس لائیں تو انہوں نے کھایا، اس کے بعد اُم سلیم سے محبت کی، فارغ ہوئے تو اُم سلیم نے کہا۔

''جاؤ بچہ کو دفن کر دو۔''

پھر صبح کو ابوطلحہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب حال بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ۔

''کیا تم نے رات کو اپنی بیوی سے محبت کی تھی؟''

ابوطلحہ نے کہا۔

''ہاں۔'' پھر آپؐ نے دعا کی۔

''اے اللہ! ان دونوں کو برکت دے۔''

پھر اُم سلیم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو ابوطلحہ سے کہا۔

''اس بچہ کو اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے جاؤ۔'' اور اُم سلیم نے بچے کے ساتھ تھوڑی کھجوریں بھیجیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بچے کو لے لیا اور پوچھا۔

''اس کے ساتھ کچھ ہے؟''

لوگوں نے کہا۔

''کھجوریں ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھجوروں کو لے کر چبایا پھر اپنے منہ سے نکال کر بچے کے منہ میں ڈالا پھر اس کا نام عبداللہ رکھا۔

(مسلم)

انبیاء اور صالحین کے نام

سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب میں نجران میں آیا تو وہاں کے (انصاری) لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا۔

''تم (سورہ مریم میں) پڑھتے ہو کہ ''اے ہارون کی بہن۔'' (یعنی مریم علیہ السلام کو ہارون کی بہن کہا ہے) حالانکہ (سیدنا ہارون، موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے اور) موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام سے اتنی مدت پہلے تھے (پھر مریم ہارون علیہ السلام کی بہن کیونکر ہو سکتی ہیں؟)

جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

(یہ وہ ہارون تھوڑی ہیں جو موسیٰ کے بھائی تھے) بلکہ بنی اسرائیل کی عادت تھی (جیسے اب سب کی عادت ہے) کہ یہ پیغمبروں اور اگلے نیکوں کے نام پر نام رکھتے تھے۔''

(مسلم)

بچے کا نام ابراہیم رکھنا

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میرا ایک لڑکا پیدا ہوا تو میں اس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور اس کے منہ میں ایک کھجور چبا کر ڈالی۔

(مسلم)

بچے کا نام منذر رکھنا

سہل بن سعد کہتے ہیں کہ ابو اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیٹا منذر جب پیدا ہوا تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو اپنی ران پر رکھا اور (اس کے والد) ابو اسید بیٹھے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی چیز میں اپنے سامنے متوجہ ہوئے تو وہ بچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ران پر سے اٹھا لیا گیا تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیال آیا تو فرمایا۔

''بچہ کہاں ہے؟''

سیدنا اسید نے کہا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے اس کو اٹھا لیا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اس کا نام کیا ہے؟''

ابو اسید نے کہا۔

''فلاں نام ہے۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''نہیں، اس کا نام منذر ہے۔'' پھر اس دن سے انہوں نے اس کا نام منذر ہی رکھ دیا۔

(مسلم)

''برہ'' کا نام جویریہ رکھنا

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔

''ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا کا نام پہلے برہ تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا نام جویریہ رکھ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برا جانتے تھے کہ یہ کہا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برہ (نیکوکار بیوی کے گھر) سے چلے گئے۔''

(مسلم)

''برہ'' کا نام زینب رکھنا

محمد بن عمر بن عطاء کہتے ہیں۔

''میں نے اپنی بیٹی کا نام برہ رکھا تو زینب بنت ابی سلمہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے اور میرا نام بھی برہ تھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اپنی تعریف مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں بہترین کون ہے۔''

لوگوں نے عرض کیا۔

''پھر ہم اس کا کیا نام رکھیں۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''زینب رکھو۔''

(مسلم)

انگور کا نام ''کرم'' رکھنے کا بیان

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''کوئی تم میں سے انگور کو ''کرم'' نہ کہے اس لئے کہ ''کرم'' مسلمان آدمی کو کہتے ہیں۔''

(مسلم)

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''(انگور کو) کرم بہت کہو بلکہ عنب کہو یا حبلہ کہو۔''

(مسلم)

افلح، رباح، یسار اور نافع نام رکھنے کی ممانعت

نیو وکی لائبریری اینڈ اولڈ بکس سینٹر
صدر بازار ہری پور ہزارہ
جلد ساز
پر. طاہر محمود

سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اپنے غلاموں کے چار نام رکھنے سے منع فرمایا، افلح، رباح، یسار اور نافع۔''

(مسلم)

سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ کو چار کلمات سب سے زیادہ پسند ہیں، سبحان اللہ، الحمدللہ، ولا اللہ، واللہ اکبر، ان میں سے جس کو چاہے پہلے کہے، کوئی نقصان نہ ہو گا اور اپنے غلام کا نام یسار اور رباح اور نجیح (اس کے وہی معنی ہیں جو افلح کے ہیں) اور اسے نہ رکھو، اس لئے کہ تو پوچھے گا کہ وہ وہاں ہے (یعنی یسار یا رباح یا نجیح یا افلح) وہ کہے گا، نہیں ہے۔''

''سمرہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ہی چار نام فرمایا تو مجھ سے زیادہ نام بیان نہ کرنا۔''

(مسلم)

اچھا نام تبدیل کرنا

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بیٹی کا نام عاصیہ تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا۔

☆☆☆

پیٹ کے درد میں

ابن انشاء

اخبار جہاں میں ایک مراسلہ دیکھا کہ وطن عزیز میں ایک سرجن نے ایک مریض کا آپریشن کیا اور وہ صاحب تندرست ہو کر ٹانکے لگوا کر چلے گئے، لیکن تھوڑی دنوں بعد پیٹ میں درد کی شکایت شروع کر دی، عزیزوں نے سوڈا واٹر پلوایا، چورن کھلوایا، جلاب دیا لیکن شکایت رفع نہ ہوئی اسی عطار سے، یعنی اسی ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے کہا۔

"بابا میرا کام آپریشن کرنا ہے، پیٹ کا درد دور کرنا نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے مریض کو وہم ہے اور اس کا علاج جدید ڈاکٹری میں کیا، قدیم طب تک میں نہیں ہے، اس کے آگے حکیم لقمان تک جو زنانہ و مردانہ پیچیدہ و غیر پیچیدہ، سنجیدہ و غیر سنجیدہ، دیرانہ و غیر دینہ امراض کے مریضوں کا آخری سہارا تھے، لاچار تھے۔"

عزیزوں کے پرزور اصرار پر ایکسرے کرایا گیا تو آنتوں کے درمیان ایک قینچی نظر آئی، آپریشن کرنے والے ڈاکٹر نے کہا۔

"بابا یہ بھی تمہارا واہمہ ہے، پیٹ کے اندر بعض ہڈیاں قینچی کی شکل کی ہوتی ہیں۔"

لیکن آج کل زمانہ ایسا آن لگا ہے کہ لوگ ڈاکٹر کی زبان کا کم ایکس رے کا زیادہ اعتبار کرتے ہیں، حالانکہ ڈاکٹر صاحب اپنے فن کے ماہر ہیں، جس کی شہادت ان کے مریض دیں گے، جن میں سے آدھے اس دنیا میں ہیں، آدھے اس دنیا میں بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔

آخر ایک دوسرے سرجن نے آپریشن کیا اور اسے حسن اتفاق کہیے کہ قینچی نکل بھی آئی۔

☆☆☆

اتنی سی بات تھی جسے لوگوں نے یعنی مذکورہ مریض کے لواحقین نے جو بصورت دیگر ان کے پسماندگان کہلاتے، افسانہ کر دیا، آخر قینچی ہی تو تھی، کلہاڑا تو نہیں تھا اور یہ پہلے ڈاکٹر کی دیانت اور سیر چشمی نہیں تو کیا ہے کہ انہوں نے قینچی کو دیکھ کر کہا۔

"یہ میری نہیں ہے، مریض چاہے تو اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔"

اگر بالفرض یہ ان ڈاکٹر صاحب کی تھی بھی تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے مریض کے پیٹ میں اپنی طرف سے کچھ ڈالا ہی، کچھ نکالا تو نہیں، اگر مریض کے پیٹ میں پہلے سے قینچی ہوتی اور ڈاکٹر صاحب اسے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیتے تو البتہ اعتراض کی بات ہوتی، مریض کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اسے بیٹھے بٹھائے اتنی اچھی چیز مل گئی، ہم نے پچھلے دنوں آپریشن کرایا، اس میں تو کچھ نہیں نکلا جو ہمارے کام آ سکتا، بہر حال یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔

قینچی کے بڑے فائدے ہیں، اس سے بال کاٹے جا سکتے ہیں، مونچھیں تراشی جا سکتی ہیں، کان کاٹے جا سکتے ہیں، ناخن کاٹے جا سکتے ہیں، لوگوں کے کپڑے کاٹے جا سکتے ہیں، پورے کپڑوں کے علاوہ خالی جیبیں بھی کاٹی جا سکتی ہیں اور بے روزگاری کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ کسی کارخانے وغیرہ کے افتتاح کا فیتہ کاٹنے کے لئے بھی قینچی درکار ہوتی ہے، اس کے بغیر کارخانہ نہیں چل سکتا، گویا ساری مشین ایک طرف اور قینچی ایک طرف، انسان کا رشتہ، حیات جلد قطع کرنے کے لئے سگریٹ مجرب اور آزمودہ چیز ہے، شاید اسی لئے ایک مشہور سگریٹ کا نام قینچی رکھا گیا۔

☆☆☆

آدمی تھوڑا سا (زیادہ نہیں) لکھا پڑھا تو قینچی کی بدولت نامی گرامی جرنلسٹ بھی بن سکتا ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ فی زمانہ ایڈیٹر یا جرنلسٹ یا کالم نگار بننے کے لئے قلم اتنا کام نہیں آتا جتنی قینچی کام آتی ہے، بعض اخبار تو پورے کے پورے قینچی سے مرتب ہوتے ہیں، ایک بزرگ نے تو اسی حقیقت کے اعتراف میں اپنے اخبار کا نام ہفت روزہ قینچی تجویز کیا تھا، کیونکہ فی الحال ہمارے معاشرے میں بال کاٹنے والوں کے مقابلے میں بال کٹوانے والوں بلکہ بال نہ کٹوانے والوں کی اکثریت ہے، یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنے سر کے بال کٹوانے سے کتراتے ہیں وہ ہفت روزہ قینچی کی سرپرستی کیوں کرنے لگے۔

قینچی سے اخبار مرتب کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ مضمون نگاروں کی خوشامد نہیں کرنی پڑتی اور کاتبوں کے ناز نہیں اٹھانے پڑتے، تراشہ نیچے رکھا اور اس کی قلم نکالی اور جوڑ دی، حوالہ دینے کا ہمارے ملک میں رواج نہیں، حالانکہ دوسرے ملکوں میں حوالہ نہ دینے والوں کو حوالہ پولیس تک کیا جا سکتا ہے، بہت مہربانی کی تو مثال کے طور پر خبر یا فیچر کے شروع یا آخر میں بریکٹ میں لکھ دیا، (ا-ج) یہ انشاء جی یا اللہ جوایا بھی ہو سکتا ہے جس نے اخبار ہذا کے لئے نامہ نگار کے طور پر محنت شاقہ سے خبر حاصل کی یا مضمون بنایا......

ایڈیٹر کو ازراہ ایثار اس پر اپنا نام دینا پڑا، بقول شخصے نام میں کیا دھرا ہے، لوگوں کو تو شعر پڑھنے سے یعنی آم کھانے سے مطلب ہے پیڑ کون گنتا ہے؟

اس معاملے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے، اس مریض سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس نے اتنے دن یہ قینچی کیوں اپنے پیٹ میں چھپائے رکھی؟ یہ ہسپتال کی جائیداد تھی، مریض کے باوا کا مال نہیں تھا، ہسپتال میں اس کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے، کسی نرس کو اپنے ناخن کاٹنے ہوں، بھویں تراشنی اور چتون تیکھی کرنی ہو، کسی ڈاکٹر کو اخبار سے معمہ کاٹنا ہو کہ آپریشن بھی کرتے جائیں، دل بہلانے کے لئے غور و فکر بھی کرتے جائیں کہ ذیل کے فقرے میں

اکبر کے زمانے میں...... اور بکری ایک گھاٹ پیتے تھے، خالی جگہ میں لفظ "شیر" رکھنا زیادہ مناسب ہو گا یا "بھیڑ" زیادہ موزوں رہے گا، جو محاورے سے دور لیکن عقل کے زیادہ قریب ہے، بہرحال اس مریض کے خلاف پرچہ کٹنا چاہیے اور اسی قینچی سے کٹنا چاہیے تاکہ آئندہ کوئی مریض، چھری، چاقو، قینچی، بستر کی چادر، تکیہ، ڈاکٹر صاحب کی عینک، اسٹیتھسکوپ، نرس کی نیل پالش اسٹک، وارڈ بوائے کی نسوار کی ڈبیہ یا فلمی گانوں کی کاپی اٹھا کر پیٹ میں نہ رکھ لے، آج کل کے مریضوں کا کچھ اعتبار نہیں، ایک مریض کے پیٹ میں سے تو آپریشن کرنے پر داڑھی نکلی، تحقیق پر معلوم ہوا کہ ان کی اپنی نہیں تھی، اس ڈاکٹر کی تھی جنہوں نے کہیں پہلے ان کا آپریشن کیا تھا، بے چارے بہت دنوں لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے رہے جب تک کہ نئی داڑھی نہیں آ گئی۔

☆☆☆

ایک دن حنا کے ساتھ

سدرۃ المنتہیٰ

دن صبح کی پہلی کرن پھوٹتے ہی شروع ہو جاتا ہے، مگر ہم جیسے نکموں کا دن تقریباً دن دوپہر میں ڈھلتے وقت شروع ہوتا ہے، یا پھر دن ڈھلتے وقت شروع ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دن تمام ہو رہا ہوتا ہے تبھی دن کے کام شروع ہوتے ہیں، مگر کبھی آنکھ کھلنے کے بعد نماز کا احساس ہوتا ہے اور ادائیگی کے بعد پھر سے بستر آباد ہو جاتا ہے اور پھر آنکھ کھلتی ہے تو گھڑی دس گیارہ بجا رہی ہوتی ہے۔

چولہے پر چائے رکھ کر خود اپنے آپ پر یہ احسان ہوتا ہے اور اس کے بعد تلاوت کلام پاک کا ٹائم ہوتا ہے، بظاہر زبان چل رہی ہوتی ہے اور ذہن میں چل رہے ہیں کئی طرح کے خیالات کب کلام پاک زبان سے دل میں دل سے روح تک اترے گا، ہم بھی عجیب مسلمان ہو گئے ہیں حلق سے نیچے نہیں اترتا، بس پڑھتے جا رہے ہیں ثواب تو ملتا ہے پر قرار نہیں ملتا، اللہ زندگی دے عمیرہ احمد کو جس نے ایک تحریر میں لکھا تھا ہم قرآن ثواب کے لئے پڑھتے ہیں اس لئے ثواب ملتا ہے سکون کے لئے پڑھیں تو سکون بھی ملے، اللہ ان کے قلم کی تازگی بھی برقرار رکھے اور لہجے کی شگفتگی بھی آمین۔

اس کے بعد جیسے تلاوت کا حق ادا کر کے اٹھو تو وقت بارہ سے آگے کھسک جاتا ہے، اگر آج اتوار ہے تو دوپہر کا کھانا صرف سالن بنانا میری زمہ داری ہے، کیونکہ آج کے دن گھر پہ دھوبی گھاٹ کھلتا ہے اور باورچی بن جاتے ہیں دھوبی اور نکمے بن جاتے ہیں، باورچی تین مجھ سے چھوٹی بہنیں ہیں، سارا گھر سنبھال رکھا ہے اس لئے میری باری کم ہی آتی ہے گھر کے کام کی۔

اگر یہ اتوار نہیں ہے تو صبح کے بعد دوپہر، یا کسی سے بات کرنے یا لکھتے پڑھتے ٹہلتے کھاتے گزر جاتی ہے، کبھی کبھار میری پیاری شفاء نبوی (بھتیجی) کی خاص نظر کرم ہوتی ہے تو اس کے پیچھے پیچھے پھرتے وقت گزرتا ہے ایسے بی ہیو کرتی ہے میرے ساتھ جیسے میں اس کی اسٹوڈنٹ ہوں اور وہ میری ٹیچر، ایک کہانی سنے گی تو دو سنائے گی، اٹھنے کے لئے کہے گی تو اٹھنا ہوگا بیٹھنے کا حکم ہوگا تو بیٹھنا پڑے گا، کبھی میرے کاغذ ہاتھ میں اور اسی جگہ لکھنا ہوگا جہاں یہ میں نے لکھا تھا، لو جی اب کہانی کا سین دوبارہ لکھنا پڑے گا، کبھی کھانے پینے کے لئے راضی کرنا پڑے تو سو کہانیاں آگے پیچھے پھرتے تھک جاتی ہیں۔

شفاء دیکھو بادل ہیں آسمان پہ یہ بھی کھانا کھاتے ہیں تم بھی کھاؤ اور آگے کی کہانی محترمہ خود مکمل کریں گی نانی کی گود میں دودھ پی کر آئے ہیں؟

ہمیں فرماں بردار شاگردوں کا طرح اثبات میں سر ہلانا پڑتا ہے۔

”پیمپر پہنتے ہیں؟“

”ہاں جی یہ کام بھی کرتے ہیں۔“

اب ریکارڈ لگ جائے گا بادل صرف کھانا ہی نہیں کھاتے بلکہ نانی کی گود میں چڑھ کر دودھ پی آتے ہیں، پیمپر بھی پہنتے ہیں، اچھے بچے جو

ہوئے...... ہاہا۔

اب نماز ظہر کے بعد یا تو ذہن میں چلتی پھرتی کہانیوں کو تھوڑا ٹائم دے دیا جو اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اکسائی رہتی ہیں، کردار کچھ کرنے ہی نہیں دیتے اور جب قلم اٹھاؤ تو بھاگ جاتے ہیں چھپن چھپائی کھیلنے لگتے ہیں تو کبھی سامنے آ کر ایسے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ذہن کہیں اور نکلتا ہی نہیں، لکھنے کا کوئی وقت مقرر نہیں کبھی صبح کبھی دوپہر کبھی شام کبھی رات، جب کہانی مہربان ہو تب سو کام پیچھے اور قلم آگے، پھر دوپہر کا کام شام شام کا رات اور رات کا صبح ہوتا رہتا ہے، عصر کی نماز کے بعد درود پاک کی تسبیح اور یہ ہوگئی مغرب اور ختم ہوا بے ہنگم بے ترتیب بے کار مگر تھکا دینے والا دن، جس میں باڈی کبھی ریسٹ پر اور دماغ کام پر ہی ہوتا ہے، یہ سوتا ہی نہیں ہے سوچتا ہی رہتا ہے اسے کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

پھر یہی رات کچھ دیر ٹی وی نماز، رات کا کھانا ہلکی پھلکی واک، ایک کپ قہوہ، عابدہ پروین کی غزلیں یا پھر نعتیں سننے کا وقت اور یہی وقت کبھی انگریزی فلمیں کبھی کتاب کبھی لکھنے پر بھی صرف ہو سکتا ہے اور پھر ہو جاتے ہیں رات کے بارہ، اگر تو دوائی لی ہے تو نیند نے جکڑ لیا، ورنہ رات گئے تک تاروں سے بھرا آسمان اور کئی ذہنی خلفشار۔

سونے سے پہلے جاگنے والے خواب، اگلے دن کی پلاننگ جس میں سے ہوتا کچھ بھی نہیں ہے اور پھر رات میں سونے کے بعد آنے والے خواب جو کبھی نیند کی تعبیریں لگتی ہیں، کتنی بامقصد زندگی ہے، خواب خواب اور صرف خواب۔

گاؤں میں بچوں کا اچھا اسکول ہے، ڈھیر ساری بچیاں ہمارے سامنے سے گزر کر اسکول جا رہی ہیں، ایسے خواب ہیں، حرم پاک کی زیارت کا خواب آنکھیں لئے لئے پھرتی ہیں، مگر اس کے آگے قسمت کی ایک مشکل لکیر کھنچی ہوئی ہے وہ لکیر کیا بتاتی ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے ادھر تو بس امید پہ دنیا قائم ہے اور خوابوں کے دم سے آنکھیں آباد ہیں، منصوبے خواہش اور خوابوں کے پہناوے رنگین دنیا میں لے بھی جاتے ہیں مگر پھر لا پٹختے ہیں اسی حقیقت کے جہاں میں، ہو سکتا ہے دن جیسا گزر رہا ہے ویسا نہ گزرے آگے جا کر روٹین چینج ہو، مقصد بدل جائیں خواب بڑھ جائیں حسرتیں تو کبھی نہیں بدلیں گی نہ رکیں گی، دل کبیر احمد کی طرح حسرتوں پر پریشان ہے اور حرکتیں فنکار کی طرح بے ہنگم اور فضولیات کا مجمع ہیں، لفظ اور کوششیں امرت کی طرح تھک بھی جاتی ہیں جب رزلٹ ہمیشہ صفر آتا ہے، مگر ذہن علی گوہر کی طرح بہت آزاد نہ ہے نکلتا ہی نہیں حالانکہ زبان پر عمارہ کی طرح کئی شکوے بھی ہیں اور روح امر کلہ کی طرح بے چین پھرنے لگی ہے۔

لیجئے یہ ہے ہمارا ایک دن آپ کے ساتھ۔

☆☆☆

ہماری مطبوعات
قواعد اردو — مولوی عبدالحق
انتخاب کلام میر
[illegible] — [illegible]
[illegible]
[illegible] } رئیس احمد جعفری
[illegible]
اسلام کے [illegible] — رئیس احمد جعفری
[illegible] — [illegible]
لاہور اکیڈمی ۲۰۵ سرکلر روڈ — لاہور

روشنی کی خواہش میں

ام مریم

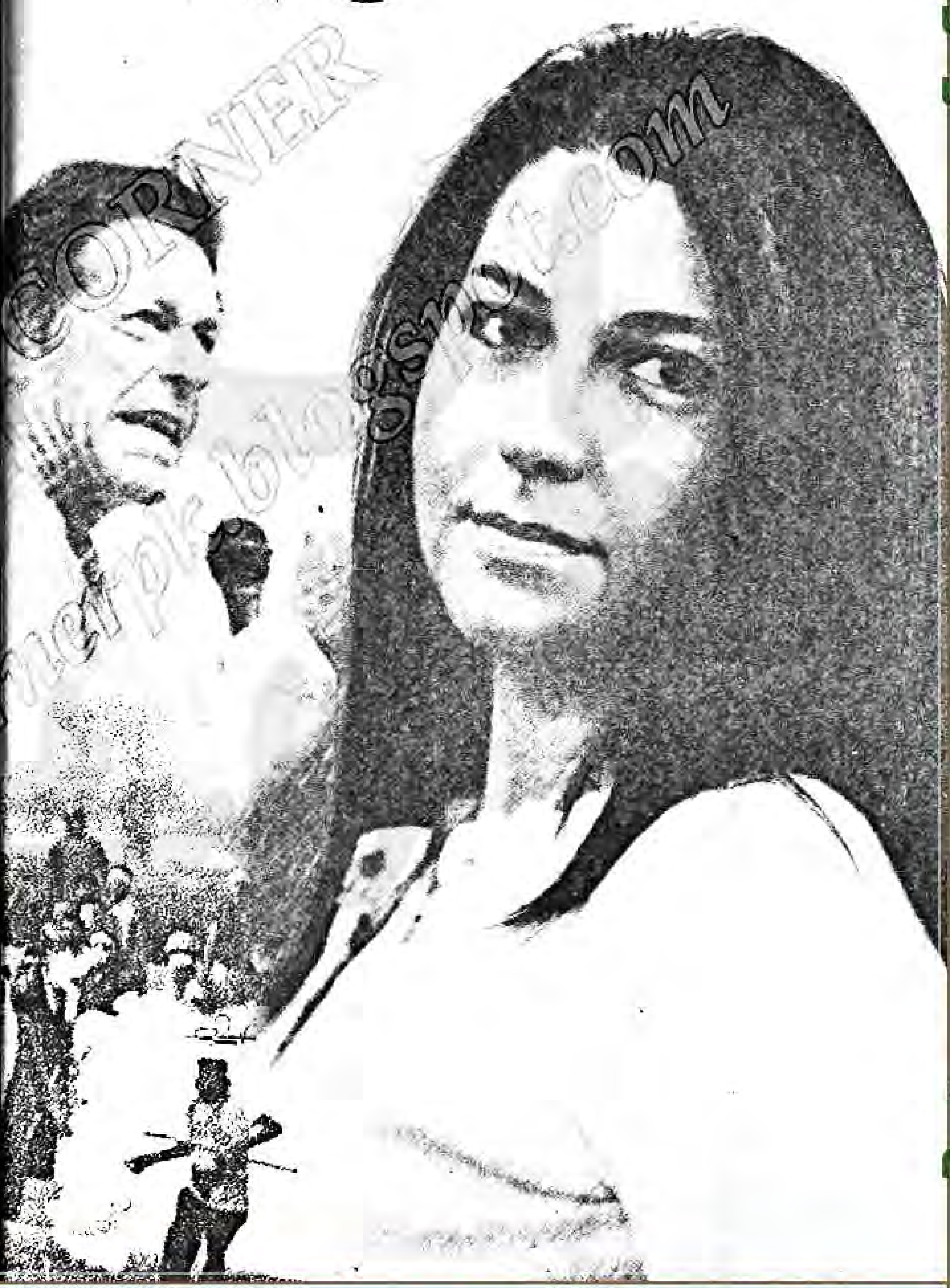

یکم اگست 2014ء
بنے گا نیا پاکستان
فلاح حیدر
کپتان کی طرف سے تمام سچے پاکستانیوں کے
نام
فرض کریں جنت کہیں نہیں ہے
آپ کوشش کریں تو یہ مشکل کام نہیں
ہمارے پاؤں کے نیچے کوئی دوزخ نہیں
سر کے اوپر آسمان ہے
فرض کریں سب لوگ لمحہ موجود میں زندہ رہیں
گے
فرض کریں یہاں اچھائی کی حد بندیاں نہیں
یہ کوئی مشکل کام نہیں
کسی کو قتل کرنے کسی کو مارنے کی ضرورت نہیں
فرض کریں سب لوگ امن کی زندگی بسر کرتے
ہیں
آپ کہہ سکتے ہیں میں خواب دیکھ رہا ہوں
یکن میں تنہا نہیں ہوں
ھے امید ہے کسی روز آپ بھی میرے ہم آواز
وں گے
ور ہمارا ملک یک جان یک قالب ہو گا
پ یہ کام کر سکتے ہیں
ج اور بھوک کا کوئی خوف نہیں
نوح آدم کے درمیان بھائی چارہ ہے
رض کریں
رض کریں
اگست میں انقلابی مارچ اور انقلابی دھرنے کا
زم پختہ...... ساتھ نبھانے کی خواہش کا اظہار)

☆☆☆

ں تو دیکھوں گا
م بھی دیکھو گے
جب روٹی سستی ہو گی

مکمل ناول

اور مہنگی ہو گی جاں
میں تو دیکھوں گا
تم بھی دیکھو گے

بیگ ہاتھ میں لئے دوسرے ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے اس نے کمرے میں قدم رکھا تھا تو مدھم مگر پر عزم پر یقین اور پر استقلال آواز نے اس کی تھکی ہوئی بے زار کن سماعتوں پہ اس کی مرضی و خواہش کے برعکس بہت ہولے سے بہت غیر محسوس انداز میں امید افزا تھپکی دی تھی، مگر کمرے کا گرم ماحول اور حبس اس کے تھکے ماندے اعصاب پہ مزید کشیدگی اور تناؤ طاری کرنے کا باعث بن گیا۔

''اے سی کیوں بند کر رکھا ہے؟ جبکہ لائٹ بھی ہے۔'' اس کا استفہامیہ لہجہ استعجابی ہو گیا، نظریں فلاح کی جانب اٹھ گئیں، جو ہاتھ کی پنکھی سے عبدالسمیع کو ہوا دینے میں مصروف تھی مگر نظریں ٹی وی اسکرین پہ جمی ہوئی تھیں، اس سوال پہ لمحہ بھر کو نگاہوں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا مگر حیدر کو اے سی آن کرتے پا کر بے اختیار چیخ پڑی۔

''ارے...... رے...... کیا کر رہے ہیں؟''

عبدالسمیع اس کی اس چیخ نما فریاد پہ اس کی گود میں کسمسایا تو اسے تھپکتی وہ جھلا کر حیدر کو گھورنے لگی، جو پلٹ کر اب اسے تنبیہی تادیب بھری نظروں سے گھورنا شروع کر چکا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہارا بیوی؟''

''ادھر بیٹھیں آ کے...... اے سی نہیں چلے گا، میں آپ کو ہاتھ سے ہوا دیتی ہوں نا۔'' وہ واقعی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بیڈ کی جانب کھینچ لائی تھی، حیدر کی حیرت دوچند ہونے لگی۔

''بٹ وائے فلاح! اے سی میں اگر فالٹ آ بھی گیا تھا تو مجھے بتا دیتیں فون کر کے مگر تب تک پنکھا تو آن کرتیں تم۔'' اس کی خاک سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کوئی بھی وجہ اس مشقت کی، فلاح نے جیسے عاجز ہو کر گہرا متاسفانہ قسم کا سانس بھرا اور ہاتھ سے ٹی وی کی جانب اشارہ کرتے والیوم بھی دانستہ بڑھا دیا۔

''ادھر دیکھیں...... کبھی نیوز بھی سن لی کریں، بندہ اپ ڈیٹ ہی رہتا ہے، کپتان ہماری وجہ سے یہ مشقت جھیل رہے ہیں، اگر وہ گرمی میں جھلس کر ہماری خاطر ہمارے حقوق کی جنگ لڑ سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں ان کی خاطر اتنا سکری فائز کر سکتے حیدر......!'' وضاحت طویل تھی، حیدر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، جن سے خفگی اضطراب اور بے چینی چھلکنے لگی تھی، مگر فلاح نہیں دیکھ سکی، اس کی گود میں بچہ تھا، نظریں ٹی وی اسکرین پہ موجود عمران خان پہ...... جو اپنی ازلی خوبروئی کے ساتھ اپنے جانثاروں کے ہمراہ سڑکوں پہ انقلابی مارچ کا نعرہ بلند کرتے نکل کھڑے ہوئے تھے، وہ ہونٹ بھینچے بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا، یہ خطرہ یہ اضطراب پھر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ زندگی میں اگر سب سے زیادہ کسی سے خائف رہا کرتا تھا، تو وہ عالی شان کپتان عمران خان ہی تھے، وجہ ظاہری بات ہے، فلاح حیدر کی ان کی ذات میں غیر معمولی دلچسپی تھی، اس کی جنتی جان جلتی فلاح اس قدر کپتان کی فیور کیا کرتی، ان کے درمیان متعدد بار اس موضوع پہ تلخی بھی ہو چکی تھی، مگر دونوں پھر بھی اپنے اپنے موقف پہ قائم تھے، حیدر نے پڑھ رکھا تھا اور اسے یہ کبھی بھولتا نہیں تھا، کہ بڑی عمر کا مرد اگر بہت زیادہ خوبرو بھی ہو اور باوقار بھی تو کم عمر لڑکیوں کے لئے بے پناہ اٹریکشن کا باعث لازمی ٹھہرتا ہے، وہ جتنا بھی کپتان سے خار کھاتا تھا مگر کبھی کھل کر ان سے نفرت ظاہر نہ کر سکا، کہ اس کی انا اجازت نہیں دیتی تھی فلاح کے سامنے اس کے اظہار کی، اس وقت بھی اس کے اعصاب جھنجھلاہٹ بھرے تناؤ کا شکار ہوتے چلے گئے تھے، منہ میں گویا کونین گھل گئی۔

''اٹھو...... اے سی آن کرو، میں گرمی سے بے حال ہوں، تمہیں ہری ہری سوجھ رہی ہیں۔'' وہ بولا تو اس کا لہجہ اس کا انداز بے حد برہمی بے حد تنفر سموئے ہوئے تھا، مگر فلاح نے یا تو سمجھا نہیں یا دانستہ نظر انداز کر دیا۔

''آپ کو ہوا چاہیے ناں؟ میں دے رہی ہوں۔'' فلاح کی ضد بھی انوکھی تھی، اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر پہ بٹھایا اور زور و شور سے پنکھی جھلنے لگی، حیدر کا جھلاہٹ کے ساتھ کوفت اور تلخی سے بھی برا حال ہو کر رہ گیا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے فلاح؟ حد ہوتی ہے کسی بھی حماقت کی، وہ بندہ پاگل ہے، اس کا مطلب ہے تم بھی......'' غصے میں طیش میں ابلتے ہوئے حیدر نے پنکھی اس سے چھین کر دور اچھال دی اور خود اسے جارحانہ نظروں سے گھورنے لگا، فلاح نے ٹھٹک کر، بلکہ صدمے میں گھر کر اسے دیکھا اور کچھ دیر تلک یونہی دیکھتی رہی تھی۔

''آپ کپتان کو پاگل کہہ رہے ہیں؟ اور ہم سب آپ کو احمق لگتے ہیں؟'' وہ بولی تو اس کی آواز پہ یاسیت کا رنج کا غلبہ تھا، حیدر اسے درشتی سے گھورنے میں مصروف رہا۔

''ہم بل دیتے ہیں فلاح اور......'' اس کی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو دیکھتا وہ ناچاہتے ہوئے بھی مفاہمت آمیز وضاحت پہ مجبور ہوا تھا کہ فلاح نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

''بیشک...... مگر انقلاب یونہی نہیں آ جایا کرتے ہیں حیدر! قربانی دینی پڑتی ہے، خود کو مارنا شرط ہے، آپ سسٹم کا حصہ نہ بنیں، آپ کو مراعات حاصل ہیں، جاب بہترین ہے، سیلری پرکشش ہے، پھر بھلا کیا پرواہ......؟ ہر شے جو پہنچ میں ہے، جو چاہا خریدا جو چاہا کھایا پیا اور اسی عیش میں سو گئے، حیدر...... آپ نے تھر کے علاقے کی بھوک دیکھی ہے؟ آپ نے کھارے پانی کا ذائقہ بھی نہیں چکھا، آپ کو کبھی آٹے کے ایک تھیلے کی خاطر دن بھر لائن میں کھڑے بھی نہیں ہونا پڑا، یا وہاں سے واپسی پہ اپنے کسی پیارے کی لاش کو جو وہاں کی بھیڑ میں کچلی گئی ہو...... اپنے غم سے بوجھل دل سے بھوک سے سکڑے پیٹ سے نہیں لگایا، آپ کو ایک رکشہ ڈرائیور کی اس مایوسی کا بھی اندازہ نہیں ہو گا، جو سرد راتوں میں پیٹرول یا سی این جی کے لئے گھنٹوں قطار میں انتظار کرنا اور باری آنے پہ پیٹرول ختم ہونے کے اعلان سمیت خالی لوٹنا پڑا ہو، جبھی آپ کو نہیں احساس کہ انقلاب کی اہمیت کتنی بڑھ گئی ہے، انقلاب اتنا ضروری کیوں ہو گیا ہے، حیدر صاحب آپ نے آج تک کسی معمولی خطا پہ بوری میں بند ملنے والی اپنے کسی عزیز کی لاش بھی وصول نہیں کی، چھوٹی سے لے کر بڑی سطح پہ ملک میں ٹھہر جانے والی کرپشن کا عالم کیا ہے آپ کو اس سے کیا لینا دینا۔'' وہ جذباتی تھی ہمیشہ سے، جبھی اس وقت بھی جذبات کی رو میں بہہ گئی تھی، جبھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور اس کا گلا بھرایا جا رہا تھا، یہ حیدر کا اس کے لئے ہمیشہ سے خیال تھا، جو ہمیشہ غصہ ہی دلاتا تھا، تپ ہی چڑھاتا تھا، سو اس وقت بھی اسے غصہ چڑھا تھا، تپ چڑھی تھی، ایسے میں وہ بھی کبھی لحاظ نہیں رکھتا تھا۔

''یہ سب تکلیفیں تو تمہیں بھی کبھی سہنا نہیں پڑی ہیں، پھر یہ اتنا درد کیوں اٹھ رہا ہے تمہیں؟'' وہ بولا تو اس کا لہجہ طنزیہ ہی نہیں خار

کھایا ہوا بھی تھا، اس نے آگے بڑھ کر اے سی بھی آن کر دیا تھا، اب وہ کوٹ اتار کر شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا، فلاح کا دکھ سے رنج سے برا حال ہوا تھا جیسے، کچھ دیر وہ یونہی آنکھوں میں آنسو بھرے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''آپ نے ٹھیک کہا ہے حیدر صاحب! یہ سب محرومیاں رب نے مجھے نہیں دیں، کپتان کو بھی نہیں دیں، انہوں نے بھی کبھی ان مسائل کا سامنا نہیں کیا ہوگا، مگر اللہ نے انہیں اور مجھے بھی اس بے حسی سے ضرور بچالیا ہے، احساس اور درد کی دولت عطا فرمائی ہے، جبھی وہ قوم کے تحفظات اور حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں وہاں باہر...... اور میں ان کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی ہوں، کہ جتنی جس کا بساط اتنی سعی اس پہ لازم ٹھہری، ایمان کے پہلے درجے پہ کپتان میں چاہے تیسرے پہ سہی مگر ہوں ضرور آپ اپنا موازنہ کرلیں، دنیا بہرحال چند روزہ ہی ہے۔''

ان کی بحث ایک بار پھر جھگڑے کا روپ دھارنے جارہی تھی، حیدر کا طیش میں سرخ پڑتا چہرہ گواہ تھا وہ اس پل کتنا برہم کس درجہ مشتعل ہو چکا ہے۔

''سب جانتا ہوں جتنا درد اور احساس بھرا ہوا ہے اس کپتان کے دل میں...... ارے بے وقوف بنا رہا ہے وہ تم جیسے سب احمقوں کو، محض اقتدار کی ہوس ہے اسے بھی، اچھی اچھی باتیں کرکے فورس بڑھا رہا ہے اپنی، اس وقت رنگ ڈھنگ دیکھنا اس کے جب کرسی پہ بیٹھے گا، ایسے لوگ بہت کم قیمت پہ بھی بک جاتے ہیں، پھر ساری بک بک بھی بند ہو جاتی ہے، آفر تو آنے دو کوئی اسے۔''

یہ تنفر، یہ وثوق، یہ بدگمانی...... اللہ اللہ! فلاح اسے کچھ دیر ساکن متاسفانہ نظروں سے دیکھتی رہی، پھر متاسفانہ گہرا سانس بھرا تھا۔

''سب ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں حیدر کرار صاحب، کپتان بکنے والے نہیں ہیں، نہ محض گفتار کے غازی، الحمدللہ ان کا ماضی شفاف ہے، ورنہ انہیں جس انداز میں رگیدا جاتا تھا سب جانتے ہیں، ورلڈ کپ 92 میں انہیں ایسی آفرز ہوئی تھیں، یہاں تک کہا گیا تھا کہ فائنل نہیں جیتنا اور ایسا اس وقت کی گورنمنٹ نے ہی کہا تھا، مگر نڈر بے باک قیادت کے حامی کپتان نے کسی قسم کا پریشر لینے اور دھمکی کی پرواہ کیے بغیر شان سے فتح حاصل کی تھی اللہ کے حکم سے تاریخ گواہ ہے کہ یہ سب واقعات بعد میں بھی دہرائے گئے، خاص کر 99 کے ورلڈ کپ فائنل میں، بھی قیادت کو ایسی صورتحال درپیش ہوئی تو اس وقت کا کیپٹن کپتان جیسی جرأت مندی کا مظاہرہ نہ کرسکے اور فتح سے ہمکنار ہونے کی بجائے بھونڈی شکست قبول کر لی، تجزیہ نگاروں کے مطابق پاکستان نے پلیٹ میں سجا کر ورلڈ کپ آسٹریلیا کو پیش کیا تھا، اس کے علاوہ کپتان نے مزید قوم سے محبت و اپنائیت کا اظہار کیا ہاسپٹل......''

''اچھا اچھا بس...... کان پک چکے ہیں میرے ان قصیدوں کو سن کر، کھانے کو اگر کچھ بنایا ہے تو لے آؤ، امید واثق ہے کہیں کپتان کے درشن کے چکروں میں کھانا بھی گول نہ ہوگیا ہو۔''

حیدر نے ناگواری سے ٹوک دیا تھا، فلاح کو غضب کا اختلاف ہوا تھا، حیدر آخری فقرے پہ، وہ ایسے ہر لمحے روہانسی ہوئی مرنے مارنے پہ بھی اتر آئی تھی، جب حیدر کپتان کے حوالے سے اس پہ ذرا برابر بھی شک کرتا تھا، وہ نہیں سمجھ سکتا تھا شاید کبھی بھی کہ کپتان اس کے لئے کتنے معتبر کسی درجہ قابل احترام تھے۔

☆☆☆

فلاح حیدر...... 2 اگست 2014ء

فیلنگ سیڈ

علامہ طاہر القادری ٹو پاکستان عوامی تحریک

مجھے ایک دل کی تلاش ہے
جس میں میرے لوگوں کے سکھ سانس لے سکیں
ستاستدانوں کے دل نہیں ہوتے
میرے لوگ امن اور انصاف کے بغیر پیدا ہوتے ہیں
زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں
ہم نے اپنے حق میں بولنا چاہا
ہماری آوازیں ہمارے حلقوم سے چپکا دی گئیں
ہم وہ لوگ ہیں حکمران جن سے جمع تفریق کا کھیل کھیلتے ہیں
کانچ کی آنکھ میں بصارت نہیں اگتی
میرے پاس گیت ہے آواز نہیں
تمہارے پاس گیت ہے آواز نہیں
آؤ اس گیت کو مل کر گائیں
کیونکہ پرندے گانا بھول چکے ہیں
میں انہیں امن کا گیت سنانا چاہتا ہوں
اور مجھے داد میں نفرت ملتی ہے
شاید میرے لوگ موت سے غلامی سے سمجھوتہ کر چکے ہیں
آؤ...... ہم بھی موت کے پروانے پر دستخط کریں
شاید اسی طرح ہم اپنے لوگوں کے لئے انصاف اور آزادی خرید سکیں

☆☆☆

جیتنا وئی عمران خان جیتنا
دوجیاں جماعتوں فیر بڑا پٹینا

وہ محو و مگن تھی، برتن دھو دھو کر ریک پہ رکھتی گنگنانے میں مصروف مگر حیدر کی کھنکار پہ خاموش تو ہوگئی، البتہ نہ پلٹی، نہ اسے دیکھا، نہ اپنا کام ترک کیا۔

''یار کب تک فارغ ہوگی تم؟'' وہ بولا تو اس کا لہجہ ہر قسم کی رنج سے پاک صلح جو تھا، دوستانہ بے تکلفانہ۔

''کام بتا دیں، ہو جائے گا۔'' قدرے توقف سے اس نے بے حد نروٹھے پن سے جواب دیا تھا، دوسری جانب یکلخت خاموشی چھا گئی اور اتنی مہیب اور گہری کہ تاخیر سے سہی مگر محسوس کرکے اسے چونک کر پلٹنا پڑا تھا، مگر حیدر کی نظروں کی گہرائی نے اسے سٹپٹانے پہ مجبور کر دیا تھا گویا، وہ جانتی تھی، وہ کب اسے ایسے دیکھا کرتا تھا۔

''چھوڑ دو کام سب، کمرے میں آ جاؤ بس۔''

''میں نہیں جاؤں گی، آپ نے ٹی وی اور اے سی چلا رکھا ہے۔'' خود کو سنبھال کر اس نے ہاتھ دھوئے اور نل بند کر دیا، انداز ہنوز احتجاجی تھا، حیدر نے کسی قدر تنک اٹھنے والے انداز میں اس کا بازو دبوچ لیا۔

''ٹی وی تو تم بھی سارا دن چلاتی ہو، مجھ پہ اتنی پابندیاں کیوں؟'' وہ بے حد خفا نظر آنے لگا۔

''مگر میں آپ کی طرح صرف جیو نیوز نہیں دیکھتی، جہاں پر جھوٹی خبروں اور کپتان پہ الزامات اور تمسخر کے علاوہ کچھ نہیں دکھایا جاتا، میرا خون کھولنے لگتا ہے۔'' وہ بپھر کر بولنے لگی، اسے وہ تمام خاکے ازبر تھے گویا جن میں کپتان کو بہت سطحی اور فضول انداز میں تضحیک کا نشانہ بنایا گیا تھا، حد تھی یعنی ڈھٹائی کی بھی اور منتقمانہ طرز عمل کی بھی، وہ سخت برہم اور خلاف ہو چکی تھی جیو کی اس تنگ سوچ اور کم ظرفی پہ، حیدر البتہ محظوظ ہو کر ہنسنے لگا تھا۔

''کم آن یار...... اتنی فیور نہ کیا کرو کپتان

کی انتہا جیلسی ہونے لگتی ہے مجھے، حد ہے یعنی، ہمیں رقیب بھی ملا تو اپنے سسر کی عمر کا۔“ وہ منہ لٹکا کر کہہ رہا تھا، پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹا، فلاح کو اتنا غصہ آیا تھا جبھی زبردستی اس کا ہاتھ زور سے دور جھٹک دیا تھا۔

”چھوڑیں مجھے...... اور بات سنیں کسی کو نیچا دکھا دینے سے وہ نیچا نہیں ہو جاتا، ہاں البتہ ایسا کرنے والوں کی ذہنی سطح ضرور آشکار ہو جایا کرتی ہے، جیو کا بھید جو کھول دیا لوگوں پہ کپتان نے..... حکومت کا ہمنوا ہے جیو، اس سے پیسے لیتا ہے، اسی کی فیور میں بولتا ہے، کپتان کے ساتھ دینے والی دھاندلی میں اس نے بڑا ساتھ دیا موجودہ گورنمنٹ کا، اب اگر کپتان نے یہ بھانڈا پھوڑ دیا ہے تو ہاتھ دھو کر کپتان کے پیچھے پڑ گیا، جبکہ جاننے والے جانتے ہیں کپتان کا کردار کتنا شفاف رہا ہے، جہاں تک کپتان کی بات ہے تو کچھ پانے کو بہت کچھ کھونا لازم ٹھہرتا ہے، ایسے لوگوں کے لئے میرے پاس دو ہی مثالیں ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثال، ان پہ نبوت کے اعلان کے بعد زندگی کو ہر طرف سے مشکل بنا دیا گیا تھا اور دوسری مثال قائداعظم محمد علی جناح کی مثال، ان پہ بھی تحریک کے جواب میں الزامات کی بھرمار کر دی گئی تھی، مگر دونوں ہستیاں ہی اللہ کے حکم سے سرخرو رہیں، انہی کا نام آج تک تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا گیا ہے، ان کے دشمن اور مضحکہ اڑانے والے ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔“ وہ بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی، حیدر نے ابرو چڑھا کر اسے بے حد تادیبی نظروں سے گھورا۔

”تم کپتان اور قائد کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملا رہی ہو، شیم آن یو۔“ اس کا لہجہ الزامیہ اور ملامت زدہ تھا، فلاح تھرا سی گئی، اس نے زخمی نظروں سے حیدر کو دیکھا تھا۔

”محترم...... آپ کی سمجھ دانی کا قصور ہے، میں نے محض ان کی مثال پیش کی ہے، ملایا نہیں ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اور جو رتبہ ہے وہ کسی کا نصیب نہیں ہو سکتا، نہ کوئی ایسا سوچ سکتا ہے، مقاصد واضح کیئے ہیں کہ نیک مقاصد حاصل کرنے کو قربانی دینا شرط ٹھہرتی ہے، جتنا بڑا کسی کا درجہ اس قدر بڑی آزمائش اور بات سنیں، کپتان کے لئے یہ ورڈیوز کرتے آپ کو شرم آنی چاہیے وہ میرے باپ کے برابر ہیں ان سے کم محترم کیسے ہو سکتے ہیں، ایک تو نون لیگیوں کا یہ بڑا مسئلہ ہے کہ ہر بات کو اپنے محدود سے ظرف اور ذہنی سطح کے مطابق ہی سمجھتے ہیں۔“ وہ سخت نالاں سخت جز بز تھی جیسے، حیدر ہلکا پھلکا ہو کر ہنستا چلا گیا۔

”اچھا اچھا غصہ تھوک دو میری جان! عرف دھان پان آؤ ناں اندر چلیں...... وعدہ جیو نہیں دیکھوں گا، کوئی اور چینل دیکھوں گا ٹھیک؟“ وہ گویا اسے قائل کر رہا تھا، فلاح کے تاثرات میں البتہ تبدیلی نہیں آپائی۔

”میری بلا سے، دیکھیں نہ دیکھیں۔“ اس نے ناک سکوڑی، حیدر نے مسکراہٹ دبا کر شریر نظروں سے اسے دیکھا۔

”پھر تو مسئلہ ہی نہیں کوئی...... آ جاؤ شاباش۔“ اس نے فلاح کا بازو پھر گھسیٹ لیا، وہ چیخی تو سہی مگر بچاؤ نہیں کر سکی تھی۔

☆☆☆

13 اگست

فلاح حیدر
فیلنگ ہوپ فل
جب تو آئے گا عمران
سب کی شان بڑھے گی
اس قوم کی شان
بنے گا نیا پاکستان

طبیعت کی خرابی کے باوجود کپتان کا عزم و استقلال، منزل کی جانب پیش قدمی، امیدیں جوان انشاء اللہ بنے گا نیا پاکستان، جس میں روٹی سستی ہوگی، انصاف ناقابل پہنچ نہ ہوگا، جان قیمتی ہوگی، امن وسلامتی کا دور دورہ ہوگا، انشاء اللہ۔

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

اس کا انہماک یکلخت بکھر کر رہ گیا، ٹی وی کی اسکرین تاریک ہو چکی تھی، ریموٹ کنٹرول حیدر کے ہاتھ میں تھا اس نے کس قدر خفگی سے اسے دیکھا۔

”میری واپسی تک تیار ملنا، یاد ہے ناں، شاہ ویز کی مہندی ہے آج۔“ وہ آفس جانے کو بالکل تیار تھا، پوری توجہ چاہتے تھی جبھی اس کی دلچسپی کا سامان ختم کر دیا تھا، اس نے محض سر کو اثبات میں ہلا کر ریموٹ لینا چاہا، جو حیدر نے مزید اس کی پہنچ سے دانستہ دور کر دیا تھا، اس کا مطلب تھا اسے بھی اس کی مزید توجہ درکار تھی، کہ ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی۔

”رات میری آنکھ کھلی تو تم بیڈ پہ نہیں تھیں اور آئز ریڈ ریڈ کیوں ہو رہی ہیں تمہاری؟“ سیل فون ٹیبل سے اٹھا کر اس کی بیٹری چیک کرنے کے بعد کوٹ کی جیب میں منتقل کرتا ہوا وہ جیسے اسی کی جانب متوجہ تھا، فلاح دانستہ خاموش رہی، نہ صرف خاموش بلکہ اسے نظر انداز کیے کمرے کا پھیلاوہ سمیٹنے لگی تو حیدر کے چہرے کا تناؤ بڑھنے لگا تھا۔

”اپنی بات کا جواب مجھے ہر حال میں چاہیے ہوتا ہے فلاح حیدر اور تم اس کی پابند ہو۔“ وہ یکایک مشتعل نظر آنے لگا تھا، فلاح نے چڑ کر عاجزانہ نظروں سے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”جواب آپ کو معلوم ہے حیدر! پھر یہ ضد کیسی ہے؟ میں سہولیات کا بائیکاٹ کر چکی ہوں، نہیں سوؤں گی اے سی میں۔“ حیدر نے ہونٹ بھینچے پھر ریموٹ ٹیبل پہ پٹخ دیا، اس کا بازو پکڑ کر تقریباً گھسیٹ کر آئینے کے سامنے لا کھڑا کر دیا، پھر آئینے میں ہی اس کی پیشانی ٹھونکی تھی۔

”خود کو غور سے اچھی طرح دیکھ لو، ہو کیا رہی ہے تمہاری شکل، کپتان کے غم میں خود کو فراموش کر کے اچھا نہیں کر رہی تم، سارا دن ساری رات گرمی سے بچاؤ کو بغیر آرام کیے پنکھا جھلو گی تو یہی ہوگا اور اس پنکھی کو تو باہر پھینکتا ہوں نا میں، حد ہو گئی۔“

”پھینک دیں، لیکن اپنے لئے پنکھا اور اے سی پھر بھی نہیں چلاؤں گی میں۔“ اسے طیش میں باہر جاتے پا کر وہ زور سے چلائی، حیدر نے گردن موڑ کر غصیلی بے حد عاجز اور بے زار نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”فلاح! میرا بیٹا بھی ہے تمہارے پاس اور اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ چڑنے لگا، فلاح اس سے بڑھ کر چڑی تھی۔

”اطلاعاً عرض کر دوں، وہ میرا بھی بیٹا ہے اور میں اسے ہرگز کوئی تکلیف نہیں دیتی، اس کے آرام کا خیال رکھتی ہوں، اسے پنکھا جھلتی ہوں۔“ وہ پھر چلائی، حیدر نے سرد آہ بھری۔

”مگر خود کو تو دے رہی ہو ناں؟“ وہ جیسے بے بس ہوا، یہاں فلاح نے جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا تو وہ بے بس ہونے کے ساتھ جھنجھلانے بھی لگا۔

”کیوں ضد باندھ رہی ہو فلاح! محبت کرتا

ہوں تم سے، بہت بہت زیادہ، جانتی بھی ہو تم۔" فلاح اسے عجیب نظروں سے دیکھتی رہی، پھر زخمی انداز میں ہنس پڑی تھی۔

"کاش آپ نے صرف مجھ سے محبت نہ کی ہوتی، کاش اس دل میں دوسروں کے دکھ بھی سمائے ہوتے۔" فلاح کی آواز بھرانے لگی، حیدر نے گہرا سانس کھینچا۔

"ضد نہیں کرتے فلاح؟"

"میں ضد نہیں کر رہی ہوں حیدر! کاش آپ بھی سمجھ سکیں۔" وہ ٹوک گئی پھر اسی بھیگی آواز میں بولی تھی۔

"آپ کو تو یہ بھی احساس نہیں ہے کہ آپ نے ظلم کیا ہے میرے ساتھ حیدر! جھوٹ بولنا بھی گناہ ہے، منع ہے، یہ حقیقت سے نیچر سے فرار ہوتا ہے، جو کبھی سکون کا باعث نہیں بن سکتا، آپ اتنے پوزیسو تھے آپ اتنے کچے تھے، تو کیوں آپ نے غلط بیانی کی؟ کہ آپ کپتان کے طرفدار ہیں، کیا مجبوری تھی بھلا؟" وہ رونے کو تیار تھی پوری طرح، حیدر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"بے حس لڑکی، محبت کرتا تھا تم سے، ایسے تم ہاتھ نہ لگتیں تھیں اور میں ہر صورت حاصل کرنا چاہتا تھا تمہیں، تم آج تک نہ سمجھ سکیں اتنی سی بات، ذرا سا جھوٹ ہی بولا ناں بس، کبھی جبر کیا تم پہ کیا کپتان کی پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں آ جاؤ، مگر تم ضرور جبر کرتی ہو مجھ پہ کہ میں نون لیگ چھوڑ کر کپتان کا فین بن جاؤں۔" وہ جیسے شاکی ہوا، فلاح دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"آپ نے میری آنکھوں کے سارے خواب نوچ کر پھینک دیئے حیدر! یہ ظلم نہیں تھا، آپ نے مجھے دھوکہ دیا، یہ زیادتی نہ ہوئی؟ میں اگر آپ پہ جبر کرتی ہوں تو جانتی ہوں جس راستے پہ آپ چل رہے ہیں، وہ گناہ کا راستہ ہے، آپ کی کمائی میں بھی حرام شامل ہے، آپ کسی بھی ٹینڈر کو پاس کرانے کو محض ایک سائن کرتے ہیں اور لاکھوں آپ کی جیب میں آ جاتے ہیں، آپ کو کچھ بھی تو غلط نہیں لگتا، امریکہ کو خدا سمجھنے والے صحیح ہو بھی کیسے سکتے ہیں؟ اگر امریکہ سے امداد لیں گے تو ان کی خواہش کا بھی خیال رکھنا پڑے گا، جتنی بڑی امداد اتنی بڑی خواہش، حیدر ہم آزاد ملک کے باسی ہو کر بھی غلاموں جیسی زندگی بسر کرنے پہ مجبور کیونکر ہوئے؟ انہی مفاد پرست حکمرانوں کی وجہ سے، میٹرو روڈ پل کے لئے چار ارب کی رقم درکار تھی، مگر اس پہ چوالیس ارب حکومت کے خزانے سے نکالا گیا، چالیس ارب کدھر گیا؟ اتنے سمجھ دار تو آپ بھی ہوں گے، حکمرانوں کے بینک بیلنس مزید بڑھ رہے ہیں اور ملک کنگال ہوتا جا رہا ہے، کرپشن آپ کی مجبوری ہو سکتی ہے حکمرانوں کے بعد، ہماری نہیں، حکمرانوں کے مطمع زدہ شخصیت کا تعفن سانسیں تک روکتا جا رہا ہے، جو محض اس لئے اپنی کرسی چھوڑنے کو تیار نہیں کہ انہیں مدت پوری کرنی ہے، سارا کچھ سمیٹنا ہے، کیا پتا پھر موقع ملے نہ ملے۔" وہ بے حد تلخ تھی، حیدر اتنی تلخ صورتحال کو تسلیم نہ کر پایا، جبھی اس پر چڑھ دوڑا۔

"اپنی تقریر بند کرو فلاح، بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے، چلو مان لیا، ہمیں تو نون لیگ کی فیور نے بہت کچھ دے دیا، ہم مراعات یافتہ طبقہ ہیں، آفیسر ہیں ہم، ہماری سیلری پرکشش ہے، سہولیات بے شمار ہیں، تمہیں کیا مل گیا کپتان کی حمایت سے......؟" فلاح کی نگاہوں سے تاسف وملال چھلکنے لگا۔

"آپ نے ٹھیک کہا، مجھے کپتان نے کچھ نہیں دیا، میرا مطلب آسائشیں مراعات سے ہے، مگر اللہ نے کپتان کے ذریعے نوجوان نسل کو جو شعور عطا کیا وہ بے حد بیش قیمت ہے، ہمیں اس صحیح انتخاب پہ فخر ہے، جو آنے والے وقتوں میں انشاء اللہ ایک بہترین قوم بہترین معاشرہ دے گا، میں پورے اطمینان اعتماد کے ساتھ جی سکتی ہوں کہ میں نے حق کا ساتھ نبھایا، میں ایک ایسے بندے کی پارٹی کا حصہ ہوں، جسے صحیح معنوں میں مسلمان ملک کا ایک آزاد باشندہ کہا جا سکتا ہے، جو مرد مومن ہے، غیور قہار جبار منصف، خدائی خوبیوں سے مالا مال، جس کے دل میں اپنے قوم کا درد احساس زندہ ہے، جو باقی حکمرانوں کی طرح امریکہ سے نہیں ڈرتا، جو غیر اللہ کے سامنے جھولی نہیں پھیلاتا، جس میں جرأت ہے، وہ کوئی بات چھپ کر نہیں کرتا جو عزم رکھتا ہے کہ وہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرے گا، جس کا سابقہ ریکارڈ الحمدللہ قابل فخر ہے، جبھی اس پہ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا، اس کے دشمن اس پہ تنقید ضرور کرتے ہیں مگر اس پہ الزامات عائد نہیں کر سکتے، جس نے دکھاوے کو نیکیاں نہیں کیں، کینسر ہاسپٹل اور ورلڈ کپ کی فتح کا اعزاز اللہ نے پاکستان میں کپتان کے سوا اور کسی کو نہیں بخشا، جس کے عزم واستقلال میں محمد علی جناح کا سنہرا اور پاکیزہ روپ جھلکتا ہے، حیدر صاحب ہم آپ کی طرح لکیر کے فقیر لوگ نہیں ہیں، میرے بابا پہلے بھٹو کے حامی تھے، مگر پھر لیڈرز کے بدلنے کے ساتھ ان کے نظریات بھی تبدیل ہوئے تو بابا نے ان کی پارٹی چھوڑ دی، وہ کپتان کے حامی ہیں، ان کا احترام کرتے ہیں تو وجہ محض پاکستان کی آن شان نہیں ہے، وجہ کپتان کی اعلیٰ سوچ ہے، جس میں انہیں بلکہ سب کو ایک نیا پاکستان ایک مضبوط ومستحکم پرامن خوشحال پاکستان نظر آتا ہے، ہمیں ذاتی مفاد کی نہیں اجتماعی مفاد کی خواہش ہے، کپتان کے سب حامی ایسی ہی ستھری سوچ کے مظہر لوگ ہیں، یہاں کا سسٹم کرپشن بدامنی اور غیر اختیاری سلوک کی وجہ سے درہم برہم ہے، اسے تبدیلی کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے، آگاہی کی ضرورت ہے جہاں عزت نفس بیدار کرنے کا عزم ہے، تاکہ کسی کو ہاتھ پھیلانا نہ پڑے مہنگائی کا توڑ ہو تو ہر کوئی اپنی محدود کمائی محدود وسائل کے باوجود اپنی عزت نفس کی حفاظت کے ہمراہ بغیر ہاتھ پھیلائے کھا سکے گا، جہاں لوگ متعصب نہ ہوں، جہاں میڈیا واقعی آزاد ہو، ہمیں ایسا ہی نیا پاکستان چاہیے، جس کا خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا، جس کی چاہ قائداعظم نے کی تھی۔" ابھی وہ اور بھی بہت کچھ کہتی، کہہ سکتی تھی مگر حیدر نے مسکراہٹ دباتے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"تم سے بہت بولتی ہو تم، واقعی ایک جوشیلی صحافی ہو اندر سے، مگر ابھی تمہارا اپنا پاکستان نہیں بنا، ابھی سانس بحال کرو، پانی شانی پیو، میں چلتا ہوں آل ریڈی لیٹ ہو گیا یار، تمہاری تقریر پھر کبھی سن لوں گا بائے۔" وہ اسے چڑاتا ہاتھ ہلاتا اس کے گال پہ جو سرخ ہو کر دہک رہا تھا، چٹکی بھرتا ہنستا ہوا چلا گیا، فلاح ایسے ہی کھڑی رہی، اس کی آنکھیں سبکی سے، دکھ سے، ذلت سے جلتی رہیں، مگر وہ کبھی اس کا یہ دکھ نہیں سمجھ سکتا تھا، یہ صرف وہی جان سکتا تھا جس نے اسے سہا ہو، مختلف ذہن مختلف سوچ، مخالف راستے مخالف پسند کے حامل لوگ ایک مرکز پہ ایک ہو کر نہیں رہ سکتے، یہ بہت کٹھن تھا، یہ بہت مشکل ہوتا ہے۔

☆☆☆

اتوار 17 اگست 2014ء

فلاح حیدر
فیلنگ انگری

صف ماتم بچھاؤ
آؤ ان کو یاد کرتے ہیں
جو ہم میں نہیں رہے اب
جو روٹی کمانے کو نکلے تھے گھر سے سویرے کو
انہیں معلوم ہی کب تھا
زباں اک جرم ہوتی ہے
وہ بھی ایک مجرم ہیں
وہ اس بستی میں رہتے ہیں
جہاں ہر شخص گونگا ہے
جہاں ہر شخص بہرہ ہے
یہاں آواز کے قاتل زبان کو کھینچ لیتے ہیں
صف ماتم بچھاؤ
پر کوئی بھی بات مت کرنا
ہمیں خاموش رہنا ہے
نیا سورج نکلنے تک

شہدائے ماڈل ٹاؤن 14 شہید، جن میں دو خواتین شامل جن کے منہ میں گولیاں ماری گئیں، اس صورت حال میں حکمرانوں سے استعفیٰ کا تقاضا غیر آئینی نہیں، نوے زخمی جن میں نوجوانوں کے ساتھ بزرگ بھی شامل، خود فیصلہ کریں، یہ کیسی جمہوریت ہے، ذرا سوچیے۔

☆☆☆

یہ زمیں جب نہ تھی آسماں جب نہ تھا
چاند سورج نہ تھے یہ جہاں جب نہ تھا
راہ حق بھی کسی پہ عیاں جب نہ تھا
جب نہ تھا کچھ یہاں جب نہ تھا کچھ یہاں
تھا مگر تو ہی تو اللہ ہو اللہ ہو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

گھر میں گھستے ہی اس کی سماعتوں میں ٹی وی کی آواز اتری تھی، والیوم اچھا خاصا تیز تھا، اس کا اچھا بھلا خوشگوار موڈ لمحوں میں غارت ہوا، ہونٹ باہم بھینچ گئے، کنٹینر کی چھت پہ سیاہ عوامی سوٹ پہ جھنڈے کے سب رنگوں کا صافہ آگے کی طرف کر کے گلے میں لٹکائے خوبرو عالی شان نظر آنے والا کپتان اپنی دراز قامتی مضبوط شاندار سراپے کے باعث لیڈر کم مہندی کا دولہا زیادہ لگ رہا تھا، جس کے متعلق نوجوان لڑکیوں کا دعویٰ تھا کہ ”عمران کی آنکھیں آج بھی جان لیوا ہیں“ اپنے جان نثاروں کے بیچ مختصر سے کنٹینر کی چھت پہ ٹہلتا وہ صحیح معنوں میں پنجرے میں قید شیر لگ رہا تھا۔

”اللہ ہو!“ کی صدا پہ داہنا بازو فضا میں بلند کر کے ہاتھ کی انگلیوں کو وکٹری کے انداز میں لہراتا ہوا کپتان، واقعی دیکھنے والوں پہ سحر طاری کر سکتا تھا، اس پہ فلاح کا جھومتا انداز، دنیا و مافیا سے بے خبر ہو کر اسے دیکھنا، حیدر کی پھر بھی روح جل کر خاکستر نہ ہوئی بھلا۔

کیا شک تھا کہ کپتان ساٹھ سال کا ہو کر بھی اپنی عمر سے آدھا نظر آتا تھا، چاک و چوبند بے حد شاندار پرسنالٹی اس عمر میں بھی ایسی ٹھٹھکا دینے والی تھی کہ لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکے فدا ہوئے جاتے تھے، اس نے طیش میں بپھرتے ہوئے آگے بڑھ کر ٹی وی آف کر دیا، فلاح جو اسی وقت اس کی آمد سے باخبر ہوئی تھی، اسے روبرو پا کے گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

”چلائیں بھئی...... میں، ان کے خطاب کی خاطر سارا دن ویٹ کرتی ہوں۔“ وہ سخت بے چین لگ رہی تھی، حیدر نے بے دریغ گھورا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ یاد ہونا چاہیے کہ میں صبح تمہیں کچھ کہہ کر گیا تھا۔“ اسے ریموٹ لینے کو آگے بڑھتے پا کر وہ زور سے دھاڑا، مگر فلاح خائف نہیں ہوئی۔

”اگر مجھے جانا ہوتا تو لازماً تیار بھی ہو جاتی، اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی آپ کو۔“ وہ تیکھے

چتونوں سے جتلا کر کہتی اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی، حیدر کو لگا وہ خود پہ کنٹرول نہیں کر پائے گا۔

”کیوں نہیں جانا چاہتیں؟ یہاں اپنے محترم کپتان کا غیر عورتوں کو میوزک پہ نچوا کر انجوائے کرتی تھکی نہیں ہو تم؟ بے شرم بے غیرت لوگ، ذرا جو حیا ہو، حد ہو گئی یعنی، عورتوں کو سر بازار نچوا رہا ہے پٹھان ہو کر بھی، یہ پھر بھی، تف ہے ایسی مردانگی پہ ایسے لالچ پہ جو واقعی اقتدار حاصل کرنے کو ڈرامہ رچایا گیا ہے۔“ اندر کا غبار نکلا تھا اور خاصے سے زیادہ بے تکے بے ہودہ انداز میں، انداز گفتگو وہ ہی سطحی تھا، فلاح کے ضبط کی طنابیں بھی شدید تناؤ پہ آ کر تڑخنے لگیں، رنگت یوں سرخ پڑ گئی گویا ابھی لہو چھلکنے لگا۔

”حیدر کرار شاہ!“ اس نے تنفر سے تلخی سے ٹوکا، پھر اس پہ طنزیہ نظر ڈال کر تمسخر سے ہنسی۔

”آپ کون ہیں؟“ اس نے برہمی سے اس کے سینے پہ انگلی رکھی، بلکہ ٹھونکی، اس کا لہجہ تند تھا، حیدر ششدر سا ہونے لگا، اس سوال کا قطعی مطلب نہیں سمجھ سکا تھا وہ۔

”یو نو واٹ...... آپ شاہ ہیں، یعنی سید، سب سے اعلیٰ و افضل ذات، زیب تو آپ کو بھی یہ نہیں دیتا کہ کسی پہ ایک انگلی بھی اٹھائیں، مگر آپ پھر بھی اٹھا رہے ہیں، بلکہ آپ جیسے بکے ہوئے میڈیا کے بیشتر تنقید و تجزیہ نگار ہی اٹھا رہے ہیں، بلکہ رائی کا پہاڑ ڈھٹائی سے کھڑا کرتے کسی کو ذرا سی بھی شرم نہیں آئی، آپ سے میں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ آپ شاہ ہیں، آپ کی ذات سب سے اعلیٰ و برتر ہے بلاشک و شبہ تو اس کا مظاہرہ بھی اعلیٰ و برتر ہونا چاہیے، مگر میں نے آپ کو اس کا مظاہرہ کرتے کبھی نہ دیکھا، اس پہ آپ نے دھیان کبھی کیوں نہ دیا؟ دوسروں پہ بلا جھجک تنقید کرتے وقت آپ کو اپنا ظرف بھی وسیع رکھنا چاہیے کہ گریبان میں منہ ڈال کر محاسبہ و دعویٰ نہ کر سکیں، یاد کریں پھر کہ آپ کے گھر کی تقریب میں آپ کے خاندان کی بہو بیٹیاں اور بہنیں مائیں بلاتفریق سب ناچتی ہیں اور کبھی کسی نے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی وائے؟ بلکہ ناچتی ہوئی بیٹیوں کو باپ اور بھائی فخر سے دیکھتے ہیں، یہ صرف آپ پہ تنقید نہیں ہے حیدر اس وقت ہمارے معاشرے کی ہر ذات ہر گھر میں ایسا ہی رواج زور پکڑ چکا ہے، سوچیں ہم نے اپنا مذہب اپنا انداز اپنی روایات کب چھوڑیں، یہ طریقہ تو رات جاگنے والے علاقوں کا ہوتا ہے، مگر آج اس پہ شریف لوگ سب فخر کرتے ہیں، کوئی شرمندگی کوئی عار نہیں، اپنی روایات اپنا اصل اپنا مذہب بھلا کر ہم نے کون سی روش اختیار کر لی، اس پہ غور نہیں فرماتے اور دوسروں پہ بلا جھجک بلکہ ڈھٹائی سے تنقید کرنے لگ جاتے ہیں، محترم حیدر صاحب وہاں موجود خواتین جن کے لئے آپ جیسے دیگر مرد حضرات نازیبا الفاظ استعمال کر رہے ہیں، اطلاعاً عرض ہے انہیں کپتان نے نہیں کہا، بھنگڑے ڈالنے کو، یہ خالصتاً ان کا ذاتی عمل ہے، لیکن آپ کا اعتراض درست ضرور ہ، کپتان کو اس جانب توجہ دینی چاہیے، اس غلط عمل سے روکنا چاہیے، مگر آپ ایسے سخت الفاظ استعمال کرنے سے قبل آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ ہماری شادی پہ صوحا نے ڈانس کیا تھا، آپ نے اسے روکا کیوں نہ؟ حالانکہ تب مووی بھی بن رہی تھی، کیا وہ مووی میکر آپ کا سگا تھا یا پھر صوحا کا محرم؟“ وہ بولنے پہ آئی تو چپ ہونے کا نام نہیں لیا، اس کا انداز ایسا ہی ہوتا تھا، وہ سچ ایسے ہی واشگاف انداز میں بولا کرتی تھی، آئینہ ایسے ہی دکھایا کرتی تھی کہ سامنے والا بلبلا اٹھتا، حیدر بھی

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بلبلا اٹھا تھا، جبھی اس پہ ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ گیا۔

''اپنی بکواس بند کرو فلاح! تم حد سے بہت بڑھ رہی ہو۔'' وہ دبے ہوئے لہجے میں چلایا، فلاح زخمی انداز میں اسے دیکھتی رہی۔

''برا لگا؟'' وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی، حیدر اسے سامنے سے دھکیل کر بے حد خفا تاثرات کے ساتھ وہاں سے چلا گیا، فلاح ہونٹ بھینچے نم آنکھیں جھپکتی وہیں کھڑی رہ گئی تھی، جب شادی ہوئی تھی تب والدہ نے کہا تھا۔

''جو فیصلہ اس نے کیا، اس پہ وہ لازمی پچھتائے گی۔'' اور اس نے سمجھا تھا، والدہ اس وجہ سے خفا ہیں کہ اس نے ان کے بھائی کے بیٹے کو ٹھکرا کر بابا کے بھائی کے بیٹے کو قبول کیا ہے، مگر حالات نے بہت جلد اس پہ آشکار کر دیا تھا، ان کی بات سچ ہے، اس کے باوجود نوبت بھی ایسے پچھتاوے تک نہ پہنچی تھی، جن کا شکار وہ ان دنوں ہو رہی تھی۔

☆☆☆

بدھ 20 اگست 2014ء

فلاح حیدر

فیلنگ پراؤڈلی

یہ ظلمت باطل دھوکہ ہے
یہ ہیبت کافر کچھ بھی نہیں
مٹی کے کھلونے ہیں سارے
کچھ کفر کا لشکر کچھ بھی نہیں
اللہ سے ڈرنے والوں کو
باطل سے ڈرانا مشکل ہے
جب خوف خدا ہو دل میں
یہ قیصر و کسریٰ کچھ بھی نہیں
دستور بھی ہے تنظیم بھی ہے
تہذیب بھی ہے تعلیم بھی ہے
قرآن میں پنہاں سب کچھ ہے
قرآن سے باہر کچھ بھی نہیں
اسلام اگر منظور نہیں
قرآن اگر دستور نہیں
افسوس ہے پھر آزادی پر
یہ ملک وملت کچھ بھی نہیں

پاکستان کو کپتان کے متوالوں کو مبارک باد، لشکر انقلابی بڑھ رہا ہے، آگاہی پھیل رہی ہے، کل نئے پاکستان اور انقلاب کا ایک اور متوالہ اس لشکر میں شامل ہوا، جس نے اعلان کیا کہ کل اس کی شادی ہے مگر وہ یہاں آ گیا ہے، انقلاب برپا کرنے، آج ایک حکومت کا گارڈ نون لیگ کو چھوڑ کر کپتان کی ٹیم میں شامل ہوا کہ اس کا کہنا تھا، اس کا موبائل چوری کر لیا گیا اور ایسا کرنے والے کوئی اور نہیں، حکومت کے محافظ ہی ہیں، انہی کے آلہ کار، کپتان کو غلط کہنے والے ثابت کرنے والے دھیرے دھیرے شکست کے قریب ہو رہے ہیں اور کپتان کو اللہ فتح سے قریب کر رہا ہے۔

☆☆☆

بابا نے دوبئی کو مستقلاً خیر آباد کہا تو وہ لوگ ہمیشہ کو پاکستان چلے آئے، ان کا عارضی قیام تاؤ جی کے گھر پہ ہوا تھا پہلے، لاہور کے پوش علاقے میں تاؤ جی کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ لوگ صحیح معنوں میں ششدر ہو کر رہ گئے تھے، اس پہ تائی ماں اور ان کی بیٹیوں کا ماحول، فیشن کی اندھی دوڑ نے انہیں کچھ کا کچھ کر کے رکھ دیا تھا، بال شانوں پہ لہراتے تھے، تو دوپٹے کے ساتھ قمیضوں کی آستین بھی غائب ہو چکی تھیں، تاؤ جی نون لیگ کے ساتھی تھے، پارلیمنٹ میں شامل جبکہ حیدر کے ساتھ دونوں بیٹیوں صوحا اور ثنا بھی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھیں، تینوں کنوارے تھے مگر زندگی اپنی اپنی مرضی سے گزارنے کے اصولوں پہ کار بند اور کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا، ایسے میں لئے دیئے رہنے والی فلاح اس کی بہن عیشہ اور والدہ جن کے دوپٹوں کی لمبائی چوڑائی چادروں کو مات دیتی تھی اس ماحول میں بہت عجیب تاثر پیش کرنے لگی تھیں، اس پہ تائی ماں کے نادر مشورے، وہ والدہ سے نالاں تھیں جنہوں نے بچیوں کو دوبئی جیسے ملک میں رکھ کر بھی جیسے ڈربے میں قید کر دیا تھا۔

''بڈھی روحیں ہیں دونوں لڑکیاں، دنیا کدھر کی کدھر جا رہی ہے، انہیں کوئی خبر ہی نہیں، صالحہ، بتاؤ مجھے تمہیں بچیوں کی شادیاں بھی کرنی ہیں کہ نہیں؟'' وہ والدہ پہ برہم ہوتی رہی تھیں۔

''بھابھی بیگم آپ ان کے بابا سے تو واقف ہیں ہی، کتنے سخت ہیں وہ اصولوں کے، مکمل مذہبی ماحول دیا ہے بچیوں کو اور الحمدللہ ہمیں بھی فخر ہے کہ ہماری بچیاں ایسی ہیں۔'' والدہ کے جواب نے تائی اماں کو نخوت وتنفر سے بھر دیا تھا اور انہیں اس بات کو منہ سے نکالنے پہ مجبور کر دیا تھا، جو وہ لحاظ میں کہنا نہیں چاہ رہی تھی۔

''اگر فخر ہے تو ان کی شادی خود ہی نپٹاتی رہنا، ایسی لڑکیوں کے رشتے کرنا آسان نہیں ہوتا اور مجھ سے توقع تو ہرگز نہ رکھنا، میرا بیٹا ایسی لڑکیوں کو اپنا لائف پارٹنر کے طور پر قبول نہیں کر سکتا۔'' والدہ کی رنگت اس بے لحاظی وتذلیل آمیز سلوک پہ بالکل پھیکی پڑ گئی تھی، روادار تھیں جبھی خود کو سنبھال لیا تھا، بنا کچھ جتلائے انہوں نے معاملہ سمیٹ ڈالا۔

''آپ پریشان نہ ہوں بھابھی بیگم ہمارے بھی ذہنوں میں ایسی کوئی خواہش نہیں ہے، اللہ سب کا مالک ہے، اسی نے میری بیٹیوں کو پیدا کیا ہے تو ان کا جوڑا بھی اتارا ہوگا، ہم مطمئن ہیں۔''

تائی ماں اس جواب پہ ایسے ہی تمسخرانہ تاثرات سجا سکتی تھیں چہرے پہ جیسے انہوں نے سجا لیے تھے، بولی تو لہجہ بھی بڑا طنزیہ اور تیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے بھئی، اگر تمہیں اتنا ہی توکل ہے تو لگائے رکھو اپنے رب سے آس، میں نے جبھی صاف کہہ دیا میرے بیٹے کا معیار ایسا نہیں۔'' والدہ نے ہونٹ بھینچ لئے تھے، وہ کچھ نہیں بولی تھیں مزید، مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا جبھی حیدر خود سے فلاح کا طلبگار ہوتا ماں کے مقابل ڈٹ گیا تھا، تائی ماں تو یہ مطالبہ سن کر ہی غش پہ غش کھانے لگی تھیں جیسے، انہیں تو یقین آ کر نہ دیتا تھا کہ ان کا بیٹا ایسا اتاؤلا کیوں ہوا جاتا ہے، فلاح کے لئے، اس کملی جھلی سی فلاح میں ایسا تھا بھی کیا قابل ذکر۔

''وہ ہے کیسی؟ کبھی یہ تو دھیان سے دیکھا نہ ہوگا تم نے۔'' حیدر دانستہ خاموش رہا، اس بات کا کیا جواب دیتا، وہ کہ اسے کیسے دیکھا تھا اور کیسے پسند آ گئی اتنی، مگر تائی ماں طیش میں بپھرنے لگی تھیں۔

''بتاؤ مجھے حیدر کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟ ایسا کون سا جادو کر دیا اس نے؟ ورنہ ساتھ چلتی تو وہ تمہارے اچھی بھی نہ لگے گی۔'' ان کے لہجے میں نفرت سی نفرت تھی، حیدر نے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے، مگر تائی ماں کا ابلتا اشتعال جواب کا متقاضی تھا، اسے بولنا پڑا۔

''مام!'' وہ عاجز ہوا تھا، ان کے گھورنے پہ بے بس سا بولا۔

''شادی مجھے کرنی ہے، زندگی بھی مجھے گزارنی ہے، پسند بھی میری ہونی چاہیے، سو پلیز آپ سمجھیں۔''

''پسند؟ یہی تو پوچھ رہی ہوں احمق لڑکے، کیا پسند آ گیا تمہیں اس میں؟'' وہ غرائیں تھیں۔

”میں بس یہ کہوں گا پھر آپ نے دھیان سے اسے دیکھا نہیں، میرا خیال ہے حسن کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں ہے فلاح میں، ایک وہی ہے جو میرے ساتھ پرفیکٹ لگ سکتی ہے۔“ جواب میں تائی ماں کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں، حلقوں سے ابل پڑیں، وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹے کے مقابل آ کر اسے گھورنے لگیں۔

”بس...... سمجھ آ گئی مجھے، کہ تم نے کیسے دیکھا ہوگا اسے، یا اس نے کیسے مائل کیا ہے تمہیں۔“ اس کے آگے فلاح کے جو بخیے ادھیڑے گئے تھے، الاماں الاحفیظ، انہیں دکھ تھا وہ بے خبری میں لٹ گئیں، انہیں غصہ تھا کہ دیورانی نے ان کی بات کا ایسا تیکھا جواب پیش کیا کہ جس میں ان کی ہار یقینی ہو کر رہ گئی تھی، الزامات کی بھرمار تھی، وہ بلبلا رہی تھیں، حیدر جتنا بھی جز بز ہوا مگر کوئی وضاحت اس لئے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ماں کی فطرت سے آگاہ تھا، اس پل اس کی معمولی سی بھی فلاح کی طرفداری انہیں مزید پتنگے لگا سکتی تھی، اپنے کمرے میں آ کر وہ بہت خاموشی سے لیٹ گیا تھا، اس کا ذہن متفکر تھا، آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیں اتر رہی تھیں، اس میں شک نہیں تھا کہ وہ فلاح کو کھونے کے خیال سے خائف ہو رہا تھا، اس میں بھی شک نہیں تھا کہ فلاح کا اسیر ہونے سے قبل ماں بہنوں کی طرح وہ بھی چاچو اور ان کی فیملی کو ہرگز کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا، ماں کی طرح اسے بھی یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر چاچو نے جائیداد بزنس اور زمینوں سے اپنا حصہ مانگ لیا تو کیا کریں گے وہ؟ ماں اور بہنوں کی طرح وہ بھی اس فیملی کے جلد از جلد یہاں سے چلے جانے کا خواہاں تھا اور کبھی چچی سمیت ان کی بیٹیوں سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کی تھی پردوں میں ملفوف لپٹی سمٹی لڑکیاں اس کے لئے بھلا کسی اٹریکشن کا باعث کیونکر ہو سکتی تھیں، مگر ہفتہ قبل طبیعت کی خرابی کے باعث اسے اچانک گھر آنا پڑا تھا، تب ہی اس کے دل کی دنیا بھی زیر و زبر ہو کر رہ گئی تھی، گاڑی پورٹیکو میں کھڑی کر کے سیدھا اپنے کمرے میں جانے کی بجائے انیکسی کی جانب آ گیا، چچی اور ان کے بیٹیوں کی اور کسی خوبی سے بھلے وہ آگاہ ہوا ہو نہ ہوا ہو، مگر ہاتھ کے ذائقہ کا ضرور مداح ہوا تھا، کہ ان کی آمد کے بعد گھر میں قسم قسم کے کھانوں سے ضرور سب لطف اندوز ہونے لگے تھے، صبح کا ناشتہ بھی انہی ماں بیٹیوں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا جبھی خانساماں کے ہاتھ کے بدمزا کھانوں سے خاصی نجات حاصل ہوئی ہوئی تھی، اس وقت بھی ارادہ انہی میں سے کسی کو چائے کا کہنے کا تھا، چونکہ اسے چچی جان کے کمرے کا آئیڈیا نہیں تھا جبھی اندازے سے ہی ایک دروازہ جس کے پار سے آواز باہر تک آ رہی تھی، معمولی سا تھپتھپاتا ہوا وہ اندر داخل ہو گیا تھا۔

”میں نے تو کہہ دیا ہے، میرا آئی ڈی کارڈ آپ بنوا ڈالیں، اس بار میں لازمی ووٹ ڈالوں گی کپتان کو۔“ اس کے قدم دروازے کی چوکھٹ پہ رکنے کا باعث عیشہ کی یہ آواز نہیں تھی، بلکہ میرون دھانی اور آتشی رنگوں کے بوتیک سے لباس میں کھلتی کلی جیسی اس لڑکی پہ ٹھہر گئی تھی، جو چھوٹی میز پہ ایک پیر اٹکائے جھکی ہوئی پیر کے ناخن تراشنے میں اتنی محو تھی کہ اس کی آمد کی خبر بھی نہیں ہو سکی تھی، نم بے حد سلکی لانبے سیاہ مخمل جیسے بالوں کی لٹیں بھی ڈھلک کر اس کے چہرے کی تابناکی و جگمگاہٹ کو چھپانے میں جیسے سخت ناکام اور بے بس محسوس ہو رہی تھیں، وہ حیران بھی تھا محو بھی مبہوت بھی، اگر عیشہ اسے نہ چونکاتی تو جانے کب تک وہ اسی طرح گم صم بے خود سا کھڑا اس کا یہ روپ نگاہ کے رستے دل میں اتارتا رہتا۔

”حیدر بھائی...... آپ......؟“ عیشہ کی نگاہ اس پہ پڑی تو ایکدم حیران ہوتی اٹھی تھی۔

”آیئے ناں۔“ وہ جیسے زبردستی مسکرائی، فلاح نے ایکدم چونک کر سر اونچا کیا تھا اور یکلخت سیدھی ہو گئی، بیڈ پہ دھرا دوپٹہ اٹھاتے وہ بوکھلاہٹ کا شکار تھی، یہ بوکھلاہٹ حیدر کی نظروں کو خود پہ جمے پا کر ناگواریت میں تبدیل ہونے لگی۔

”کسی کے کمرے میں بنا اجازت کے تشریف نہیں لے آتے ہیں حیدر صاحب! آپ کو اگر کوئی کام تھا تو آپ دروازہ ناک کر کے کہہ سکتے تھے۔“ وہ نہا کر نکلی تھی، بال سکھانے کو اپنے کمرے میں اگر بنا دوپٹے کے تھی اور وہ آ گھسا تھا تو یہ ناگواری اس کا حق بنتی تھی، عیشہ کی مداخلت کے باوجود حیدر کی نظروں کا فوکس خود پہ محسوس کر کے اور ان نظروں کی گہرائی و گستاخی کو پا کر ہی وہ اتنا تلخ ہوئی تھی کہ بنا لحاظ کے کہہ گئی، حیدر ایکدم چونکا اور ٹھٹک سا گیا، یہ ناگواری، یہ برہمی، تیکھے چتون اس کی طبع نازک پہ سخت گراں گزرے تھے اور زبان پھسل گئی تھی۔

”یہ ہمارا گھر ہے محترمہ، اور میرا ذاتی خیال ہے کہ یہاں کہیں بھی آنے جانے کے لئے ہمیں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ بات متکبرانہ بھی تھی، غیر معقول بھی، اس میں اس کا بھی اتنا قصور نہیں تھا، اس کی تربیت ہی ایسے پیمانوں پہ ہوتی تھی، اسے ماحول ہی ایسا دیا گیا تھا، جبھی وہ ایسی بات کہنے میں عار نہیں سمجھتا تھا، مگر جب محبت ہوتی ہے تو احساس و لحاظ کے ساتھ ادب آداب سے سب پہلے تقاضے بن جاتے ہیں، فلاح کے چہرے پہ پھیلتے تاثرات نے بھی حیدر کرار کو اپنی غلطی کا احساس دلا دیا تھا تو وجہ محبت ہی تھی، جو بہت غیر محسوس انداز خون میں گھلتی رگوں میں اترتی چلی جاتی ہے، تو بتدریج تغیر کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے، چاہے اسے تسلیم کیا جائے یا نہیں، چاہے اس کا اعتراف کیا جائے یا نا۔

خیال یار، رضائے یار، حسرت یار کی اہمیت خود بخود بڑھ جاتی ہے، وہ بھی نا چاہتے ہوئے وضاحت پہ صفائی پہ مجبور ہوا تھا تو یہ تقاضائے محبت تھا، مگر وہ کوئی وضاحت سنے بغیر ہی محض اپنی سنا کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

”آپ نے بجا فرمایا حیدر صاحب، مگر یہ عارضی سہی ہمارا ٹھکانہ ضرور تھا، سو اخلاقیات کا تقاضا تھا کہ......“

”بجو!“ عیشہ نے اس کا بازو تھام کر عاجزی سے گویا مزید کچھ کہنے سے ٹوکا تھا، وہ ہونٹ بھینچتی جھٹکے سے پلٹ کر چلی گئی تھی اور وہ کچھ کہنے کی خواہش میں ساکن کھڑا رہ گیا۔

”حیدر بھائی آپ آیئے میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ عیشہ ملائمت سے گویا تھی، حیدر وہاں سے نکلا تو دل پہ بے انتہا بوجھ تھا، یہی بوجھ اسے پھر سے فلاح کے روبرو لا کھڑا کر گیا تھا، کچن کے دروازے پہ ہونے والی دستک پہ وہ سبزیاں کاٹتی حیرانی سے پلٹی تو روبرو حیدر کو پا کر چہرے کی سنجیدگی مزید گہری ہوتی چلی گئی تھی، رخ پھیر کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوئی فلاح کو حیدر نے بڑی لاچاری سے دیکھا تھا، کچھ لوگ کتنی تیزی سے قریب آئے ہیں، کتنی تیزی سے شکست کا باعث بنتے ہیں کہ آپ اپنے دفاع کو بھی کوئی حربہ اختیار نہیں کر سکتے، فلاح کی محبت نے بھی حیدر کرار کو ایسے ہی جکڑ لیا تھا، ایسا انوکھا کچھ تو تھا

اس میں کہ وہ یوں بے بس ہوا تھا۔

”مجھے ایکسکیوز کرنا تھا آپ سے فلاح! غلطی میری تھی، مجھے اجازت لے کے آنا چاہیے تھا۔“ قدم بڑھا کر اس کے مقابل آ جانے کے بعد وہ اس کی توجہ پانے کو کھنکارا بھی تھا، مگر توجہ حاصل نہ ہونے پہ کہنے پہ مجبور ہوا، جواب میں فلاح کے چہرے پہ عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”اٹس او کے حیدر بھائی، آپ کا بھی موقف درست ہے، آپ کا گھر ہے، آپ کو اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ ایسا جواب حیدر کی شرمندگی میں مزید اضافہ کر کے رکھ گیا، وہ لاجواب بھی ہوا تھا، اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکی کیا ہے۔

”تم ضرورت سے زیادہ مائنڈ کر گئی ہو۔“ وہ چڑنے سا لگا، فلاح کے ہاتھ روک کر اسے اک نظر دیکھا۔

”تو پرواہ نہ کریں، ڈزن میٹر۔“ اس کا انداز صاف جان چھڑانے والا تھا جیسے، حیدر کو توہین سی محسوس ہوئی مگر خود پہ ضبط کر گیا تھا۔

”آئندہ شکایت نہیں ہوگی، پرامس۔“ اس کا بھاری بھر کم لہجہ دھیما تھا، گمبھیر تر۔

”آئندہ ایسی نوبت آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے حیدر بھائی، ہم عنقریب اپنے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔“ اپنے کام میں مصروف رہ کر وہ اس بے نیازی بے رغبتی سے جواب دے رہی تھی، انداز صاف جان چھڑانے والا تھا۔

”دیکھو میری بات تم......“

”آپ یہاں سے جائیے حیدر بھائی! یہ بالکل مناسب بات نہیں ہے کہ ساری فیملی باہر لان میں ہے اور آپ یہاں کچن میں آ گئے ہیں میرے پاس۔“ وہ اسے ٹوک گئی تھی، انداز کی ناگواری مزید بڑھی تھی۔

”کم آن، ہمارے ہاں ایسی باتوں کو برا نہیں سمجھا جاتا۔“ وہ سر جھٹک کر بولا تو لہجے میں فخر تھا، فلاح کے چہرے پہ تناؤ ابھرتا چلا گیا۔

”مگر ہمارے ہاں برا سمجھا جاتا ہے اور مجھے اپنی پوزیشن کی بہت پرواہ ہے۔“ حیدر نے جواباً اسے بہت شوخ بہت گہری نظروں سے دیکھا تھا، پھر بالخصوص مسکرانے لگا۔

”تمہیں پرواہ نہیں کرنی چاہیے بی کوز، میں تمہیں اپنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ اس کا لہجہ ہرگز سرگوشی سے بلند نہیں تھا، فلاح دھک سے رہ گئی، ہونق ششدر سراسیمہ اسے دیکھنے لگی۔

”یقین نہیں آ رہا تمہیں؟“ وہ محظوظ ہوتا ہوا ہنسا، فلاح نروس تو ہوئی تھی مضطرب بھی لگنے لگی۔

”حیدر بھائی آپ......؟“

”بھائی کیوں کہہ رہی ہو؟“ وہ چڑا اور سخت برہم ہو کر بولا تھا، فلاح کے چہرے پہ بے بسی اور روہانسا پن جھلکنے لگا، اس کی بے قرار نظریں دروازے سے باہر بھٹکی تھیں اور گویا بس نہ چلتا تھا حیدر کو وہاں سے غائب کر دے۔

”آپ چلے جائیں یہاں سے، پلیز کوئی دیکھ لے گا کوئی آ نہ جائے۔“ وہ سراسیمہ تھی، فکر مند تھی، ابھی کل ہی والدہ نے اسے ماموں کے بیٹے صائم کے رشتے کا بتایا تھا، ماموں بھی اس کے لئے خواہش مند تھے، صائم سے مل چکی تھی وہ، اچھا لڑکا تھا، خوبرو بھی، پڑھا لکھا بھی کوئی کمی نہ تھی کہ انکار کا جواز بنتا، اس پہ حیدر کی باتیں، وہ سخت پریشان ہو چکی تھی، حیدر وہاں سے نکلا تو والدہ چلی آئی تھیں، وہ اتنی جلدی خود کو کسی طور بھی نارمل کرنے پہ قادر نہیں تھی، اس پہ والدہ کے سوال۔

”حیدر کیوں کھڑا تھا یہاں؟“ فلاح کا اضطراب بڑھ گیا، یقیناً والدہ حیدر کو کب سے یہاں کھڑا دیکھ چکی تھیں۔

”شش...... شاید چائے کے لئے آئے تھے۔“ کبھی جھوٹ بولا نہیں تھا، جبھی چھپائے نہ چھپا، والدہ نے اک نظر بغور اسے دیکھا۔

”کیا کہہ رہا تھا؟“ وہ بے حد سنجیدہ تھیں، فلاح کا دل گھبرانے لگا، کوئی اس پہ شک آلود نگاہ ڈالے، چاہے وہ ماں ہی ہو، اسے گوارا نہیں تھا۔

”مجھے ان کی باتوں کی بالکل سمجھ نہیں آئی والدہ، پلیز مجھ سے کچھ نہ پوچھیں، بس بابا جان سے کہہ کر ذرا جلدی اپنے گھر پہ شفٹ ہو جائیں، یہاں مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا، جس کا جہاں دل چاہتا ہے، گھس آتا ہے، منہ اٹھا کر اس پہ ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ ان کا اپنا گھر ہے آ سکتے ہیں جہاں مرضی۔“ وہ غصے میں کہہ گئی تھی، مگر والدہ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

”کیا حیدر پہلے بھی ایسی حرکت کر چکا ہے؟“

”جی...... عیشہ بھی تھی تب اور ایسا ہی کہا تھا انہوں نے۔“ وہ ناراضگی سے بتا رہی تھی، والدہ یکدم گم صم ہو کر رہ گئیں اور فکر مند بھی، دو دن انہوں نے اس بات پہ غور کیا پھر شوہر سے سنجیدگی سے مسئلہ بیان کیا۔

”ہمارے گھر کا کام اگر مکمل نہیں بھی ہوا، ہمیں تب بھی وہاں شفٹ کر جانا چاہیے زمان شاہ، ہم بیٹیوں والے ہیں اور بھائی جان کا جوان بیٹا ہے یہاں، لڑکا صرف جوان ہی نہیں اس کا ماحول بھی کھلا ڈلا ہے، میں یہاں ہرگز بھی مطمئن نہیں ہوں۔“ بابا جان نے کتاب بند کر دی، عینک اتار کر بیوی کو دھیان سے دیکھنے لگے، گویا وضاحت کے طلبگار تھے۔

”اینی پرابلم......؟“

”ہے بھی، حیدر کا رویہ عجیب لگا ہے مجھے، بھائی جان کی طرح حاکمانہ مزاج ہے تو بھابھی بیگم کی طرح ڈھٹائی بھی فطرت کا حصہ ہے، باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔“ وہ کھل کر بات کرنا نہیں چاہتی تھیں، بابا جان نے گہرا سانس بھرتے پھر کتاب کھول لی، مگر محض ورق گردانی کر پا رہے تھے، اب پڑھنا ممکن نہیں تھا۔

”حیدر فلاح میں شاید انٹرسٹڈ ہے، مجھ سے بات کی ہے اس نے، وہ شادی کا خواہاں ہے۔“ انہوں نے جتنے اطمینان سے کہا، والدہ اس قدر شاک میں مبتلا ہو گئیں تھیں، یہ سکتہ ٹوٹا تو وہ سخت شاکی ہو گئی تھیں۔

”کیا کہا آپ نے؟ اس نے کہا اور آپ نے سن بھی لیا؟ جبکہ آپ جانتے بھی تھے کہ فلاح کے لئے بھائی جان صائم کی بات کر چکے ہیں اور ہمیں اعتراض بھی نہیں ہے۔“ انہیں غصہ اور جھنجلاہٹ گھیر رہی تھی، بابا جان تحمل سے نرمی سے مسکرائے گئے۔

”بیگم صاحبہ دھیرج، میں نے صرف بات سنی ہے، بات مانی نہیں ہے، ویسے بھی یہ صرف حیدر کی خواہش ہی لگتی ہے، بھابھی بیگم یا بھائی جان کی نہیں، وہ لوگ آمادہ ہی نہیں ہوں گے تو حیدر اکیلا کیا کرے گا۔“ اس جواب پہ والدہ کو قدرے ڈھارس ملی تھی، وہ مطمئن ہوئیں ضرور مگر انہیں تاکید کرنا نہیں بھولیں۔

”ٹھیک ہے اول تو وہ بات کرے نہ اگر کی تو آپ صائم کا بتا دیجئے گا، بلکہ ہم جلد رسم ادا کر کے اس رشتے کو آشکار کر دیں گے، فی الحال تو آپ پہلی فرصت میں اپنے گھر چلیے۔“ بابا جان نے والدہ کی خواہش پہ فوری شفٹنگ کر لی تھی مگر اس کا خاطر خواہ کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا تھا، حیدر کے اصرار اور ضد کے باعث تائی جی کو اس کا ساتھ دینا

پڑا تھا اور تائی ماں کو بھی ناچار قائل ہونا پڑا تھا، جبھی فلاح کے رشتے کے لئے آنا پڑا، صائم کے رشتے کا سن کر بھی ان پہ کوئی اثر نہیں ہو سکا تھا۔

''میں مان لیتی ہوں کہ آپ نے رشتہ اپنے بھائی کے گھر طے کر دیا ہو گا، مگر فلاح کی مرضی یقیناً ہمارے حیدر کی طرف ہے، جبھی حیدر نے اتنا دباؤ ڈال کر ہمیں آنے پہ مجبور کیا ہے۔'' ان کا لہجہ و انداز مخصوص تھا، الزامیہ شک آلود اور متنفرانہ، والدہ کو اتنا ہی غصہ آنا چاہیے تھا۔

''فلاح کے متعلق آپ کا اندازہ آپ کی سوچ بہت غلط ہے بھابھی بیگم، ہماری بیٹی آپ کی یہ غلط فہمی ابھی دور کیے دیتی ہے۔'' انہوں نے تحمل سے کہا تھا اور عیشہ کو کہہ کر فلاح کو وہیں بلوالیا تھا، جو اس صورتحال پہ حیران بھی تھی اور گھبراہٹ زدہ و شرمسار بھی۔

''بیٹے آپ کی تائی ماں حیدر کا پروپوزل لے کر آئی ہیں اور ان کا خیال ہے حیدر کے ساتھ آپ کی کوئی کمٹ منٹ ہے، کیا تم حیدر سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' باپ کے سامنے ایسے الزامات پہ فلاح صحیح معنوں میں زمین میں گڑھ گئی تھی، سبکی و ذلت کے احساس نے آنکھوں میں مرچیں سی بھر دیں، اس کی نظریں اٹھ نہیں رہی تھیں، زبان گنگ ہونے کو تھی، مگر اس وقت وضاحت صفائی بے حد ضروری تھی، سب نظریں اس پہ لگی ہوئی تھیں۔

''میں کسی بھی لحاظ سے حیدر بھائی کی کسی خواہش میں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوں بابا جان، آپ میرے لئے اس سے قبل جو فیصلہ کر چکے ہیں مجھے اس پہ قطعی کوئی اعتراض نہیں ہے، یہ بات میں حیدر بھائی کے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو اتر رہے تھے، گلا بھرا چکا تھا، بابا جان نے اٹھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''مجھے پتا ہے بیٹی! مجھے یقین ہے آپ پہ، آپ اپنے کمرے میں جاؤ اب۔'' وہ کمرے سے نکل آئی تھی، مگر اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، دل بے حد بوجھل تھا۔

☆☆☆

''اس انکار میں غلطی میں چاچو کی فیملی کی کیسے مان لوں مام! جبکہ مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہے کہ آپ نے وہاں کیسے بات کی ہو گی، ایک بات دھیان سے سن لیں آپ، مجھے ہر صورت فلاح چاہیے، اگر وہ سیدھے طریقے سے آپ نے مجھے حاصل نہ کرنے دی تو میں ناجائز اور غلط طریقے اختیار کروں گا، چاہے اٹھوا کیوں نہ لوں اسے، اپنی پوزیشن کا خود خیال کر لیں، فلاح کسی بھی طرح لا کر دیں مجھے، ورنہ طوفان اٹھا دوں گا۔'' حیدر ان کے سامنے کھڑا انہیں دھمکیاں دے رہا تھا، تائی ماں دانستہ خاموش رہیں، جانتی تھیں اپنی اولاد کو انہی پہ گئی تھیں، اگر کسی بات کی ٹھان لی تو پھر پتھر پہ لکیر ہے، پھر ہار نہیں ماننی، چاہے کتنا نقصان ہو جائے۔

''نظر کیا آ گیا تمہیں اس میں؟ چوہیا سی تو ہے بالکل۔'' ان کی نفرت ظاہر ہو گئی تھی۔

''جیسی بھی ہے مجھے چاہیے، پھر سوچیں مام! ان کی ساری جائیداد ہمارے پاس ہے، ہمارے پاس ہی رہے گی، اس جانب بھی دھیان دے لیں، ورنہ لڑکیاں پڑھی لکھی بھی ہیں باشعور بھی۔'' وہ ان کی توجہ دوسری جانب بھی مبذول کرا رہا تھا، وہ لالچی بھی تھا، فطرت میں یہ لالچ ماں کی طرف سے ہی آیا تھا، دوسری بار عاجزی سے رشتہ مانگتے بھی تائی ماں کو ذرا شرم نہیں آئی، مگر وہاں سے دوسری مرتبہ بھی اسی شدت سے انکار ہوا تو ان کا منہ لٹک گیا تھا، حیدر نے معاملے کی خرابی کی سارا الزام اور غصہ بھی انہیں کو دیا تھا۔

''پہلے طریقے سے بات کی ہوتی تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔'' وہ برہم تھا۔

''تو تم کر لو طریقے سے بات، یا اپنے باپ سے کہو وہ کر لے۔'' انہوں نے لحاظ نہ رکھا۔

''خود ہی کروں گا۔'' وہ تنفر سے کہتا پلٹ گیا تھا اور تایا جان سے صاف کہہ ڈالا۔

''مام چاہتی ہی نہیں ہیں میری شادی وہاں ہو، معاملہ انہوں نے دانستہ بگاڑا ہے۔''

''ہم سدھار لیں گے، تم فکر کیوں کرتے ہو بیٹے۔'' تاؤ جی نے مسکرا کر تسلی دی، جو ہو نہیں سکی تھی، جبھی وہ خود سدھار کی کوشش کی خواہش میں وہاں چلا آیا تھا، مگر فلاح اور عیشہ کی بحث جو اس تک اتفاقاً پہنچ گئی تھی، اسے اس اہم محاذ پہ فتح مند کرانے میں اہم کردار ادا کر گئی تھی۔

''صائم میں کوئی خامی نہیں وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے مانتی ہوں، مگر میرے نزدیک اختلاف کی سب سے بڑی وجہ ہی اس کا نون لگ کا حمایتی ہونا ہے، مختلف آراء مختلف سوچ کے ساتھ زندگی ایک ساتھ گزارنا ہرگز آسان کام نہیں ہوتا ہے، عیشہ! ماموں کی پوری فیملی اس معاملے میں کتنی پکی ہے یہ تو تم بھی جانتی ہو، جبکہ مجھے مفاد پرست ان لوگوں سے اتنی ہی چڑ اور نفرت ہے۔''

حیدر کو دانتوں پسینہ آ گیا تھا، وہ بھی تو نون لیگ کا حمایتی تھا، پھر یہ دال کیسے گلتی؟

''بھئی مجھے تو ایسے لوگوں پہ بھی بہت غصہ آتا ہے جو ہنوز نون لیگ کے حمایتی ہیں، آخر کس بنا پہ وہ اب بھی اندھا دھند یہ حمایت کا دم بھر رہے ہیں؟ ایک بندہ جو اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ملک بدر ہوا تھا، جسے سعودیہ نے اس کی گزارش پہ سیاسی پناہ دی تھی، اب اتنا معتبر کیسے ہو گیا ہے کہ اسے ملک کی باگ دوڑ دے دی جائے، ہمارے عوام، کیا کہوں ایسے اندھے لوگوں کو، یہ محبت نہیں ہو سکتی، مفاد ہی ہو سکتا ہے، وہ بھی ذاتی انفرادی مفاد، ورنہ ملک کو تباہی کے دہانے پہ پہنچانے والے لوگوں کی فیور کرتے نظر نہ آتے، یہ کیوں بھول گئے تمام خطائیں ایک طرف، کارگل کی جیتی ہوئی جنگ اسی مفاد پرست آدمی کی وجہ سے ٹیبل پہ بیٹھ کر ہاری گئی تھی، جرائم کی فہرست اتنی طویل ہے اس کی کہ گنوانے بیٹھوں تو شام پڑ جائے مگر......''

''لیکن بجو! آپ ان باتوں کو لے کر جان نہ جلائیں، یہ مردوں کے کام ہیں، مرد ہی جانیں، عورت کو تو گھر اور بچے سنبھالنے ہوتے ہیں، آپ محض اس وجہ سے انکار کریں گی تو شنوائی نہ ہو گی۔'' عیشہ نے سمجھانا چاہا مگر وہ بھڑک کر رہ گئی تھی جیسے، جبھی ٹوک کر جھڑکا۔

''کیسے شنوائی نہیں ہو گی؟ میں نے ماس کمیونکشن کی ڈگری کیوں لی ہے؟ گھر بیٹھنے کے لئے نہیں، مجھے اس شعبے میں کام بھی کرنا ہے، میں جس سے بھی شادی کروں گی، اسے یہ میری بات ماننی ہو گی کہ مجھے صحافت میں نام کمانے سے نہیں روکے گا۔'' فلاح نے جس شد و مد سے کہا، عیشہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی تھی۔

''چلیں...... پھر تو سمجھیں ہو گی آپ کی شادی، ایسا کون ہو گا اعلیٰ ظرف یہاں؟ وہ بھی ہمارے خاندان میں، بجو عقل کے ناخن لیں پلیز۔''

''تم چپ رہو سمجھیں اور والدہ کو وجہ بتانے کی ضرورت نہیں، بس کسی بھی طرح جان چھڑانی ہے مجھے صائم سے۔'' وہ ٹھانے بیٹھی تھی، حیدر وہاں سے پلٹا تو اس کے ہونٹوں پہ مسکان تھی، وہ سوچ چکا تھا اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

”ارے …… حیدر بھائی آپ؟“ موسم ابر آلود تھا، گرج چمک سے ہوتی بارش میں جبکہ والدہ اور بابا جان بھی گھر پہ نہ تھے، عیشہ کو پکوڑوں کی ہڑک جاگ گئی تھی، فلاح کی منت سماجت کرتے کچن میں بھیجنے کے بعد وہ خود چائے کی تیاریوں میں تھی، جب کال بیل کی آواز پہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دروازے پہ آئی تھی، حیدر بالوں سے پانی جھٹکتا مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

”بارش نے مزید سفر کی اجازت دی نہ ہمت رہنے دی، جبھی چلا آیا۔“ وہ وضاحت کر رہا تھا، عیشہ مسکرا دی۔

”بہت اچھے ٹائم پہ آئے ہیں، ہم چائے کے ساتھ پکوڑوں کی عیاشی اڑانے والے تھے۔“

”ویل…… پکوڑے تو اس موسم میں مجھے بھی بہت پسند ہیں، اگر تمہاری بہن بنا کے کھلائے گی تو ساری عمر کو ذائقہ نہیں بھول سکوں گا۔“ عیشہ کی جانب جھک کر وہ شریر انداز میں راز داری سے گویا ہوا تو عیشہ ہنس پڑی تھی۔

”وہی بنا رہی ہیں، آپ بیٹھیں میں تولیہ لاتی ہوں۔“ حیدر وہاں بیٹھنے کے بجائے کچن میں ہی چلا آیا تھا، نگاہ کو مطلوب چہرہ ملا تو چمک اٹھی تھی۔

”السلام علیکم!“ وہ دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے لودیتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”عیشہ مہمان کو اندر لے کر جاؤ، یہ کوئی بیٹھنے کی جگہ تھوڑی ہے، انہیں بتایا ہوتا بابا جان اور والدہ گھر پہ نہیں ہیں۔“ وہ خشک سرد آواز میں جتلا رہی تھی گویا، اس درجہ روکھے انداز پہ عیشہ صرف شرمندہ نہیں ہوئی، جز بز بھی ہو گئی تھی، آگے بڑھ کر تولیہ حیدر کی جانب بڑھایا۔

”آپ بارش میں کہاں خوار ہو رہے تھے بھائی، وہ بھی بائیک پہ، جبکہ آپ کی گاڑی بھی زبردست ہے۔“ خوشگوار انداز گفتگو بالخصوص اپنایا تھا، گویا فلاح کے رویئے کا ازالہ کرنے کی کوشش میں تھی، حالانکہ حیدر جس محاذ پر اترا تھا، وہاں ایسی معمولی بددلی ہرگز اہمیت نہیں رکھتی تھی، جبھی وہ ہشاش بشاش تھا۔

”بس بائیک مجبوری تھی، جلوس میں گاڑی پہ شرکت نہیں کی جا سکتی تھی۔“ تولیے سے ہاتھ منہ صاف کرتا وہ اسٹول پہ ٹک گیا تھا اور براہ راست فلاح کو دیکھنے لگا۔

”آپ کیسی ہیں مہربان خاتون!“ عیشہ کی ہنسی ایک دم چھوٹی تھی۔

”مہربان خاتون!“ وہ کھل کھل کر رہی تھی۔

”واٹ ہیپنڈ؟“ حیدر نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھا۔

”آپ کو اب یاد آیا احوال دریافت کرنے کا؟“ جواباً حیدر نے طویل و عریض قسم کی سرد آہ بھری تھی، پھر بے چارگی سمیت انتہائی یاسیت سے گویا ہوا تھا۔

”ہم تو منتظر تھے، مغرور لوگ شاید ہمیں لفٹ کرا دیں، مگر اپنی ایسی قسمت کہاں۔“ وہ خود اپنے اوپر رحم کھا رہا تھا، فلاح کے گھورنے پہ عیشہ کو اس موضوع کو یہیں چھوڑنا پڑا۔

”آپ کسی جلوس کا بتا رہے تھے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو آج نون لیگ کا کوئی جلسہ نہیں تھا۔“ عیشہ نے بات بدل دی تھی، حیدر سنبھل کر بیٹھ گیا اور فلاح کو دیکھا، جو اپنے کام میں بظاہر پوری طرح مگن تھی، مگر اس کی آمد سے ڈسٹرب ہو چکی تھی اور جز بز بھی۔

”کپتان کا جلسہ تھا ناں آج یار! اور میں ٹھہرا ان کا ازلی فین، یو نو واٹ عیشہ، جب میں پندرہ سال کا تھا ناں، تب کپتان پہلی بار الیکشن

میں کھڑے ہوئے تھے، میرا ووٹ تو تھا نہیں مگر اسپرٹ ضرور تھا، میں نے اتنی ضد کی تھی مام سے کہ رو رو کے سہی مگر انہیں کپتان کو ووٹ دینے پہ مجبور کر دیا تھا، انہیں قریب سے دیکھنا میرے لئے ہمیشہ خوشگوار احساس ہوتا ہے، جبھی جلوس میں شامل ہوا تھا، تمہیں ملنا ہے اگر کپتان سے تو اگلی بار چلنا میرے ساتھ۔“ اپنے کارنامے سناتا ہوا وہ جتنا مگن تھا اس سے کئی گناہ زیادہ اس کی توجہ کا ارتکاز فلاح پہ لگا ہوا تھا، جس کے چہرے کا رنگ کتنی بار بدلا تھا، وہ کڑاہی سے پکوڑے نکالنا بھول کر غیر یقینی سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

”مجھ سے زیادہ تو بجو کو شوق ہے کپتان کو قریب سے دیکھنے کا، آپ ایسا کرنا انہیں لے جانا۔“ عیشہ کا لہجہ اس کا انداز سراسر شرارتی ہوا تھا، فلاح نہ صرف سرخ پڑی بلکہ سنبھل بھی گئی تھی کہ حیدر اب چونکنے کی اداکاری کرتا ہوا اسے خوشگوار حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔

”ریئلی؟ حیرت انگیز طور پہ ہماری یہاں پسند مل گئی ہے مبارک ہو۔“ وہ شریر ہوا تھا اور دانت نکالتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کو اس کی جانب بڑھا دیا، فلاح بدک سی گئی چمچ کڑاہی میں پٹخا اور چولہا بند کر دیا۔

”پکوڑے بن گئے ہیں، یہ نکال لو۔“ وہ دھپ دھپ کرتی باہر نکل گئی، عیشہ گہرا سانس بھرتی کوکنگ رینج کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور چمچ کی مدد سے پکوڑے ڈش میں منتقل کرنے شروع کیے۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے بھائی! آپ سب تو نون لیگ کے حامی ہیں اور……“

”شش…… پاگل۔“ وہ ہونٹوں پہ انگلی رکھتا جیسے بلبلا اٹھا۔

”کوائیٹ سلی گرل، سارا معاملہ خراب کرو گی، تمہاری بہن کو رام کرنے کو بیل رہا ہوں یہ سارے پاپڑ۔“

”واٹ؟“ وہ بھونچکی رہ گئی، حیدر ہلکی ہونے لگا تو وہ بے بس ہوئی تھی۔

”مگر یہ تو سراسر دھوکہ ہے بھائی!“ عیشہ اس کے اصرار پہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو کر کہہ گئی۔

”کیسا دھوکا؟ جو ماضی میں ہوا سو ہوا، میں پارٹی بدل لوں گا، وہی کروں گا جو تمہاری سسٹر چاہے گی۔“

”واقعی؟“ عیشہ کی آنکھیں چمکنے لگیں مگر یقین نہیں آتا تھا۔

”ہرگز شک نہ کرو لڑکی۔“ وہ مسکرانے لگا تھا۔

”اتنی محبت کرنے لگے ہیں فلاح سے؟“ عیشہ کی مسکراہٹ بے اختیار ہوئی۔

”اس سے بھی کہیں زیادہ کہ۔“

بے پناہ بے قدر بے حد بے اختیار ہو کر
ہم نے انہیں اتنا چاہا کہ انتہا کر دی

وہ گنگنایا تو عیشہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

”عیشہ چائے مجھے بھی دے جاؤ یہیں۔“ وہ باہر سے ہی چلائی تھی، عیشہ کے ساتھ حیدر نے بھی سرد آہ بھر لی۔

”تمہاری بہن کو متاثر کرنا اتنا بھی آسان نہیں ہے۔“ اس نے منہ بسورا، عیشہ ہنستی چلی گئی تھی، پھر اسے چھیڑنے سے باز نہ رہ سکی۔

”اتنا مزہ آتا تھا اگر آپ نہ آتے، اب وہ اکیلی چائے پیئے گی، ہم اکیلے۔“ اپنی بات کہہ کر وہ خود ہی حظ لے کر ہنسنے لگی۔

”اتنا مغرور نہ ہو تم، وہ وقت دور نہیں جب ہم دو ہوں گے اور اکیلی تم ہو گی۔“ وہ بھی کہاں کم تھا، بازی الٹا دی تھی، عیشہ محض اسے گھور کر رہ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گئی۔

☆☆☆

فلاح صبح کے لئے یونیورسٹی جانے کے لئے کپڑے استری کر رہی تھی جبکہ عیشہ نوٹس بنا رہی تھی، جب اس کے سیل فون پہ وائبریشن ہونے لگی تھی، اس نے سائیڈ پہ دھرا فون اٹھایا تو دھک سے رہ گئی، کال حیدر کی تھی، اس روز وہ جاتے ہوئے اپنا نمبر اس کے موبائل میں محفوظ کر گیا تھا، کہ وہ فلاح کے حوالے سے آگاہی کے لئے وہ اس سے رابطے میں رہنا چاہتا تھا، عیشہ نے فلاح کو دیکھتے ہوئے کال ڈس کنکٹ کر دی اور عجلت میں ایک ٹیکسٹ اسے کیا تھا۔

''بھائی پلیز ڈونٹ کال می، بجو اس وقت میرے ساتھ ہیں، میں بات نہیں کر سکتی۔''

''تو پھر کب؟'' اگلے لمحے اس کا میسج آ گیا تھا، وہ بے چین تھا، یہ صاف ظاہر تھا۔

''میسج پہ پوچھ لیں جو پوچھنا ہے۔'' عیشہ کو اس پہ ترس آیا۔

''فلاح مان گئی کیا؟'' حیدر سوال کر رہا تھا۔

''ہماری اس موضوع پہ دوبارہ بات نہیں ہوئی ہے بھائی! مگر یہ طے ہے کہ وہ صائم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے واضح کر دیا تھا، حیدر اصل موضوع پہ آ گیا۔

''تو تم میرے لئے ہموار کرو نا اسے، اس بار ڈیڈ آئیں تو انکار نہیں ہونا چاہیے۔''

''بجو کی کچھ شرائط ہیں بھائی! شادی کے بعد وہ جاب کرنا چاہیں گی۔'' اس نے کھل کر بات کرنا مناسب سمجھا۔

''ہاں تو کر لے، صوحا وغیرہ بھی تو کر رہی ہیں ناں۔'' حیدر نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔

''لیکن بجو کسی چینل کے لئے کام کریں گی، ٹی وی پہ آئیں گی، ہاں پردے کا خیال وہ خود رکھتی ہیں۔'' عیشہ نے اس کے عزائم بیان کیے، یہ جانے سمجھے بغیر کہ وہ جانتا ہے اور کچھ ٹھانے بھی بیٹھا ہے۔

''مینشن ناٹ عیشہ! میں ہرگز کنزرویٹو نہیں ہوں۔''

''تو پھر بہتر ہے آپ خود کھل کر ان سے بات کر لیں، میرا نہیں خیال کہ اس کے بعد وہ انکار کر سکیں گی۔'' اس نے بات ختم کر دی، حیدر سوچ میں پڑ گیا، اگلے دن وہ خود فلاح کے سامنے تھا، فلاح کترا کر نکل جانا چاہتی تھی کہ وہ عاجز ہو کر ٹوک گیا تھا۔

''فلاح پلیز! تم جانتی ہو میں شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔''

''مگر میں انکار کر چکی ہوں۔'' فلاح اسے نظر انداز کر رہی تھی۔

''مگر انکار کی وجہ؟ فلاح میں وہ چاہوں گا جو تم چاہتی ہو، زندگی آسان تب ہوتی ہے جب دونوں فریقین باہم رضامندی سے ہر کام کریں، سمجھ رہی ہو؟'' فلاح تھم سی گئی تھی، اس نے گردن موڑ کر سنجیدگی سے اسے دیکھا تھا۔

''آپ واقعی کپتان میرا مطلب پی ٹی آئی کے ساتھ ہیں؟'' وہ جانچتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، حیدر کو لگا جیسے ایکدم فتح کے قریب جا پہنچا ہے۔

''ہاں بالکل اور میں تمہیں سپورٹ کروں گا تمہارے ہر معاملے پہ۔''

''سچ کہہ رہے ہیں؟'' وہ غیر یقین تھی، ایک بار پھر ایک مرد نے داؤ کھیلا تھا، ایک بار پھر ایک عورت دھوکہ کھا رہی تھی۔

''محبت میں سچ کہا جاتا ہے فلاح! تمہیں یقین کیوں نہیں آ جاتا۔'' اسے لو دیتی نظروں سے دیکھتا وہ مدھم گمبھیر لہجے میں بولا، داؤ چل گیا، مرد

کامیاب ٹھہرا، عورت پھر دھوکہ کھا گئی، اس کی گلابی پڑتی رنگت جھک کر لرزتی پلکیں اس کی ہار کی گواہ بن گئی تھیں، حیدر کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

''میں جاب کرنا چاہوں گی، آپ کو میرے ٹی وی پہ آنے پہ اعتراض تو نہ ہوگا؟''

''ہرگز ہرگز بھی نہیں۔'' اس کی مسکراہٹ ہنسی کی حد کو چھو آئی، فلاح بے خبر تھی بے خبر رہی، اسے لگا اس کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔

''پھر ٹھیک ہے، کر لیں بابا جان سے بات، اب انکار نہیں کروں گی۔'' وہ وہاں سے اٹھ گئی، حیدر بے اختیار ہنسنے لگا، وہ اپنی فتح کو انجوائے کر رہا تھا، بعد میں کیا کرنا تھا کیا ہونا تھا، یہ فلاح کے نہیں اس کے اختیار میں تھا، اس کا خیال تھا عورت پہ ایک بار اختیار حاصل کر لو، اسے اپنے گھر لے آؤ پھر جیسے چاہو رکھو اسے، جو چاہے منوا لو اسے، اسے کہاں جانا ہوتا ہے، وہ ان زنجیروں کو نہیں توڑ سکتی جو مرد اس کے پیروں میں ڈالتا ہے۔

نکاح کی زنجیر، اپنی محبت کی زنجیر، اپنی اولاد کی زنجیر۔

☆☆☆

پھر واقعی انکار نہ ہوا، ایک فلاح ہی راضی نہ تھی، ورنہ بابا جان کو تو پہلے ہی اعتراض نہیں تھا، والدہ جتنا بھی خفا ہوئیں مگر بابا جان کا موقف تھا۔

''زندگی بچوں کو گزارنا ہوتی ہے مرضی اور پسند بھی انہی کی ہونی چاہیے، بیگم صاحبہ! ہم سفر کوئی جوتا یا لباس نہیں ہوتا کہ جسے دل پہ جبر کر کے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود ایک بار پہن لیا، یہ زندگی کا ایسا ساتھی ہوتا ہے جس سے دل نہ ملتا ہو، پسندیدگی کا احساس نہ ہو، تو زندگی جیسی تکلیف دہ چیز اور کوئی دوسری نہیں ہوتی۔''

حیدر اپنی فتح پہ بہت سرشار تھا اور شادی فوری چاہتا تھا، مگر فلاح ہرگز بھی تعلیم مکمل کیے بغیر شادی پہ آمادہ نہیں تھی، مگر چلی حیدر کی ہی تھی، وہ ایک بار جیت گیا تھا تو آئندہ زندگی میں ہر مقام پہ اسے ہی جیتنا تھا، یہ اسے یقین تھا، ان کی شادی جن دنوں طے ہوئی انہی دنوں میں الیکشن کی تیاریاں بھی زوروں پہ تھیں اور فلاح کپتان کو دیکھنے اس کے جلسے میں شریک ہونے کو بے قرار تھی۔

''والدہ نے ہمیں کبھی اس کی اجازت نہیں دی، آپ ہمیں لے چلیں ناں وہاں پلیز۔'' وہ منت پہ اتر رہی تھی اور حیدر جز بز ہوا جاتا تھا اور ہر صورت ٹالنے پہ تلا تھا۔

''مگر چچی جان کو پتا لگ جائے گا تو۔''

''نہیں پتا چلے گا ناں، آپ کہہ دینا، شاپنگ کے لئے لے کر جا رہا ہوں۔'' اس کا اصرار بڑھنے لگا تو حیدر کو جان چھڑانا مشکل ہونے لگی۔

''اوکے چلیں گے۔'' اور اسے ساتھ لے آیا تھا، مگر کپتان تک پہنچنا کہاں ممکن تھا، ویسے بھی وہ ابھی پہنچے نہیں تھے، وہاں روایتی گہما گہمی تھی، ان کے متوالوں کا جوش و خروش دیدنی تھا، فلاح بھی بے حد پرجوش تھی، سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے پی ٹی آئی کے جھنڈے کو حجاب کے انداز میں چہرے پہ لپیٹ رکھا تھا اور جب کپتان آئے، ہر شے پہ وہی چھا گئے، اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بندہ آج بھی ہمیشہ کی طرح دلوں کو تسخیر کرنے کا باعث تھا۔

گریس فل، شاندار، وجیہہ، بے پناہ وجیہہ اور دراز قامت، فلاح انہیں عقیدت مندانہ نظروں محترم جذبات سمیت دیکھتی رہی، وہ عام حکمرانوں یا سیاست دانوں جیسا روایتی خطاب

نہیں کرتے تھے، ان کے انداز میں قائداعظم جیسا جوش خطابت اور ولولہ انگیز الفاظ تھے، جن سے اپنائیت سادگی اور عزم چھلکتا تھا، تدبر چھلکتا تھا، وہ ذاتی نہیں اجتماعی اور قومی مفاد کے اصلاح کے خواہاں تھے، ان کی زیرک نگاہ ملک کے معمولی مسائل پر بھی گہری تھی، ان مسائل کے حل کی خواہش اور لگن ان کی آنکھوں سے چھلکتی پڑتی تھی، انہوں نے اپنا شاندار یادگار قابل ستائش ماضی نہیں دہرایا، انہوں نے مستقبل کے سنہرے خوابوں کا ذکر کیا، ان کے الفاظ نوجوانوں کے دلوں میں امنگ جوش اور جذبے پیدا کرنے کا باعث بن رہے تھے، فلاح بھی واپس لوٹی تو بے حد سرشار تھی، مسکراہٹ ہونٹوں سے الگ ہوتی ہی نہ تھی۔

"میری ایک خواہش پایہ تکمیل کو پہنچی، کپتان کو رئیل میں دیکھنے کی خواہش، تم دیکھنا اک وقت وہ بھی آئے گا، میں کپتان کے ساتھ بیٹھوں گی ان کا انٹرویو کرنے کی خاطر۔" اس کی آنکھوں میں سنہرے مستقبل کے سنہرے سپنے جھلمل کرتے تھے، عیشہ مسکرا دی، جبکہ حیدر رقابت کی آگ میں اس روز پہلی بار بھڑ بھڑ جلا تھا، اس کے چہرے پہ برہمی تھی، کدورت تھی اور کوئی عزم بھی، فلاح کے سارے سپنے بکھیر دینے کا عزم۔

☆☆☆

الیکشن ان کی شادی سے کچھ دن پہلے آگئے تھے اور اس سے بھی پہلے وہ حادثہ رونما ہو گیا، جس نے پاکستانی قوم کے دلوں کی دھڑکنوں کو روک لیا تھا، فلاح تو اس جلسے میں بھی جانا چاہتی تھی، مگر والدہ اسے شادی سے ایک ہفتہ قبل کسی طور بھی گھر سے باہر نکالنے پہ آمادہ نہ تھیں، حیدر بھی پس و پیش سے کام لے رہا تھا اسے کامیابی نہ ہو سکی، مگر لمحہ لمحہ کی رپورٹ کے لئے ٹی وی کی جان نہ چھوڑی، اس وقت صحیح معنوں میں زمین اس کے قدموں سے نکل گئی اور آنکھوں تلے اندھیرے چھاتے چلے گئے تھے جب سیاسی سازش کا شکار ہوئے کپتان اتنی بلندی سے سر کے بل گرے اور موت و زیست کی کشمکش کا شکار ہو گئے، وہ لمحے جتنے جان لیوا تھے اسی قدر تھم کر رہ گئے تھے جیسے، تمام ٹی وی چینلز الرٹ تھے اور لمحہ لمحہ کی رپورٹ پیش کر رہے تھے، بھانت بھانت کے بیانات اور تبصرے، فلاح کو لگتا تھا کپتان سے پہلے اسے لازماً کچھ ہو جائے گا، اعصاب پہ ایسے ہی خوف و ہراس اور وحشت کا غلبہ تھا، دہشت ایسی جس کا کوئی انت نہ تھا، اسے اپنی خبر نہ رہی تھی، سوجھی آنکھوں میں سراسیمگی لئے وہ لڑکی ایسی نظر آتی تھی جس کا سب کچھ اس لمحے داؤ پہ جا لگا ہو، وہ اپنی خبر رکھتی بھی تو کس طرح، وہ اتنی حساس تھی، وہ اتنی خواہش مند تھی، پاکستان کی تقدیر بدلے جانے کے حوالے سے، قسمت سے ایک سچا کھرا لیڈر ملا تھا، وہ بھی خدانخواستہ...... وہ ایسا کوئی تصور کرتے بھی لرزتی تھی، اس کے بعد کون تھا اس جیسا، وہ کس کی طرف امید سے دیکھے گی، کون آگے بڑھے گا، ایک ایک لمحہ اس پہ قیامت کی طرح بھاری تھا، گویا سر پہ سورج کی بے رحم شعاعوں کی تپش تھی اور پیروں تلے پل صراط، امیدیں ہر لمحہ کٹ کٹ کر گرتی تھی اور اذیت سے برا حال تھا، کپتان کی حالت تشویش ناک تھی، ڈاکٹرز دعا کا کہہ رہے تھے، یہ ٹائم انتہائی اہم تھا، وہ نفل پڑھنے لگی کبھی سجدے میں گر جاتی، پھر اٹھ کر بے قراری سے ٹہلنے لگتی، سارا وجود جیسے برف میں دفن ہوتا محسوس ہو رہا تھا، آنسو بے بسی کی انتہائی کیفیت میں بعل بعل بہتے تھے۔

"تو کیا کپتان کی اس ساری تپسیا کا یہ

انجام ہونا تھا۔" اک خیال ذہن میں در آیا اور وہ لرزنے لگی، خوف کا مایوسی کا سرد احساس اس کے دل پہ اپنے منحوس پنجے مارنے لگا، بے بسی کے شدید احساس سمیت ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی، دعا مانگنے لگی، تڑپنے لگی، ایسے میں حیدر کی کال آئی تو کسی طرح بھی خود پہ ضبط کیے بنا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"حیدر! آپ نے دیکھا کیا ہو گیا۔" وہ بلک پڑی تھی۔

"کیا ہو گیا؟" حیدر کھٹک سا گیا، اسے تو کپتان کے حوالے سے ایسی کوئی خبر بھی نہ ملی تھی، وہ تو دوستوں کے ہمراہ محفل میں مزے لوٹ رہا تھا، نیوز وغیرہ سے اسے بس اپنے باپ کی اہم خبر تک دلچسپی ہوتی وہ بھی مام اسے بتایا کرتیں، تب سن لیا کرتا۔

"کپتان...... انہیں کچھ ہو گا تو نہیں نا حیدر!" اس کے لہجے میں خوف ہی خوف تھا۔

"انہیں کیا ہونا ہے یار! اچھے بھلے تو ہیں۔" وہ بدمزہ ہوا تھا۔

"تو کیا آپ کو معلوم نہیں ہے، کپتان گر گئے ہیں، بہت سیریس حالت ہے ان کی، حیدر پلیز دو رکعت نماز حاجت پڑھیں، دعا مانگیں ان کی زندگی کی، ہم ہرگز انہیں کھونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، پلیز ابھی جائیں مسجد۔" وہ التجاؤں پہ اتر آئی، وہ گڑگڑا رہی تھی، حیدر کے چہرے پہ ناگواری اتر آئی، البتہ لہجہ نارمل رکھا اور اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

"بے وقوف احمق لڑکی! پاگل ہوں میں جو رقیب روسیاہ کے لئے دعائیں مانگوں۔" وہ بڑبڑا رہا تھا، ادھر فلاح پھر سے دعائے شفا پڑھ رہی تھی، یہ اس جیسے لوگوں کی التجائیں تھیں گڑگڑا کر مانگی دعائیں تھیں کہ اللہ نے کپتان کی زندگی بخش دی تھی اور وہ روبصحت ہوتے چلے گئے تھے الحمدللہ، فلاح کو لگا تھا صرف کپتان نہیں وہ بھی پھر سے جی اٹھی ہے، کپتان ٹھیک تو ہو گئے مگر الیکشن میں شریک نہ ہو سکے، ووٹنگ ہوئی، الیکشن ہوئے اور مقصد حاصل کر لیا گیا، یعنی تاریخی اور پیمانے پہ دھندلی کر دی گئی اور بے ضمیر لوگ پھر دوبارہ کرسیوں پہ قابض ہو گئے، پاک وطن پھر سے چوروں کے ہاتھوں سے نکل کر ڈاکوؤں کے قبضے میں چلا گیا، دکھ بڑا تھا مگر کیپٹن کی زندگی کی نعمت کی خوشی بڑی تھی، فلاح کو تو کم از کم یہی لگتا تھا، اس نے خود کو تسلی دے لی تھی، یار زندہ صحبت باقی۔

☆☆☆

جب ان کی شادی ہوئی تو فلاح بہت حد تک نارمل ہو چکی تھی، مگر شادی پہ جیسے جیسے فنکشن ہوئے اور جس قسم کی وہاں حرکات ہوئیں انہیں ہرگز بھی سراہا نہیں جا سکتا تھا، مردوں نے شراب کا کھلم کھلا استعمال کیا، عورتوں نے ڈانس کے شغل کے نام پہ بے ہودگی کی انتہا کر دی، صوحا وثنا نے بھی اپنی دیگر کزنز کے ساتھ ڈانس کیا، کپل ڈانس میں ان کے ساتھ ان کے کولیگز اور کزن شامل ہوتے رہے، ان کے ہاں اس قسم کے بے حیائی و بے تکلفی کے مظاہروں کو غلط نہیں سمجھا جاتا تھا، فلاح اس قسم کے ہنگاموں اور رسموں سے بے حد پریشان اور کنفیوژ ہو چکی تھی، اس وقت اس کا موڈ اور بھی خراب ہو گیا تھا جب حیدر نے بھی اپنی کزن کے ساتھ ایسا ہی واہیات ڈانس پیش کیا تھا، اس سے قبل وہ سب کے اکسانے پہ فلاح کو بھی اٹھانا چاہ رہا تھا اس خرافات کے لئے، اس کے انکار پہ اس نے کزن کی پیشکش رد نہیں کی تھی، وہ جتنی جزبز تھی، جتنی خفا تھی یہ اس کے چہرے پہ لکھا ہوا تھا جسے پڑھتے ہی تائی جان نے اسے

منظر سے غائب کرانا مناسب سمجھتے اسد کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر آنے کا کہا تھا، اسد فلاح کا دیور اور حیدر کا چھوٹا بھائی تھا، اس کے بھاری لباس کی وجہ سے سہارا دے کر اسے کمرے میں پہنچانا چاہتا تھا، فلاح تو سنتے ہی بدک کر رہ گئی تھی جیسے۔

''میں اسد بھائی کے ساتھ اوپر نہیں جاؤں گی تائی جان، آپ سہارا دیں مجھے، نہیں تو صوحا یا ثنا آپی سے کہہ دیں۔'' وہ سخت جز بز ہو کر کہہ رہی تھی، اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ تائی ماں کے ساتھ اسد کو بھی ناگوار خاطر ہوا تھا۔

''کیوں؟ اسد کے ساتھ کیا اعتراض ہے اور میری ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں کہ اتنی سیڑھیاں چڑھوں وہ بھی تمہیں سہارا دے کر، اسد ہی چھوڑ آئے گا، دیور ہے تمہارا، یعنی بھائی، گریز کیسا؟'' انہوں نے تیکھے انداز میں انکار کرتے اپنی بات بھی منوانا چاہی، فلاح دوبارہ صوفے پہ بیٹھ گئی۔

''جی دیور ہیں، بھائی سمجھتی ہوں انہیں، مگر سگے نہیں ہیں، اگر آپ سے یا آپی سے یہ کام نہیں ہو سکتا تو پھر حیدر سے کہہ دیں۔'' بات غلط نہیں تھی، مگر غلط معنوں میں لے لی گئی، تائی جان گال پیٹنے لگیں، ان کے خیال میں لڑکی نے اتاؤلے پن کے ساتھ بے شرمی و بے حیائی کی انتہا کر دی تھی۔

''توبہ توبہ بھئی، آج کل کی لڑکیوں میں ذرا شرم نہیں، کیسے منہ پھاڑ کر شوہر کو قریب لانے کا بہانہ ڈھونڈ لیا، ایک ہمارا دور تھا، کئی کئی مہینوں شوہر سے گھونگھٹ نکال کر رکھا کرتے تھے۔'' وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں، جسے اسد نے بہت انجوائے کیا تھا اور بھاگ کر حیدر کو بلا لایا بلکہ ساری صورت حال سے بھی آگاہ کر دیا، وہ ہنستا ہوا آ کر اس کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔

''میں نے سنا ہے تم بہانے سے مجھے بلا رہی ہو، بہانے کی کیا ضرورت، ایسے ہی آواز دے لیتیں۔'' اس کی نظریں شوخ تھیں، فلاح بے تحاشا سرخ پڑ گئی، آنکھیں جلنے سی لگیں، کیسے لوگ تھے، بات کا بتنگڑ بنانے والے۔

''آؤ اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔'' حیدر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اٹھا کر کھڑا کر دیا، اس کی پلکوں پر لرزتے آنسو گالوں پہ پھیل گئے، وہ گریزاں بھی تھی اور شرمسار بھی۔

''چھوڑیں مجھے میں چل سکتی ہوں۔'' وہ پیچھے ہٹ کر بولی تھی، حیدر نے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے خفگی کی وجہ سمجھ کر ہی اسے بازوؤں پہ اٹھا لیا تھا، وہ جتنا بھی کسمسائی مگر پرواہ نہیں کی گئی، وہ اسے یونہی اٹھائے سیڑھیاں چڑھنے لگا، فلاح دھک سے رہ گئی تھی، بہت سی چبھتی نظریں اس کو اپنے وجود میں سوراخ کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''کسی کی بات کو محسوس کرنے کی ضرورت نہیں، ریلیکس۔'' وہ اسے حوصلہ دے رہا تھا، فلاح کا دل بھرانے لگا۔

''میرا مقصد وہ نہیں تھا جو تائی اماں سمجھیں، یا جو آپ سمجھے، دیور کو حدیث مبارکہ میں آگ سے تشبیہ دی گئی ہے، میں ہرگز کسی کو اتنی بے تکلفی کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' اس کے بازوؤں سے نکلنے کو مزاحمت کرتی وہ جیسے وضاحت کر رہی تھی، حیدر بے ساختہ ہنسنے لگا۔

''کم آن یار! تمہیں غلط سمجھ کون رہا ہے اور ذرا یہ اپنا بازو میری گردن میں تو ڈالو، واقعی لباس بہت بھاری ہے، ورنہ تم اتنی طاقت ور تو نہیں کہ مجھ سے اٹھائی نہ جاؤ۔'' اس نے شرارت سے کہتے اس کا دھیان واقعی بٹا دیا تھا، فلاح کا حجاب سے خفت سے برا حال ہو گیا، ایک بار پھر وہ اس کی گرفت میں مچلی مگر حیدر نے اسے کمرے میں لا کر کہرے بٹھا دیا تھا، پھر دونوں بازو سینے پہ لپیٹ کر اسے سنبھل کر بیٹھتے اپنا دوپٹہ اور بندیا درست کرتے مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔

''فلاح!'' وہ بولا تو اس کی آواز گمبھیر تر تھی، آگے کی سمت جھک کر اس نے دونوں بازو بیڈ پہ رکھ دیئے تھے، اب وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا، فلاح کا دل دھڑک اٹھا، پلکیں جھک گئیں، رنگت گلابی ہونے لگی۔

''فلاح میری جان! تم کتنی پیاری لگ رہی ہو، تمہیں اندازہ ہے؟'' فلاح کچھ نہیں بولی، دھیرے دھیرے کانپنے لگی۔

''اک بات مانو گی فلاح!'' وہ سوال کر رہا تھا۔

''کیا بات؟'' فلاح نے چونک کر لمحہ بھر کو اسے دیکھا۔

''کپتان کے لئے اپنی پسندیدگی ہر کسی پہ ظاہر نہ کرو گی۔'' مطالبہ ہوا تھا، وہ ایکدم چپ کر گئی۔

''دیکھو ناں، ہر کوئی صاف ستھری سوچ کا مالک نہیں ہوتا، وہ بہت ہینڈسم ہیں، بہت ڈیشنگ لڑکیاں آج بھی ان پہ دوسرے انداز میں ہی مرتی ہیں، تمہاری باتوں سے بھی لوگ ایسا ہی مطلب اخذ کریں، مجھے ہرگز اچھا نہیں لگے گا۔'' وہ قائل کر رہا تھا، فلاح آہستگی سے مسکرا دی اور محض سر ہلا دیا۔

''ایک اور بات...... اگر زندگی میں کبھی مجھ میں اور کپتان میں انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا تو تمہارا انتخاب میں ہوں گا ناں؟ مجھے یقین دلا دو۔'' وہ سوال کر رہا تھا، فلاح بھونچکی ہو کر رہ گئی۔

''یہ کیوں کہا آپ نے؟ ایسا کیوں ہو گا بھلا؟'' وہ ششدر تھی۔

''بتاؤ ناں تم۔'' وہ بضد تھا، اصرار کرنے لگا، فلاح عاجز ہوئی، مضطرب ہونے لگی۔

''یہ کیسا سوال ہے حیدر؟ کیسا موازنہ؟ میں کیسے بتاؤں آپ کو کہ آپ کا اور کپتان کا کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں، آپ بس آپ ہیں، کپتان صرف کپتان ہی ہیں، پھر ایسا مرحلہ کیوں درپیش ہو گا؟ پھر ایسا قیاس بھی کیوں کیا جائے؟'' وہ عاجز ہو کر کہہ رہی تھی، مگر ادھر اصرار جاری رہا۔

''پھر بھی...... میری تسلی کو ہی کہہ دو۔''

''حیدر! ان کے حوالے سے جو میرے جذبات و احساسات ہیں، ان سے آپ آگاہ ہیں، آپ کو ان پہ اعتراض بھی نہیں تھا، جبھی آج میں اس حیثیت سے آپ کے سامنے ہوں، آپ ان خواہشات کی تکمیل کے لئے میرے ہمراہ ہوں گے آپ مجھے یقین دلا چکے، پھر اس سوا کا اس اصرار کا کیا جواز باقی رہتا ہے؟'' وہ متفکر بھی تھی، مضطرب بھی، حیدر کو بے تحاشا غصہ آنے لگا، اس نے جانا تھا، فلاح اتنی بھی سیدھی اور بے وقوف نہیں تھی، جتنی وہ اسے سمجھ رہا تھا، وہ زندگی کے آغاز پر ہرگز ایسا کوئی عہد ایسا کوئی وعدہ کرنے پہ آمادہ نہیں تھی، جو آنے والے وقت میں اس کے لئے کوئی روکاٹ کھڑی کر دیتا، اسے لگا وہ اس اہم مقام پہ جیت کر بھی نہیں جیتا، مگر اس جیت کو کیسے دائمی کیسے بنانا ہے، اس سے آگاہ تھا وہ۔

☆☆☆

ان کی شادی کی تقریب ختم ہوئی تو دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، وہ چونکہ ہرگز بھی شوقین نہیں تھی جبھی اکتانے سی لگی تھی، اس روز بھی حیدر نے اسے تیار ہونے کا کہا تھا، وہ بے زار لگ رہی تھی، ذہن بٹانے کو اس نے صیفہ سے بات کرنا چاہی تھی، فون اٹھایا تو کسی انجان نمبر سے میسج تھا،

وہ بے دھیانی میں کھول کر پڑھنے لگی، اگلے لمحے اس نے ہونٹ بھینچتے بے حد خراب موڈ کے ساتھ میسج ڈیلیٹ کرتے سیل فون پٹخ دیا تھا، اندر داخل ہوتے حیدر نے اس حرکت کو بالخصوص نوٹس کیا۔

''خیریت؟ کس پہ آرہا ہے اتنا غصہ؟''

''جیت ہضم نہیں ہو رہی، سطحی جگت بازی پہ اتر رہے ہیں نون لیگی۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی، حیدر نے بھنوؤں کو سوالیہ انداز میں سکیڑ کر جنبش دی۔

''مطلب......؟''

''فارورڈ میسج تھا، کہ نیا پاکستان کیسے بنتا، ان کا مستری تو عمارت بنانے سے قبل ہی بیمار ہو گیا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو اتر رہے تھے، حیدر گہرا سانس بھرتا اس کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھ گیا، وہ جانتا تھا انسلٹ کا یہ انداز عالی شان کپتان کے لئے اس کی عزیز از جان بیوی کو ہرگز پسند نہیں آیا تھا، وہ ستھری سوچ کی مالک تھی، سطح سے گر کر بات چیت اسے پسند نہیں آسکتی تھی، اس کا نظریہ تھا، اختلافات نظریات سے ہونے چاہیں شخصیات سے نہیں اور ان اختلافات کی وضاحت دلیل سے کی جانی چاہیے، تذلیل سے نہیں، حیدر بڑی مشکلوں سے اسے کمپوزڈ کر پایا، کتنی دیر اسے سمجھاتا رہا۔

''میری جان! میری جان! مستری کسے کہتے ہیں؟ معمار کو ناں، معمار وہ ہوتا ہے جو کسی بھی چیز کو بناتا ہے، تعمیر کرتا ہے وہ تعمیر عمارت کی بھی ہو سکتی ہے، اخلاقیات کی بھی، نظریات و احساسات کی بھی، ہاں ہیں کپتان مستری...... مگر انقلاب کے، شعور و بیداری کے، نئے پاکستان کے، جیسے پاکستان کے معمار تھے قائداعظم، میری جان اگر لوگ ایسا کہتے ہیں، محض مضحکہ اڑانے کی نیت سے بھی تو تم اپنی سوچ کا پیمانہ بلند ہی رکھو، اسے لوگوں کا مقصد جلانا ہے، تم جلو گی تو اور جلائیں گے، ان کا کام جو یہی ہے، ابھی تو اس سفر میں اور جانے کیا کچھ سہنا پڑے، حوصلوں کو جوان رکھو، مجھے اپنی بیوی مسکراتی ہوئی پیاری لگتی ہے، خوش خوش اچھی لگتی ہے، سو ایسے رویوں کا جواب نظر اندازی بردباری سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ اس کا گال تھپتھپا کر مسکرایا تھا، فلاح قائل ہونے لگی، ہلکی پھلکی سی ہو گئی، اسے فخر محسوس ہوا، اس کا ساتھی کتنا سمجھتا ہے اسے، کس قدر خیال ہے اسے اس کے احساسات کا، حالانکہ وہ نہیں سمجھ سکی تھی، حیدر نہ صرف مطلبی تھا، بلکہ چاپلوس بھی تھا، اسے اپنا مطلب نکالنا ہوتا تھا بس، اس کام کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا اور فلاح اسے اس کی محبت سمجھتی رہی، اپنے لئے بھی، کپتان کے لئے بھی، حالانکہ محبت تو کہیں بھی نہ تھی، نہ ادھر نہ ادھر، یہاں تو مطلب تھا، مقصد تھا اور خواہش تھی اور بس شادی کے فوراً بعد حیدر کا ٹرانسفر اسلام آباد ہو گیا تھا، فلاح پہ انوکھی افتاد آ پڑی تھی گویا، اس کے ایگزیم نزدیک تر تھے، اتنی جلدی میں مائیگریشن بھی ممکن نہیں تھا، وہ جانا نہیں چاہتی تھی ہرگز بھی، جبکہ حیدر اسے کسی طور بھی یہاں چھوڑ کر جانے پہ آمادہ نہیں تھا۔

''میری اتنے سالوں کی محنت ہے حیدر! پلیز ضد نہ کریں۔'' وہ گویا گڑگڑا رہی تھی، وہ محبتیں لٹا رہا تھا۔

''یہ ہماری زندگی کے بہترین دن ہیں فلاح! میں ہرگز بھی تمہیں انہیں برباد نہیں کرنے دے سکتا اور میں وہاں تمہارے بغیر رہوں گا کیسے؟ سوچو۔'' وہ اس پہ جال پھینک رہا تھا، التفات کے لگاؤ کے محبت کے بے قراری کے، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ فلاح سے شادی طے ہو جانے کے بعد سے ہی ٹرانسفر کی کوشش میں لگ گیا تھا، اس کا اصل مقصد ہی فلاح کی تعلیم مکمل نہ ہونے دینا تھا، نہ وہ ڈگری حاصل کر پاتی، نہ جاب کا رولا اٹھتا، فلاح کا اصرار التجائیں یہاں تک کہ خفگی بھی اثر نہ دکھلا سکی، کہ اب کوئی بھی اس معاملے میں اس کا حامی نظر نہیں آتا تھا، بابا جان بھی اسے محض ایک ڈگری کی خاطر اسے شوہر کو خفا کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، جبکہ والدہ تو تھیں ہی اس کے فیصلے سے بے نیاز، اس کے معاملوں سے لاتعلق، گویا ان کی خفگی ابھی تلک ختم نہ ہوئی تھی، فلاح بہت بری پھنسی تھی، اس کے آنسوؤں کو دیکھتے حیدر نے وقتی طور پہ اس کا موڈ بحال کرنے کو ایک اور جھوٹا وعدہ کر لیا تھا اس سے، اس وقت ساتھ چلنے پھر ایگزیم کے دنوں میں یہاں آنے اور پیپر دلانے کا وعدہ، اس کو کہاں معلوم تھا ان جھانسوں کا جبھی اس کی باتوں میں پھر آ گئی۔

''پکا وعدہ...... پھر آپ بھیج دیں گے ناں مجھے؟'' وہ یقین دہانی چاہتی تھی، حیدر ہنسنے لگا۔

''شیور یار! اگر تم بن نہ رہ پایا تو خود بھی آ جاؤں گا، ویسے بھی شادی کچھ پرانی ہو چکی ہو گی اپنی اور جاب بھی سیٹ ہو چکی ہو گی۔'' فلاح واقعی مطمئن ہو گئی تھی اور مگن بھی، اسلام آباد کا گھر نیا تھا اور بہت توجہ مانگتا تھا، وہ سیٹنگ اور سجاوٹ میں لگ گئی، شاپنگ کے لئے بھی ہر روز بازار جانا پڑ جاتا کہ نئے گھر میں ہر چیز کی تو ضرورت پڑتی ہے، ذرا سا سیٹ ہوئی تب ہی پڑھائی کا خیال آ سکا، مگر حیدر اسے پڑھنے نہیں دیتا تھا، گویا وہ پہلے سے طے کر چکا تھا اسے کرنا کیا ہے، ادھر وہ کتاب کو ہاتھ لگاتی ادھر حیدر پہ رومینس کا دورہ پڑ جاتا، یا پھر وہ اسے کسی ایسے کام میں الجھا دیتا جو اس کے خیال میں بے حد اہم اور ضروری ہوا کرتا تھا، فلاح اپنی ازلی سادگی میں اس کی اس مکارانہ روش کو سمجھ ہی نہیں سکی، البتہ پڑھائی کا حرج ہوتا پا کر اس نے اسٹڈی کا ٹائم بدل دیا اور دن میں پڑھنے لگی، ساتھ ساتھ ملکی حالات پہ بھی گہری نظر رکھتی اور کڑھتی رہتی، کہیں خودکش دھماکہ کہیں دھاندلی کہیں کرپشن کہیں زیادتی اور سب سے بڑھ کر کپتان کے ساتھ ہونے والی دھاندلی اور پھر انصاف کا نہ ملنا، وہ ہر روز حیدر سے لاکھوں مسائل ڈسکس کرنا چاہتی تھی مگر حیدر کے پاس ٹائم نہیں ہوتا تھا اور جب اس کے ایگزیم کا مرحلہ آیا انہی دنوں حیدر نے دانستہ خود کو بیمار ظاہر کیا اور آفس سے لیو لے کر گھر آ کے پڑ گیا اور اسے لاہور بھیجنے سے انکار کر ڈالا۔

''آپ میرے ساتھ لاہور چلیں حیدر! وہاں بہت لوگ ہیں نا دیکھ بھال کو۔'' وہ ایک بار پھر اپنی ازلی سادگی سے اس سے دھوکہ کھا رہی تھی اور سمجھانے کو مری جاتی تھی، مگر اصل بات سے آگاہ نہیں تھی کہ وہ یہ سب کر کیوں رہا ہے، وہ ایک بار پھر اسے جھانسا دینے لگا۔

''مجھے سب کی نہیں صرف تمہاری دیکھ بھال کی ضرورت ہے فلاح!'' اور ایسی عجیب اور فضول ضد پہ وہ جھنجھلا گئی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا حیدر! آپ جانتے ہیں میرے ایگزیم کتنے اہم ہیں، محض چند دن، بلکہ چند گھنٹے میں آپ سے دور رہوں گی جب تک سینٹر جانا ہو گا، پیپر کے لئے، باقی ٹائم آپ کا ہو گا، حتی کہ میں مزید تیاری بھی نہیں کروں گی ایگزیم کی۔'' وہ قائل کرنا چاہتی تھی، حیدر برہم ہونے لگا خفا ہونے لگا۔

''عجیب بات ہے تمہیں اپنی اسٹڈی اہم ہو گئی شوہر سے، وہ بھی بیمار شوہر سے۔'' وہ خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہا تھا، ایسے لوگ خواہ مخواہ ہی بات کو بگاڑا کرتے ہیں، فلاح دکھ اور غیر یقینی

سے ششدر ہونے لگی، اسے اکثر حیدر کی سمجھ نہیں آتی تھی، آیا وہ اصل میں ہے کیا۔

''آپ کو معمولی ٹمپریچر ہے حیدر! اور میری اتنے سالوں کی محنت داؤ پہ لگی ہوئی ہے، آنے والی زندگی میرے خواب سب داؤ پہ لگے ہیں، پھر میں آپ کو اگنور نہیں کر رہی مگر آپ......''

حیدر نے اس کی بات کا الٹا مطلب لیا، بات بڑھنی نہیں تھی، مگر حیدر نے دانستہ بڑھا لی، شادی کے بعد ان کا باقاعدہ اختلاف ہوا، بلکہ جھگڑا ہوا، اسی جھگڑے میں حیدر نے واشگاف انداز میں پہلی بار خود کو اس پہ آشکار کیا تھا۔

''بس اب یہ ڈرامہ یہاں ختم ہو جانا چاہیے فلاح، تمہیں جان لینا چاہیے کہ میں ہرگز بھی کپتان کا مداح نہیں ہوں، بلکہ سچ پوچھو تو نفرت کرتا ہوں اس بندے سے جسے میری بیوی مجھ سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہے، مجھے کبھی بھی اس شخص سے لگاؤ نہیں تھا، میں ہمیشہ سے نون لیگ کا حمایتی تھا، ہوں اور رہوں گا بھی، جھوٹ اس لئے بولا کہ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، فلاح اتنی ہی اچھی لگنے لگی تھیں تم مجھے، بتاؤ کوئی راستہ نہ تھا، پھر کیا کرتا میں؟'' اور فلاح، وہ صدمے سے رنج سے دکھ سے غیر یقینی سے ساکن ہو گئی تھی، بالکل منجمد، قوت گویائی تک سلب ہو گئی تھی، وہ کچھ نہیں بولی تھی، بالکل خاموش ہو گئی، یہاں تک کہ کئی گھنٹے گزرنے کے بعد حیدر کو بھی اس خاموشی سے تشویش گھیرنے لگی۔

''سوری فلاح! تمہیں بہت ہرٹ کر چکا ہوں میں، مگر کیا کرتا میں کہ......'' وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی، بس خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تو حیدر بے بس سا ہوا تھا۔

''ایسے تو مت کرو یار! لڑلو، جو مرضی کہہ لو مگر......''

''جو دھوکہ دیں، جو حقوق غصب کر لیں، جن پہ اعتماد نہ رہے، انہیں کچھ نہیں بدلا جاتا ہے حیدر! آپ مجھ سے پوچھتے تھے ناں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولتی رکی، آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے برسنے لگے تھے، حیدر ہونٹ بھینچے بیٹھا اسے دیکھتا تھا۔

''زندگی کے کسی مرحلے پہ مجھے انتخاب کرنا پڑا، آپ میں اور کپتان میں تو میں آپ کا انتخاب کروں۔'' اس نے ہچکی بھری اور آنسوؤں سے چھلکتی دکھ سے لبریز آنکھوں سے اسے دیکھا، حیدر ایکدم سہم کر رہ گیا، وہ کیا کہنے لگی تھی، اس کا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔

''آپ چاہتے تھے حیدر! میں آپ کا انتخاب کروں، میں نے حامی نہیں بھری تھی، مگر زندگی میں جب یہ مرحلہ آیا، انتخاب خود بخود ہو گیا، نا چاہتے ہوئے بھی، آپ کا انتخاب حیدر۔'' حیدر کا رکا ہوا اٹکا ہوا سانس بحال ہوا تھا، جبکہ وہ اسی بے بسی سے رو رہی تھی۔

''آپ ٹھیک سمجھتے تھے حیدر! عورت کے پیروں میں اپنی زنجیریں ڈال دو، کہاں جائے گی وہ، میں...... میں بھی آپ کی پہنائی زنجیریں نہیں توڑ سکتی، شاید کوئی بھی مشرقی عورت نہیں توڑ سکتی، اس لئے کہ وہ محبت بھروسے اور اولاد کے بغیر نہیں رہ سکتی، چاہے وہ انقلاب تبدیلی اور ترقی کے بغیر رہ لے، یا شاید میں بہت کمزور ہوں کم ہمت کہ اس تبدیلی کے لئے اتنی بڑی قربانی نہ دے سکی۔'' وہ روتی ہوئی اٹھی تھی اور بھاگ کر کمرے میں چلی گئی، حیدر خاموش بیٹھا تھا مگر چہرے پہ اطمینان تھا بہر حال وہ یہ بازی ہارا نہیں تھا۔

☆☆☆

پھر بہت سارا وقت بیت گیا، شاید ایک سال یا اس سے بھی زیادہ، وہ حیدر کے بیٹے کی

ماں بھی بن گئی، اس کا ہر شوق حیدر کی ضد پہ قربان ہوتا چلا گیا، وہ بھی جیسے سب بھول گئی تھی، دانستہ یا غیر دانستہ گھر، گھر داری، گھر والا اور بچہ، اسے اور کچھ یاد ہی نہ رہتا یا پھر اسے اور کچھ یاد کرنے کا موقع ہی نہ دیا جاتا، اتنی باحیثیت پوسٹ تھی حیدر کی، اس کے باوجود گھر کے چھوٹے بڑے سب کام فلاح کے ذمے تھے، وجہ ظاہری بات ہے مصروفیات کا انبار جمع کرتا تھا، یعنی وہ اس کا دماغ فارغ رہنے دینا ہی نہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ پائی، مگر پھر بھی ذرا سی فراغت میں اتفاقاً جس وقت اس نے ٹی وی آن کیا اس وقت کرنٹ افیرز پہ ٹاک ہو رہی تھی۔

کپتان، کپتان کی باتیں، انقلاب اور تبدیلی، کی خواہش، مثبت تبدیلی کی اسے لگا تن مردہ میں جان پڑی ہو، وہ جو اتنے عرصے سے زندہ نہیں تھی زندہ ہوئی ہو، عزم جوش خواہش پھر سے بیدار ہوا، اسے تھرک قحط کا ادراک ہوا، اسے غزہ کے مسلمانوں پہ ظلم نے خون رلا ڈالا۔

اسے حکومت کی بے حسی اور کرپشن کے ساتھ عوام کی بے بسی اور مسائل نے رگیدنا شروع کر دیا، وہ اگر باہر نہیں نکل سکتی، انقلاب برپا نہیں کر سکتی، وہ احساس اسے کیوں محروم ہو گئی، وہ دعا تو کر سکتی ہے، وہ امید تو رکھ سکتی ہے، اس نے امید کا جگنو مٹھی میں دبا لیا، اس نے دعاؤں کی مالا پرونی شروع کر دی، مگر دھچکا اس وقت لگا جب کپتان کے متعلق کچھ لوگوں کے ویوز جانے، اس کا دکھ سے صدمے سے برا حال ہوتا چلا گیا، لوگ کتنا غلط سوچتے تھے، یا پھر انہیں آگاہی نہیں تھی، اس نے محسوس کیا، آگاہی کی اشد ضرورت ہے، اس خیال نے اس کے اندر تحریک پیدا کی، فیس بک پہ اکاؤنٹ تو تھا ہی اس کا، مگر یوز بہت کم کرتی تھی، اس نے ایک گروپ کری ایٹ کیا

''بنے گا نیا پاکستان'' (انشاءاللہ)

اور کپتان کے حوالے سے بریفنگ دینے کے ساتھ وہ تلخ حقائق بھی منظر عام پہ لانے لگی، جن کا انکشاف کپتان اپنے خطاب میں کرتے تھے، اسے خوشی ہوئی تھی، اس کا گروپ پسند کیا جانے لگا، دیکھتے دیکھتے اس کے ممبرز چند دنوں میں ہزاروں سے تجاوز کر گئے، وہ خوش تھی مگن بھی رہنے لگی، اسے اچھی مصروفیات مل گئی تھیں، جو لوگ یہ سمجھتے تھے کپتان کے ساتھ چند ہزار لوگ ہیں، وہ متعصب لوگ تھے، وہ نہیں جانتے تھے کپتان کے ساتھ جتنے لوگ سڑکوں پہ نکلے ہیں، اس سے چار گناہ زیادہ لوگ گھروں میں بیٹھے تھے، مگر وہ کپتان کے حامی تھے، وہ کپتان کو اپری شیٹ کرتے تھے۔

☆☆☆

21 اگست 2014ء

فلاح حیدر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کچھ لوگ کہتے ہیں کپتان نے ''سماء'' چینل پہ پیسہ خرچ کیا ہے، ویسے ہی جیسے نون لیگ نے دیگر چینلز کو اپنے حق میں خرید لیا، ''سماء'' چینل پہ اگر یہ صورتحال ہوتی تو کپتان کے خلاف بولنے والوں کو آن ایئر نہ دکھایا جاتا، ایسے کہنے والوں کو صرف ایک جواب دیا جا سکتا ہے، کپتان کو ایسے کام زیبا نہیں، یہ ان کے شایان نہیں، ویسے بھی کچھ لوگوں کا کام صرف تنقید کرنا دوسروں کے بخیے ادھیڑنا ہوتا ہے، چاہے وہ ان کے دوست ہو یا دشمن، وہ کسی کو نہیں بخشتے۔

ویسے بھی تنقید اور تضحیک میں بنیادی فرق ہوتا ہے، تنقید ضمیر کو مخاطب کرتی ہے اور تضحیک غیرت نفس کو، تنقید کا مقصد جاننا اور تضحیک کا

مقصد محض بھڑاس نکالنا ہوتا ہے، تنقید جواب کا مطالبہ کرتی ہے اور تضحیک خاموشی و بردباری کا۔

ویسے بھی جب مقاصد عظیم ہوں تو ان معمولی باتوں معمولی رکاٹوں پہ دھیان نہیں دیا جاتا، مفاد ذاتی نہیں انفرادی نہیں اجتماعی ہوں تو پھر مصائب بھی بڑے اور کڑے ہوا کرتے ہیں، انقلاب قربانی مانگتے ہیں بلکہ قربانیاں، ہم اپنے بچپن سے سنتے آرہے ہیں انقلاب کب آئے گا، جبر کب ختم ہوگا؟ محمد بن قاسم یا ٹیپو سلطان و محمد علی جناح جیسا قائد کب میسر آئے گا، جو ڈوبتے پاکستان کو بچائے گا، اللہ کے حکم مدد اور مہربانی سے، اب جبکہ شب تاریک پہ سحر نو نمودار ہونا شروع ہوئی امید کا ستارہ چمکا اور پاکستان اک عزم کے ساتھ ابھرنے کو ہے، سوئی ہوئی قوم جاگ رہی ہے، نئی نسل جسے گانوں فلموں اور نیٹ سے فرصت نہیں تھی، پاکستان کے لئے ایک ہونے کچھ کرنے کی خواہش مند ہے تو کپتان پہ اس کا الزام یہ لگایا جانے لگا، یہ اسکرپٹ کس نے لکھا جس پہ ایکٹ کیا جارہا ہے؟ اس کے پیچھے کون سی طاقت ہے؟ جبکہ ہم کہتے ہیں۔

لگے رہو کپتان، ہم تمہارے ساتھ ہیں، کہ...... کوئی بھی راست کام اتنی آسانی سے اتنی سہولت سے نہیں ہو جایا کرتا، محنت جدوجہد، کوشش، عمل اور قربانی شرط ہے، لوڈ شیڈنگ کی کثرت کے باوجود بجلی کی بڑھتی قیمت، ملک کی سطح پر بڑھتا کرپشن کا سیلاب، روپے کی گرتی ہوئی قیمت، مہنگائی کا چنگاڑتا ہوا اژدھا، جس نے غریب بے دال روٹی بھی چھین لی، نہیں ایسا پاکستان نہیں چاہیے جبھی نیا پاکستان بنانا چاہتے ہیں، ہم سیاست دانوں کا احتساب چاہتے ہیں، کپتان کا حوصلہ جواں عزم بلند ہے اللہ رکھے، مگر کپتان کے شفاف کردار کو سیاہ کرتوتوں والے سیاست دان برداشت نہیں کر پا رہے، جبھی انہیں اپنے درمیان بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

23 اگست 2014ء

فلاح حیدر، ڈی ڈیکٹ ٹو کپتان

وفا کے رستے کا ہر مسافر
گواہی دے گا کہ تم کھڑے تھے
لہو میں بھیگے تمام موسم
گواہی دیں گے کہ تم کھڑے تھے

آج مجھے بہت ہنسی آرہی ہے، نون لیگ کے اہم رکن شہباز شریف کے بیٹے حمزہ شریف کی ریلیوں پہ ہر بات میں کپتان کو کاپی کیا اور تنقید بھی انہی پہ، محترم کا کہنا تھا، عمران صاحب اپنے جلسوں میں گانے بجواتے اور عورتوں کو نچواتے ہیں، عین اس لمحے ان کے متوالوں نے بھی ٹیپ آن کردیا، گانا بجا اور ان کی خواتین نے بھی بھنگڑا ڈالنا شروع کردیا، اسی پہ طرہ یہ کہ حمزہ صاحب بھی ساتھ ساتھ لہک رہے تھے گنگنا رہے تھے، بارش میں بھیگ کر ناچتی ہوئی خواتین و مرد حضرات، ہرگز بھی قابل تحسین منظر نہیں تھا ایسا کھلا قول و فعل کا تضاد، یا پھر یہ لوگ اتنا بوکھلا گئے ہیں کہ کسی بھی عمل پہ حکمت عملی کا بھی موقع میسر نہیں آرہا انہیں، اس پہ حمزہ شریف کا فرمان شاہی کہ خان صاحب تو مجھے ایک ضدی بچہ لگا ہے، جو وزیراعظم کے استعفیٰ کی ضد لگا کر بیٹھ گیا ہے، ان کے اس فرمان شاہی پہ مجھے اپنا نصاب میں پڑھی تاریخ یاد آگئی، کچھ ایسی ہی باتیں قائداعظم کو بھی سننے کو ملی تھیں، آپ بھی دیکھئے، کہ تب حالات اور ایسی بات کے اسباب کیا تھے، کپتان کے ساتھ الیکشن میں تاریخی دھاندلی کی گئی اور چودہ ماہ انہیں الیکشن کمیشن اور عدالتوں میں خوار تو کیا گیا مگر شنوائی نہ ہوئی، جبکہ کپتان آگاہ کرتے رہے

تھے اگر انہیں انصاف نہ ملا تو سڑکوں پہ آئیں گے، مگر توجہ پھر بھی نہ دی گئی، اب جبکہ افضل خان جو الیکشن کمیشن کے اہم عہدے پر فائز رہ چکے ان سے بھی دھاندلی ثابت ہو چکی مگر اکھڑ ضدی اور طاقت کے نشے میں مبتلا حکمران ہر جگہ اثر و رسوخ استعمال کرکے اس بات سے مسلسل منکر ہیں، تب قیام پاکستان سے قبل بھی انتخابات کی رپورٹ کی درہم برہم کر دیا گیا تھا، تاریخ میں اس واقعہ کو ''نہرو رپورٹ اور مسلمان'' کے نام سے یاد رکھا گیا ہے، نہرو رپورٹ کی سفارشات کچھ یوں تھیں۔

جداگانہ انتخابات، نامنظور

پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت، نامنظور

سندھ کی ممبئی سے علیحدگی، ہاں ناں اگر مگر

مرکز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی، نامنظور

وفاقی حکومت، نامنظور

ان سفارشات کا ردعمل مسلمانوں پر بہت شدید ہوا، ان کا مطلب یہ تھا کہ راج انگریز کا ہو گا، حکومت کی باگ دوڑ ہندو مہاسبھا کے ہاتھ میں ہو گی، دوسری جانب ہندو لیڈروں نے دھڑوں کی پوری قوت سے ''نہرو رپورٹ'' کے حق میں پروپیگنڈا شروع کر دیا، گاندھی اور جواہر لال نہرو اس میں پیش پیش تھے، اس پروپیگنڈا کی توپوں کا رخ بیرونی دنیا کی طرف تھا، نہایت بے تکلفی بلکہ ڈھٹائی سے کہا جا رہا تھا، کہ نہرو رپورٹ کا تجویز کیا ہوا دستور ہندوستان کی ساری قوموں کا متفقہ مطالبہ ہے، جبکہ یہ بات حقیقت سے دور تھی، مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم محمد علی جناحؒ دونوں نہرو رپورٹ کی اشاعت کے وقت ملک سے باہر تھے، واپس آئے تو انہوں نے جلد ہی محسوس کرلیا، کہ ہندو مسلم مفاہمت کا جو فارمولا دہلی تجاویز کی صورت میں نہایت جانفشانی سے مرتب کیا گیا تھا، ملیامیٹ ہو چکا ہے، لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی جلد بازی سے کام نہ لیا، 8 دسمبر 1928ء کے آخری دنوں میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس کلکتے میں نہرو رپورٹ پر آخری فیصلے کے لئے بلایا گیا، اس کنونشن میں صرف دو مسلم پارٹیوں نے اپنے نمائندے بھیجے، مولانا محمد علی جوہر اور محمد علی جناح بالترتیب خلافت اور مسلم لیگ کے وفدوں کی قیادت کر رہے تھے، دونوں نے باری باری نہرو رپورٹ میں چند متعدل ترمیمی پیش کیں، تاکہ ان کو تجاویز دہلی سے ہم آہنگ کر دیا جائے، اس موقع پر قائد کی تقریر ان کی زندگی کی بہترین تقریروں میں شمار ہوتی ہے، انہوں نے نہایت نپے تلے اور جذبات میں ڈوبے ہوتے الفاظ میں ملک کے مستقبل کا واسطہ دیتے ہوئے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت پر زور دیا، لیکن کنونشن کا سارا ماحول دوغلا تھا، ہندو مہاسبھا اس پر چھائی ہوتی تھی، سکھ اس کی حمایت پر تھے، گاندھی گم صم ہو کر بیٹھے تھے، قائد کو کہا گیا، کہ جناح ایک بگڑا ہوا بچہ ہے، آخر یہ کس کی نمائندگی کر رہا ہے؟

کپتان کے مطالبے بھی غلط نہیں، حکومت بے حسی ہو چکی ہے، سب بڑی جماعتیں حکومت کے ساتھ ہیں کپتان کے پیچھے بھی طاقت ہے، وہی طاقت جو قائد کے پیچھے تھی، اللہ کی طاقت، جبھی وہ بھی قائد کے انداز میں حق پہ سچ پہ ڈٹے ہوئے ہیں، کپتان بھی قائد کے الفاظ دہرا چکے ہیں جو قائد نے ایک موقع پہ کہا تھا۔

اب ہمارے اور ان کے (ہندوؤں کے) راستے جدا جدا ہیں اسی انداز میں کپتان کہتے ہیں، ان ہمارے اور ان کے (نون لیگوں کے)

راستے جدا جدا ہیں، کپتان کا موقف ہے، ہم یہاں صرف دھاندلی کی وجہ سے نہیں آئے، دھاندلی تو ہمیں یہاں لانے کا اک بہانہ تھی، ہم یہاں ایک قوم بننے آتے ہیں ہم بغاوت کرتے ہیں اہم نہیں مانتے اس نظام کو، ہم عدلیہ کو آزاد کریں گے انصاف کا بول بالا کریں گے، انشاء اللہ۔

مجھے آپ سے یہ بھی کہنا ہے کہ کپتان نے سول نافرمانی کا آرڈر کیا تو ان پہ پھبتیاں کسی جا رہی ہیں، جبکہ یہاں مایوس کن حالات کے باعث پاکستانی عوام غریب عوام مایوسی کی انتہا پہ جا کر خودکشیاں کر رہے ہیں، اتنے وسائل نہیں جتنے مسائل ہیں، خودکشی نہ کی جائے تو کیا ہو؟ مگر حکمرانوں کو پرواہ نہیں، جائز مطالبات تسلیم نہ ہونے پہ حقوق پورے نہ کیے جانے پہ کپتان نے آئین کی خلاف ورزی کیے بغیر سول نافرمانی کا حکم جاری کیا، یعنی بینکوں سے اپنا روپیہ نکلوانے بجلی کے بل نہ جمع کرانے کا حکم، یہ جائز حکم ہے، قائداعظم نے بھی سول نافرمانی کا حکم دیا تھا، کپتان کو اور خاص کر طاہر القادری صاحب کو خواتین کے ساتھ دھرنا دینے پہ تنقید و تضحیک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، تو میں واضح کر دوں، قائداعظم نے بھی خواتین کو اپنے ساتھ تحریک میں شامل ہونے کا فرمان جاری کیا تھا، مگر اپنی تہذیب میں رہتے ہوئے، ایک بار پھر یہی کہوں گی، تنقید و تضحیک میں فرق ہوتا ہے تضحیک محض بھڑاس نکالنا ہے، جو نکالی جا رہی ہے، جبکہ کپتان کے متوالے کپتان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

تہمتیں تو لگتی ہیں
روشنی کی خواہش میں
گھر سے باہر آنے کی
کچھ سزا تو ملتی ہے
لوگ لوگ ہوتے ہیں
ان کو کیا خبر جاناں
آپ کے ارادوں کی
خوبصورت آنکھوں میں
بسنے والے خوابوں کے
رنگ کیسے ہوتے ہیں
دل کی گود آنگن میں
پلنے والی باتوں کے
زخم کیسے ہوتے ہیں
کتنے گہرے ہوتے ہیں
کب یہ سوچ سکتے ہیں
ایسی بے گناہ آنکھیں
گھر کے کونوں کھدروں میں
چھپ کے کتنا روتی ہیں
پھر بھی یہ کہانی سے
اپنی کج بیانی سے
اس قدر روانی سے
داستاں سنانے اور یقین کی آنکھیں
سچ کے غم زدہ دل سے لگ کے رونے لگتی ہیں
تہمتیں تو لگتی ہیں
روشنی کی خواہش میں
تہمتوں کے لگنے سے
دل سے دوست کو جاناں
اب نڈھال کیا کرنا
تہمتوں سے کیا ڈرنا

☆☆☆

دل صاف ہو نیت نیک
جو چلی ہے اب تحریک تو ہو گا ٹھیک یہ پیارا پاکستان

اسلام آباد گرجتے برستے بادلوں کی زد پہ تھا اور کثرت سے بھیگ رہا تھا، کال بیل کی آواز پہ فلاح نے ٹی وی آف کیا اور اپنی آئی لاگ آؤٹ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی، اس سے پہلے کہ کمرے سے نکلتی حیدر بگڑتا ہوا خود اندر آ گیا تھا، رات کے وقت اچھی خاصی خنکی بڑھ جاتی تھی، اس کے وجیہہ چہرے کے حساس حصوں میں بھی سرخی اتر رہی تھی۔

''میرے کپڑے نکال دو۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تو فلاح کی مسکراہٹ جو اسے روبرو پا کر مچل مچل جا رہی تھی ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

''آ گئے آپ سرکاری نوکری کا بھگتان بھگت کر؟ ریلی میں حاضری نہ لگوانے تو اتنا اچھا عہدہ چھین جاتا آپ سے...... چچ چچ۔'' وہ کِل کِل کر کے ہنستی جا رہی تھی، حیدر نے چونک کر بلکہ اس آگاہی پہ کھسیا کر اسے دیکھا، بلکہ گھورا، مگر وہ خائف نہیں ہوئی۔

''حمزہ شریف کا ذاتی خیال تھا کہ کپتان کے جلسے میں زیادہ تر خواتین ان کی پرسنالٹی سے متاثر ہو کر شامل ہوتی ہیں، انہیں دیکھنے کی خواہش میں، مگر یہ محترم تو ہرگز بھی کپتان جیسے خوبرو نہ تھے، پھر انہیں اتنا کاپی کیوں کر رہے تھے؟'' اسے پتا نہیں کیا سوجھی تھی کہ شرارت سے باز نہیں آ رہی تھی، حیدر کا چہرہ بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔

''تم بکواس بند کرو گی فلاح! اور کپڑے دو گی مجھے؟'' اس نے پھنکارتے ہوئے ڈانٹا۔

''اتنا برا کیوں لگ رہا ہے؟ چوری پکڑی گئی آپ کی اس لیے؟'' وہ پھر مسکرائی اگر جو طیش میں ابلتا ہوا حیدر اس کے چہرے پہ الٹے ہاتھوں کا تھپڑ رسید نہ کر دیتا، فلاح تھرا کر پیچھے کی جانب چت ہوئی تھی اور جیسے سناٹوں کی زد پہ آ گئی، متحیر شاکڈ اور سنسناتی ہوئی سماعتوں کے ساتھ، حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں رہی، اسے قطعی فوری طور پہ سمجھ نہ آ سکی اس کے ساتھ یہ ہوا کیا ہے جبکہ حیدر کا ابلتا ہوا طیش جنون کا رخ اختیار کر رہا تھا۔

''بدبخت بے شرم عورت! مجھے اندازہ ہوتا تم میری زندگی یوں جہنم بنا دو گی تو کبھی تم سے شادی نہ کرتا، بلکہ غلط تھا میں کہ تمہارے کرتوت جانتے ہوئے بھی شادی کر لی تم سے اور ایک مسلسل عذاب مسلط کر لیا خود پہ، ہر وقت مجھے اذیت دینے کو سوا کیا کیا ہے تم نے؟ تمہارا تو کردار تو مشکوک ہے، ایک غیر مرد کی خاطر تم، اپنے شوہر سے ہر وقت لڑتی رہتی ہو، شیم آن یو۔''

وہ حقارت سے تنفر سے کہتا پلٹ کر چلا گیا، فلاح کی تمام حسیات ہنوز ساکت تھیں، اسے اپنا وجود ہواؤں میں معلق محسوس ہو رہا تھا، ہاں البتہ دل غم سے پگھلتا تھا اور آنکھوں کے رستے درد بہاتا جا رہا تھا، وہ وہیں گری پڑی رہی، باہر بادل گرجتے تھے اور برستے تھے، اندر اس کی ہستی تاراج ہوئی جا رہی تھی، ایک بار حیدر نے پہلے بھی اس کے خوابوں کے تاج محل کو توڑا تھا، وہ برداشت کر گئی، پھر حیدر نے اس کا وجود محصور کر لیا، وہ کچھ نہیں بولی، اب حیدر نے اس کے کردار کو اس کی روح کو نشانہ بنایا تھا، اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی، خود کو سنبھال کر وہ اٹھی تو اک فیصلہ کر چکی تھی، اسے اب یہاں نہیں رہنا تھا۔

☆☆☆

پوچھنے والے تجھے کیسے بتائیں آخر......؟
دکھ عبارت تو نہیں جو تجھے لکھ کر دے دیں
یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تم کو
زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دیں
آئینہ بھی نہیں کہ دکھائیں تجھ کو
یہ کوئی راز نہیں جس کو چھپائیں تو وہ راز

کبھی چہرے کبھی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
یوں کہ جیسے آنچل کو سنبھالے کوئی
اور تیز ہوا جب چلتی ہے تو شانوں سے ڈھلک
جاتا ہے
اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں کیا دکھ ہے

وہ لاہور آ گئی تھی حیدر کو بنا بتائے، یہاں آ کر بھی اس نے اپنے اختلاف کے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور خود کو نارمل شو کرنے کے جتن کرتی رہی، حیدر کے نہ آنے کا بہانہ اس نے مصروفیات کر دی تھی، مگر اندر سے وہ ٹوٹتی جا رہی تھی، بات کتنی بنی تھی، کتنی نبھی تھی اس سے قطع نظر وہ خود اندر سے گھل رہی تھی، بکھر رہی تھی، ایک روگ تھا جو لگ گیا تھا، بات کردار پہ آئی تھی، عزت نفس پہ آئی تھی اور سب کچھ داؤ پہ جا لگا تھا، وقت حالات گواہ تھے، اس نے حیدر کی خاطر سب قربان کر دیا تھا، ان قربانیوں کا یہ صلہ؟ وہ حیران تھی، حیدر جتنا بھی سازشی مطلبی یا پھر ڈپلومیٹک سہی، مگر وہ اس حد تک کبھی نہیں گیا تھا، بلکہ ان کے بیچ کبھی ایسا جھگڑا ہوا ہی نہ تھا، وہ اتنا شدت پسند یا اتنا ہائپر لی بی ہیو کرے گا اسے ذرا بھی گمان ہوتا تو کبھی اس موضوع کو ہی نہ چھیڑتی، اضطراب ہر لحہ اس کا دل رگیدتا تھا، سب کچھ ختم ہونے جا رہا تھا، فکر مندی اسے وحشت میں مبتلا رکھنے لگی تھی، لیکن دھیرے دھیرے سہی وہ خود کو سنبھال رہی تھی، اسے بھرم رکھنے کا سلیقہ آ رہا تھا، والدہ یا بابا جان اس سے حیدر کے حوالے سے سوال کرتے وہ بڑے اعتماد سے مطمئن کر دیتی۔

"اسلام آباد کے حالات ٹھیک نہیں ہیں ناں، کنٹینر لگا کر سارے راستے بلاک کیے ہوئے ہیں حکومت نے، وہ تو میں بہت اداس ہو گئی تھی آپ کے بغیر اتنے عرصے ملی نہ تھی، حیدر نے مجھے بھیج دیا کہ کچھ دن رہ لوں۔" اس نے سوچ لیا تھا، وہ آہستہ آہستہ ہی اپنے فیصلے کی خبر دے گی گھر والوں کو، ابھی بات نبھ رہی تھی، ٹھیک تھا اس نے جو کچھ قربانی دینی تھی دے دی تھی، جو دینی چاہیے تھی اس میں بخل نہیں کیا تھا، یہاں وہ جھک نہیں سکتی تھی، اگر حیدر اس کو اس پہ اس کے کردار پہ بھروسہ نہیں تھا تو پھر ساتھ رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں بنتا تھا، گھر اور دل بھروسے و محبت سے ہی بستے ہیں، اگر بھروسہ اور محبت نہیں تھا، تو کچھ نہیں تھا، ہر کوشش بے کار تھی۔

☆☆☆

27 اگست 2014ء

فلاخ حیدر

ہم دیکھیں گے لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوح ازل میں لکھا ہے ہم دیکھیں گے
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
جب اہل ظلم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب اہل خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہل وفا مرد حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی کہوں اور تم بھی کہو

اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اگست میں مارچ، بہت زیادہ تنقید کا سامنا، عوامی سطح پہ بھی، اخبارات و چینلز پہ بھی، اگر سراہنے والے، تسلیم کرنے والے لوگ ہیں تو اختلاف کرنے والے بھی بہت زیادہ تنقید کرنے والے بھی، میں یہاں ایک بات کی جانب توجہ ضرور دلانا چاہوں گی، کہ...... متوجہ کرنے اور متاثر کرنے میں بہت واضح فرق ہوتا ہے، متوجہ کسی بھی مضحکہ خیز یا غیر حقیقی حرکت پہ بھی کیا جا سکتا ہے، جبکہ متاثر کرنے کو کوئی کارنامہ انجام دینا انقلاب یا تبدیلی کا برپا کرنا کوئی مثبت ردعمل سامنے لانے کا نام ہے، متوجہ ہونے کی کیفیت وقتی جبکہ متاثر ہونے کی کیفیت بہر حال مستقل ہوتی ہے، اس کی ایک مثال سانحہ ماڈل ٹاؤن تھا، جہاں متوجہ ہی کیا گیا ظلم سے، طاقت سے مظاہرے سے، چودہ لوگ جاں بحق ہوئے اور نوے زخمی کر ڈالے، بات ختم جھگڑا ختم، تاریخ میں یہ یاداشت ہمیشہ تنقید ملامت اور تاسف کا حصہ بنتی رہے گی نون لیگ کے لئے، اگست میں مارچ انقلابی دھرنا، یہ متاثر کن چیز ہے، جس سے بہت لوگ انسپائر ہوئے اور اس انقلاب کا حصہ بن گئے، تاریخ اس باب کو بھی یاد رکھے گی اور اس جہاد کے لئے تحسین پیش کی جاتی رہے گی، اگر ہم سفاکی پہ غور کریں اس حوالے سے، سانحہ ماڈل ٹاؤن کے اس واقعہ میں حکوت کی سفاکی کے حوالے سے جس کے متعلق انکشاف ہو چکا تو ایسی سفاک مثال ہمیں ماضی میں بھی ملے گی، جب قیام پاکستان سے قبل امرتسر میں بھی مسلمان سپاہیوں نے بھی آزادی کا علم بلند کیا تھا تو وہاں کے ڈپٹی کمشنر فریڈرک کوپر نے سکھ دستوں کی مدد سے ایسے تمام مسلمان سپاہیوں کو قتل کر دیا تھا، جن پہ آزادی حاصل کرنے کا شک تھا، جو ظلم و ستم ان نہتے مسلمانوں پہ ہوا اس کو خود فریڈرک کوپر بیان کرتا ہے۔

"اسے اتفاق کہیے یا خوش قسمتی سمجھیں کہ جب یہ مسلمان قیدی جمع ہو گئے تو یہ معلوم وا کہ یکم اگست کو بقر عید کا تہوار ہے، میں نے مسلمان گھڑ سوار فوجیوں کو امرتسر میں جا کر عید منانے کے لئے کہا اور میں اکیلا عیسائی اپنے وفادار سکھوں کی مدد سے عید کے دن ایک نئی قربانی کے لئے تیار ہو گیا۔"

کوپر کے بیان کے مطابق ان قیدیوں کی تعداد پانچ سو تھی، جنہیں بقر عید کے دن نہایت بے دردی سے زبح کیا گیا، سانحہ ماڈل ٹاؤن جس میں وزیر اعلیٰ شہباز شریف اور ان کے بیٹے کے ایک آرڈر پہ ایسا ہی سفاکانہ قتل عام سامنے آیا اور چودہ لاشوں کے ساتھ نوے زخمی کر دیئے گئے، وہ نہتے لوگ جو اپنے لیڈر کو ائیر پورٹ پہ ریسو کرنے گئے تھے اور حکومت کے حکم کی خلاف ورزی پہ کی تھی کہ اپنے لیڈر کو لئے بنا واپس جانے پہ آمادہ نہ تھے، میرا سوال آپ سے صرف اتنا ہے کہ پاکستانیو، خاص کر نون لیگیو......! کیا آپ کو فریڈرک کوپر اور شہباز شریف و حمزہ شریف میں کوئی فرق نظر آتا ہے؟ کیا آپ نئے پاکستان کے حامی اس لئے نہیں بننا چاہتے کہ آپ ایک مراعات یافتہ طبقہ ہو، آپ کو حکومت کی بداعتالیوں بے انصافیوں اور لوٹ مار سے مسئلہ نہیں ہے؟

آپ کا نظریہ جیو اور جینے دو ہے، آپ کا موقف اپنے لئے جینا ہے تو ٹھیک ہے، ضرور جئیں اپنے لئے کہ یہ آپ کا بنیادی حق ہے، مگر اشرف المخلوقات کا خطاب واپس کر دیں، انسانیت کے درجے سے ہٹ جائیں۔

ماؤس پہ حرکت کرتا ہوا حیدر کا ہاتھ تھم گیا، اس کی نظریں آخری دو فقروں پہ ساکن ٹھہری رہ گئی تھیں، وہ گم صم تھا، کتنی دیر گم صم رہا، معاً کسی خیال چونکتا ہوا وہ اس اسٹیٹ کے آغاز پہ جا پہنچا تھا، فلاح حیدر کے نام نے اس کی خاموشی سنجیدگی اور اضطراب کو اور بڑھا دیا تھا، اس کا وجود کتنی دیر ایک ہی زاویے پہ ساکن رہا تھا، پھر وہ اٹھ کر بستر پہ گیا تو اضملال اضطراب کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

پاگل آنکھوں والی لڑکی
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو، پچھتاؤ گی
سوچ کا سارا اجلا کندن
ضبط کی راکھ میں گھل جائے گا
کچے پکے رشتوں کی خوشبو کا ریشم
کھل جائے گا
تم کیا جانو خواب سفر کی دھوپ کے تیشے
خواب ادھوری رات کا دوزخ
خواب خیالوں کا پچھتاوا
خوابوں کی منزل رسوائی
خوابوں کا حاصل تنہائی
تم کیا جانو
مہنگے خواب خریدنا ہوں تو
آنکھیں بیچنا پڑتی ہیں یا......
رشتے بھولنا پڑتے ہیں
اندیشوں کی ریت نہ پھانکو
پیاس کی اوٹ سراب نہ دیکھو
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو
تھک جاؤ گی

بارش موسلا دھار برس رہی تھی، وہ کھڑکی میں کھڑی تھی، گم صم مضمحل اور کھوئی ہوئی، ابھی کچھ دیر قبل روتے ہوئے عبدالسمیع کو عیشہ لے کر گئی تھی، وہ باپ کو یاد کرتا تھا، اس کے پاس جانے کو بضد تھا، اب تو کتنی بار والدہ نے بھی تشویش ظاہر کر دی تھی، کہ حیدر کیوں نہیں آیا؟ اس کی کال بھی کبھی نہ آئی۔

بلکہ یہ حقیقت تھی کہ وہ مشکوک ہو رہی تھیں، بابا الگ الجھے ہوئے تھے، ایسے میں فلاح کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ عیشہ کو سب صورت حال بتا دیتی۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے بجو! ان معاملات پہ برہم ہو کر گھر نہیں اجاڑے جاتے۔"

"میں نے اس معاملے پہ گھر نہیں اجاڑا عیشہ، میں نے ہر جبر کاٹ لیا، مگر الزام نہیں سہہ سکتی، وہ بھی کپتان جیسے بندے کے حوالے سے، جنہیں میں نے ہمیشہ احترام سے سوچا، میں تو خود سے شرمندہ ہوں، کاش حیدر جیسے کم ظرف شخص کے سامنے اس حوالے سے عیاں نہ ہوئی ہوتی میں کہ اس انداز میں میرے جذبوں کو مجروع ہونا پڑتا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، عیشہ کچھ نہیں بول سکی، جبھی وہاں سے اٹھ گئی تھی، فلاح نے آنکھیں موند لیں، ہونٹ بھینچ لئے، اسے یاد آیا، حیدر جیسا تھا اس کے معاملے میں کتنا حساس تھا، اس کی اداسی کو محسوس کرتا تھا، تو بہلانے کے جتن کیا کرتا اور تب تک ہمت نہ ہارتا، جب تک اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نہیں سجا دیتا، وہ شخص اتنا بے حس کیسے ہو گیا تھا، وہ ساری محبتوں سے دستبردار کیسے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بس یونہی چپ ہو جاتا ہوں
کوئی ایسا گہرا دکھ بھی نہیں
جسے دکھ سمجھوں اور تم سے کہوں
بس یونہی چپ ہو جاتا ہوں
کسی اجڑے گھر کی مٹی پر

جب شام ڈھلے
کسی چیل کو سر نہیوڑائے پاتا ہوں
کھو جاتا ہوں
تم پوچھتے ہو کوئی دکھ تو نہیں
میں ایک نظر تمہیں دیکھتا ہوں
اور کہتا ہوں
کوئی ایسا گہرا دکھ بھی نہیں
جسے دکھ سمجھوں
اور تم سے کہوں
جب دیکھتا ہوں ایسا منظر
میں ماضی میں کھو جاتا ہوں
بس یونہی چپ ہو جاتا ہوں

گھر خالی کمرہ خالی، دل بھی خالی تھا، وہ تھی تو کیسے بھرا بھرا گھر لگتا ہوتا تھا، عبدالسمیع کی کلکاریاں گونجتی تھیں تو دل آباد ہو جایا کرتا تھا، وہ باپ بنا تھا تو صحیح معنوں میں محبت کو سمجھا تھا، ورنہ فلاح سے تو جانے محبت اسے تھی بھی یا نہیں، وہ اپنا موازنہ کرنا چاہتا تو اندر ندامت پھیل جاتی، اس نے جانا اسے فلاح کے جذبات سے کھیلنے کا حق نہیں تھا، اسے اب ہی تو معلوم ہوا تھا، اس نے فلاح کے ساتھ دھوکہ کیا تھا اور دھوکہ دینے والے کے ساتھ کتنی نفرت محسوس ہوتی ہے، یہ بھی اس نے اب جانا تھا، جب اس کو دھوکہ دیا گیا، اسے بھی نون لیگ سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی، یہ لوگ کرپٹ تھے، دھوکے باز تھے، یہ بات وہ جانتا تھا، ہمیشہ سے جانتا تھا، مگر کبھی اس سسٹم سے نفرت محسوس نہیں کی، اب...... اب جبکہ پروموشن مزید پروموشن کا جھانسہ اسے دیا جاتا رہا، اس کا باپ قومی اسمبلی کا ممبر تھا، یہ سفارش کرتا رہتا تھا، مگر عین وقت پہ اس جگہ یہ عہدہ کسی اور کو دے دیا گیا، وجہ وہی سسٹم کی کرپشن تھی، یعنی اس سے زیادہ قریبی کوئی اس عہدے کا طلبگار ہو گیا تھا، غصہ ختم بھی نہ ہوا تھا، سبکی و خفت بھی ایسی تھی کہ اس بات کو فلاح پہ آشکار نہیں کر سکتا تھا، کہ اگلے دن سونے پہ سہاگہ ہوا تھا، تمام سرکاری ملازموں کو حکومتی آرڈر مل گیا کہ شہباز شریف کی ریلی میں شریک ہونا ہے، چونکہ خواتین کی بھی ضرورت تھی، کارکن تو شامل ہو گئیں، جو پیسے سے خریدی جا سکتی تھیں، وہ بھی با خوشی آ گئیں، اصل مسئلہ اس کے بے تکلف کولیگ کی وجہ سے کھڑا ہوا، جس نے مذاق میں سہی مگر اسے بھی اپنی بہنوں کو ساتھ لانے کو کہہ دیا تھا، اس کے برہم ہونے پہ وہ بھی لحاظ رکھنے کا قائل نہ ہوا اور اس کی شادی کے حوالے سے طعنہ دیتے ہوئے اسے وہ وقت یاد کرانے لگا جب صوحا وغیرہ نے نہ صرف ڈانس کیا تھا بلکہ مووی بھی بنوائی تھی، اب مووی کس کس سہیلی تک گئی یا کس کس نے دیکھی اس کا اعداد و شمار تھوڑی انہوں نے رکھا تھا، بات زبانی کلامی تو تکار سے مار کٹائی تک بھی پہنچی جو دوسرے لوگوں کی مداخلت پہ بیچ بچاؤ کرا دیا گیا تھا، موڈ تو سوا نیزے پہ تھا ہی اس پہ فلاح کی معمولی سی بات بھی اسے آتش فشاں لاوے کی مانند ابال گئی تھی، جبھی پھٹ پڑا تھا وہ، جب تلک حواس بحال ہوئے کچھ غصہ اترا، نقصان ہو چکا تھا، فلاح جا چکی تھی، اسے احساس ہوا اس نے کس حد تک سطحی گفتگو کی تھی اور کتنے گھٹیا انداز میں الزام تراشی پہ اترا تھا، تاسف و ملال اسے فلاح سے رابطے کی جرأت نہ دیتا تھا اور بڑھتا ہوا وقت اس خلیج کو بڑھاتا جا رہا تھا، طیش میں دکھ میں اس نے جاب سے ریزائن کر دیا تھا، اب سارا دن گھر پہ پڑا رہتا تھا انٹرنیٹ سے حالات جاننے کی کوشش کرتا، اسے اب فلاح کی ایک ایک بات موقف یاد آتا تھا، وہ جیو کے خلاف تھی، اسے جیو نیوز نہیں دیکھنے دیتی تھی، وہ

ضد پہ اتر آتا۔

"سارا دن تمہاری مرضی کا چینل، رات کو میری پسند کا چلے گا۔" وہ صاف کہہ دیتا، وہ بھی شدت پسند تھا متعصب تھا، جبھی حقیقت کا سامنا کرنے سے خائف رہا کرتا، اب اس نے جیو کے ساتھ دیگر چینلو بھی دیکھے تھے، موازنہ کیا تھا، حقیقت سامنے آتی گئی تھی جیسے جیسے، ویسے ویسے وہ گم صم بالکل گم صم ہوتا گیا تھا، اب نہ ماننا جرم تھا، اخلاقی جرم اور تسلیم کرنا ایگو کی شکست تھی، وہ پتا نہیں کیا بچا پاتا، اخلاقیات، یا پھر انا۔

☆☆☆

دربار وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھیں گے تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل پہ ہی ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے مارو لب کھولو چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان کے اٹھے گا کچھ دور تو نالے جائیں گے

میں نے آج اپنی پارٹی چھوڑ دی، حق اور باطل میں سے حق کو چن لیا، یہ انتخاب بہت مشکل ہوتا اگر مجھے انا سے نجات حاصل نہ ہوتی، اگر مجھے محبت نہ ہوتی، غلطی گناہ نہیں بنا سکتی اگر اس کی اصلاح کرلی جائے، میں نے غلطی سے سیکھا اور خود کو راہ راست پہ لے آیا، میں جو کہتا تھا کپتان غلط کر رہے ہیں، کپتان انتشار پھیلا رہے ہیں، آج میں ہی یہ کہنے پہ مجبور ہوا ہوں کہ کپتان درست راہ پہ ہیں، اگر سمجھا جاتے تو یہ بھی جہاد ہے، قوم کو اک درست مرکز پہ اکٹھا کرنا، انہیں بیدار کرنا، انہیں پرعزم کرنا، جہاد کا ایک طریقہ ہی تو نہیں، جہاد قلم سے بھی ہوتا ہے، جہاد عزم سے بھی ہوسکتا ہے، جو کپتان کررہے ہیں، جہاد یہ بھی ہوسکتا ہے جس کا آغاز میں نے کیا، کل جس طرح وزیراعظم نواز شریف نے چیف آف آرمی سٹاف کو ثالث بننے کی گزارش کی، انہی کی گزارش کا احترام کرتے انہوں نے کپتان اور طاہر القادری صاحب سے مذاکرات کیے، یہ خبر میڈیا پہ نشر ہوتی رہی۔

مگر اگلے دن جس طرح وزیراعظم نے بیان بدلا جس طرح کپتان اور طاہر القادری صاحب پہ الزام دھر دیا، کہ انہوں نے ہی جنرل صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور خود اس ساری بات سے مکر گئے، اس نے قوم کو میڈیا کو خود جنرل صاحب کو بھی انگشت بدنداں کر ڈالا۔

وزیراعظم صاحب کو شاید اپنی اخلاقی سطح کی پرواہ نہیں رہی، اس ریشو کے بعد ان کا مورال کس طرح ڈاؤن ہوا کرسی کو بچانے کی فکر میں انہیں اس کا بھی احساس نہیں رہا، یہاں تک کہ پاک فوج کی طرف سے بیان جاری ہوا اور طاہر القادری صاحب اور کپتان عالی شان کو اس الزام سے بری قرار دیتے ہوئے اسٹیٹ منٹ دیا گیا کہ وزیراعظم صاحب نے خود مصالحت کے لئے گزارش کی تھی، میڈیا پہ قوم پہ وزیراعظم صاحب کا کیا تاثر پڑا مجھے اس سے لینا دینا نہیں میں تو

بس اتنا جانتا ہوں، ہوس کی یہ جنگ زیادہ عرصہ تک چلنے والی نہیں، اس کے تمام شہسوار گرنے والے ہیں اور ہمیں ایک نئے پاکستان کی نوید ملنے والی ہے انشاءاللہ۔

☆☆☆

28 اگست 2014ء

حیدر کرار، اسلام آباد

آفیشل پیج، کپتان عالی شان

فلاح نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ اسٹیٹ اور پھر اینڈ پہ ایڈمن کا نام پڑھا تھا، مگر یقین پھر بھی نہیں آتا تھا، اس پیج پہ اسے انوائیٹ کیا گیا تھا، آج اٹھائیس اگست تھا، اس نے تقریباً چوبیس گھنٹے بعد یہ پیج کھولا تھا، یعنی وہ خاصی لیٹ ہوگئی تھی۔

"آئی کانٹ بیلواٹ، یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ بڑبڑائی اور زور سے جھٹکا۔

"کیوں نہیں ہوسکتا؟ تم کیا سمجھتی ہو؟ اخلاقیات اور حق کی پہچان صرف تمہیں ہی ودیعت ہوئی ہے اور کسی کو نہیں ہوسکتی؟ خاص کر مجھے؟" حیدر کے لہجے میں اس کے انداز میں شکوہ کروٹیں لیتا تھا، فلاح کو دوسرا شدید دھچکا لگا تھا، اس نے تیزی سے گردن موڑی، وہ سامنے کھڑا تھا، سفید عوامی سوٹ پہ سیاہ واسکٹ میں ملبوس، بے حد سنجیدہ، مگر آنکھیں مسکرا رہی تھیں، فلاح ساکن رہ گئی۔

"یقین نہیں آرہا؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا، فلاح نے ہونٹ بھینچ لئے، چہرہ پھیر لیا، اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"ابھی تک خفا ہو؟" حیدر اس کی کیفیت سمجھ کر ہی بے قراری سے پھر اس کے سامنے آیا تھا۔

"اہم بات یہ نہیں ہے، اہم بات یہ ہے حیدر کہ آپ شاید مجھے منانے کی خاطر ایک بار پھر دھوکہ دینے چلے ہیں مجھے۔" اس کی سنجیدگی بے حد خطرناک ہو رہی تھی، حیدر سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

"تم نے صرف یہ ہی کیوں سوچا فلاح، کہ میں دھوکہ ہی دوں گا؟"

"اس لئے کہ آپ آل ریڈی ایسا کر چکے ہیں۔" وہ دبے ہوئے لہجے میں کہتی چیخ پڑی۔

"قرآن پاک میں اللہ فرماتا ہے "اور حق آ گیا باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے کو ہی ہے۔" ہدایت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا ہے فلاح، یہ رب کی عطا ہے، کسی بھی لمحے ہوسکتی ہے، سچائی اثر پذیر ہوتی ہے کبھی بھی اپنا آپ منوا سکتی ہے مجھے خوشی اس بات کی ہے، خدا نے مجھے بہترین بیوی سے نوازا جو حق اور سچ کی علمبردار تو ہے ہی، قربانی دینا بھی جانتی ہے، جس کی سوچ پاکیزہ ہے، جو حدوں کو نہیں پھلانگتی، جو باوقار انداز میں حقوق کی حفاظت کرنا بھی جانتی ہے فلاح، میں تم سے معافی تو مانگتا ہی ہوں، ساتھ میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں میں تمہارے حقوق سلب نہیں کروں گا، تم پڑھنا چاہتی ہو، پڑھو، تم جاب بھی کرو گی تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا، لیکن مجھے ایک موقع تو دو اصلاح کا، پھر شکایت ہوئی تو جو چاہے سزا دے لینا۔" اس کے ہاتھ تھامے عہد باندھتا ہوا حیدر وہی حیدر تھا، جو اس سے محبت کا دعویدار تھا، مگر و حیدر نہیں تھا جو اس کے حقوق سلب کر دیتا تھا، و اسے دیکھتی رہی، پھر مسکرا دی۔

"میں آپ کو موقع ضرور دوں گی حیدر مگر میں تعلیم بھی مکمل کروں گی، ڈگری بھی حاصل کروں گی، مگر جاب نہیں کروں گی، کیمرے کے سامنے آنا ٹی وی پہ نشر ہونا مجھے پسند نہیں ہے ہمیں کپتان کے لئے جو بھی کرنا ہے وہ ہم گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بیٹھے بھی کر سکتے ہیں۔'' وہ عزم سے کہہ رہی تھی، اس کی آواز میں امید ہمکتی تھی، حیدر کچھ نہیں بولا، البتہ سر اثبات میں ہلا دیا تھا، وہ تیس کی رات تھی، جب یہ لوگ اسلام آباد پہنچے، حیدر نے جب گاڑی کا رخ گھر کی بجائے شاہراہ دستور کی جانب کیا تو فلاح چونک اٹھی تھی، اس نے سوالیہ نگاہوں سے حیدر کی جانب دیکھا تھا، جو مسکرا رہا تھا۔

''اس وقت کپتان عالیٰ شان کو ہماری ضرورت ہے بیوی، ہم ان کا بازو بن جائیں گے اس وقت تک وہاں رہیں گے جب تک کپتان کو ہماری ضرورت ہے، جب تک نیا پاکستان نہیں بن جاتا، کپتان میں اللہ کے فضل و کرم سے اتنا اسٹیمنا ہے، مجھ میں بھی ہے، تم میں ہے۔'' وہ بالکل کپتان کے انداز میں انہی کے لہجے میں پوچھ رہا تھا، فلاح فرط مسرت و فور جوش سے ہنستے ہوئے رو پڑی اور سر اثبات میں ہلانے لگی۔

''ہم اس جہاد میں شامل ہوں گے، تاکہ آنے والے وقت ہمارے لئے بھی یہ گواہی دے سکیں کہ۔''

لہو میں بھیگے تمام موسم گواہی دیں گے
کہ تم کھڑے تھے
وفا کے رستے کا ہر مسافر گواہی دے گا
کہ تم کھڑے تھے

اور جب گاڑی چھوڑ کر وہ کنٹینرز کی بلند اور دشوار رکاوٹوں کو پھلانگتے اک دوجے کا ہاتھ پکڑے بیٹے کو سنبھالے کپتان کے پنڈال میں داخل ہو رہے تھے، ان کے جذبات بے حد عروج پہ تھے۔

یہ قدم قدم بلائیں
یہ وصالِ کوئے جاناں
جسے زندگی ہو پیاری
وہ یہاں سے لوٹ جائے

وہاں ایک چھوٹے بچے کا عزم بھی بلند چٹانوں جیسا تھا، وہ مسحور تھی خوش تھی، عشاء کی اذان ہوئی کپتان سمیت جس جس نے نماز ادا کرنی تھی کی گئی، پنڈال میں آج انوکھا ولولہ پایا جاتا تھا، کیونکہ کپتان اہم اعلان کرنے والے تھے، بالآخر کپتان کنٹینرز کی چھت پہ نمودار ہوئے، ان کی تقریر کا ایک ایک حرف اس کے دل کی آواز تھا، حیدر بھی اس کے ہمراہ تھا اور اس کا بیٹا عبد السمیع بھی انقلابی بن کر آیا تھا، کپتان کہہ رہے تھے۔

''قائداعظم محمد علی جناح سے کسی نے کہا، سنو میرے نوجوانو، قائداعظم محمد علی جناح سے کسی نے کہا، ''جناح صاحب! آپ کو کیا ضرورت تھی، سیاست میں آ کر ذلیل ہونے کی، آپ کے پاس نام تھا، عزت اللہ نے دی ہوئی تھی، پیسہ بھی بہت تھا، پھر کیا حاصل ہوا، الیکشن میں آپ ہار گئے، صرف ایک سیٹ ملی ہے۔''

قائداعظم محمد علی جناح نے جواب دیا، فرمایا۔

''آپ نے ٹھیک کہا، میرے پاس سب تھا، اللہ نے سب دیا تھا مگر ہمارے پاس آزادی نہیں تھی، ہمارے بنیادی حقوق سلب ہو رہے تھے، ہم ہندوؤں سے الگ قوم ہیں، ہم ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔'' میرے نوجوانو، مجھے بھی جب میں سیاست میں آیا کسی نے کہا، یہ ہی کہا، میں نے جواب دیا تھا، ہمارا سسٹم اوپر سے نیچے تک خراب ہو گیا ہے، یہاں بادشاہت قائم ہو گئی ہے، حقوق غضب ہو رہے ہیں، میں پاکستان کی قوم کو پاکستان کے معماروں کو آگاہی دینے انہیں بیدار کرنے آیا ہوں، ہمیں ویسا پاکستان بنانا ہے، انشاء اللہ جس کی جدوجہد قائداعظم نے کی تھی اور

میرے نوجوانو، یاد رکھو جمہوریت یہ نہیں کہ خود تمام مراعات حاصل کر لیں اور عوام کو مہنگائی کرپشن اور بے انصافی کی دلدل میں دھنسا دیں، ہم اس پاک وطن کو ایک اسلامی ریاست بنائیں گے انشاء اللہ، کچھ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مجھے اقتدار کا لالچ ہے، جنرل ضیاء نے مجھے 1983ء میں وزارت کی پیشکش کی تھی مگر میں نے ٹھکرا دی، مشرف نے مجھے اتحاد کا مشورہ دیا کہ اتنی سیٹیں تمہیں دے دیں گے، مگر میں غلط نظام کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا، آپ خود فیصلہ کر لیں، مجھے اقتدار کا لالچ ہے یا پھر 87ء میں واقعی ملک کی قوم کی بہتری کا خواہاں ہوں۔'' کپتان خطاب کرتے رہے، حیدر جھومتا رہا، سرشار ہوتا رہا، پھر بالآخر وہ اعلان بھی کر دیا گیا، جس کا سب کو انتظار تھا اور جس کے لئے دوپہر میں کپتان سب کو بالخصوص یہاں آنے کی دعوت دے چکے تھے، کپتان نے صرف وزیراعظم کے گھر کے سامنے احتجاجی دھرنا دینے کا ہی حکم نہیں دیا، بلکہ مثالوں سے اسی دھرنے کو آئینی ثابت کرتے ہوئے پولیس سے بھی گزارش کی تھی کہ وہ انہیں نقصان نہ پہنچائیں، پولیس کے لئے نیک جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کپتان نے بالخصوص کہا تھا کہ وہ پولیس بھی ان کی اپنی ہے، یہ لوگ پاکستانی ہیں اور سب ایک قوم ہیں وغیرہ، کپتان کے اس اعلان کے بعد کراؤڈ میں یکدم جوش و خروش بڑھ گیا تھا، کپتان کے خطاب کے بعد دعا ہوئی تھی، اس کے بعد دونوں جماعتوں کے لیڈرز نے ایک بار پھر بالخصوص اپنے کراؤڈ سے پرامن رہنے کی پرزور تاکید کی تھی، یہ جماعتیں اس پرامن انداز میں جیسا کہ سترہ دن پرامن احتجاج کرتی رہی تھیں، وزیراعظم ہاؤس کی جانب پیش قدمی کرنے لگے، ان کے راستے میں پولیس کے دستے تھے، کنٹینرز تھے ایک کنٹینرز ہٹا دیا گیا، پولیس نے مداخلت نہیں کی، مگر جیسے ہی مظاہرین نے دوسرا کنٹینرز ہٹانا چاہا، ان پہ ایک دم سے شیلنگ کی جانے لگی، صرف یہی نہیں کپتان کی جماعت کی جو خواتین اور بچے کپتان کے آرڈر پہ ہی وہیں اسی جگہ پہ ٹھہر گئے تھے ان پہ بھی پولیس نے دھاوا بول دیا، نہتے لوگ اور ہتھیاروں سے لیس پولیس کی یلغار ایکسپائر ہوتے ہوئے آنسو گیس کے شیلنگ جو دم گھٹنے کا باعث تھی، مفلوج کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی، جس پہ امریکہ کی مہریں ثبت تھیں اتنی شدت سے فائر کیے گئے کہ لمحوں میں وہ پرامن پرجوش اور خوشگوار ماحول تبدیل کرنے کا باعث بن گئیں، اب وہ وسیع سبزہ زار میدان جنگ کا منظر پیش کر رہے تھے، جہاں کچھ دیر قبل اس کے خوشی کے نغمے گونجتے تھے، دعاؤں کی برکتوں کا نزول تھا، اب ایسا لگتا تھا، آنکھیں کشمیر یا فلسطین میں کفار کی چڑھائی ملاحظہ کر رہی ہیں، ایسے ہی مناظر تھے ہر سو ربڑ کی گولیاں فائر کی جاتی رہیں مرد بدحواس ہو کر عورتوں بچوں کی جانب بڑھے اور نقصان ہوتا رہا، چیخیں ہنگامہ شور اور اذیت صرف اذیت، ہفتہ 29 اگست پاکستان کی تاریخ میں سیاہ رات سیاہ دن کے طور پہ رقم ہو گیا، قیامت صغریٰ کا منظر دیکھنے والوں کو خون رلاتا رہا کئی صاحب اقتدار بھی تڑپ اٹھے، مگر فرعون وقت کا دل پھر بھی نہیں کانپا، پاکستان کی تاریخ میں اس ظلم کے بعد پہلی بار اہل دل نے مارشل لاء کی چاہ کی، مگر آمر وقت نے ایسی نوبت نہیں آنے دی۔

☆☆☆

30 اگست اتوار 2014ء

قیامت خیز رات گزر گئی تھی، خون آلود دن طلوع ہو چکا تھا، بیشتر خواتین اور بچے مرد بوڑھے

زخمی ہو چکے تھے، اپنوں کا اپنوں پہ ڈھایا جانے والا ظلم دشمن کی خوشی کا باعث تھا، مگر انسانیت لرز رہی تھی، آمر وقت مزید طاقت کے استعمال کی جانب سے مختلف بیان نشر ہو رہے تھے، دھرنے کا شرکاء پہ پولیس کا جبر اور ستم جاری تھا، لوگ بھوکے تھے، مگر کربلا کی تاریخ کو پھر زندہ کر دیا گیا تھا، یزیر وقت نے ان مظلوم لوگوں کے لئے پانی اور کھانے پہ پابندی لگا دی تھی، اس پہ ستم مزید پولیس کے تازہ دم دستے وہاں تعینات کیے جا رہے تھے، کپتان بار بار اپیل کر رہے تھے کہ لوگوں کے لئے کھانے اور پینے کی چیزیں آنے دیں مگر شنوائی ہو کر نہیں دیتی تھی، ساٹھ سالہ کپتان جو کل تک ایک دم شیر کی طرح نظر آتے تھے، اس سانحے کے بعد جیسے یکلخت بوڑھے ہو چکے تھے، میڈیا چلا رہا تھا، آمر وقت نے کرسی کی حفاظت کی خاطر وہ کر دکھایا تھا جو کسی کے سان و گمان تلک بھی نہیں تھا، میڈیا کا ہی یہ بھی انکشاف تھا کہ ہاسپٹلز سے لاشیں غائب کروا دی گئی تھیں، 744 پولیس آفیسرز نے اس ظلم کی داستان کا حصہ بننے سے انکار کرتے ہوئے ڈیوٹی نبھانے سے انکار کر دیا تھا، مگر حوصلے دھرنے کے شرکا کے پھر بھی جوان تھے، ہر کوئی دکھ سہہ کر غم سینے سے لگا کر بھی پر عزم نظر آتا تھا، نئے پاکستان کے حصول کے لئے، انہی میں حیدر کرار بھی تھا، جس سے گزر جانے والی رات نے عظیم خراج وصول کیا تھا، ان کا پیارا عبدالسمیع اس انقلاب میں شہادت کا جام پینے والا سب سے چھوٹا ننھا شہید تھا، شدید شیلنگ سے اٹھنے والے جان لیوا دھویں نے بچے کا سانس روک دیا تھا، جو پھر بحال نہیں ہو سکا، فلاح بچھاڑیں کھاتی تھی، جبکہ حیدر کا حوصلہ کمال ضبط تھا۔

"میری وجہ سے...... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے حیدر!" وہ تڑپی تھی، وہ سسکی تھی، حیدر نے اس حوصلے سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"حضرت امام حسینؓ کا فرمان ہے، حق کے لئے جتنی دیر سے کھڑے ہو گئے اتنی بڑی قربانی دینی پڑے گی" حقیقت ہے بالکل، میں نے بہت دیر کر دی تھی فلاح، میرے بیٹے سے بڑھ کر میرے پاس کچھ قیمتی نہیں تھا، لیکن ہمت نہیں ہارو، اللہ مزید اولاد سے نوازے گا، انقلاب قربانی کے متقاضی ہوا ہی کرتے ہیں، انقلاب خون مانگتا ہی ہے اور ہم ہر قربانی دینے کو تیار ہیں اللہ کے فضل و کرم سے نیا پاکستان ضرور بنے گا۔" وہ عزم سے کہہ رہا تھا، فلاح ساکن رہ گئی، وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، حیدر اتنے بڑے حوصلے اور ظرف کا مالک ہوگا، حیدر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پہ اٹکے آنسو کو اپنی پوروں پہ محفوظ کر لیا، مسکرایا اور اس کا دھیان سامنے کی جانب مبذول کرایا، جہاں کپتان اپنے عوام کا حوصلہ بڑھانے کو ایک بار پھر خطاب کر رہے تھے۔

"آپ نے اگر سیاست میں دین سے کوئی رہنمائی نہیں لینی اور دینی نظام بھی نافذ نہیں کرنا تو کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ ایک امریکہ نواز لیڈر سے دور رہیں، جو شخص خود کو اوباما جیسا کہتا ہے اور امریکہ کو انسانی حقوق کا علمبردار کہتا ہے، اس کے ساتھ اتحاد کیا معنی سمجھا جاتے؟ کیا امریکہ کے جرائم نظر انداز کر دیں؟ کیا امام خمینی کا قول نظر انداز کر دیں کہ امریکہ شیطانی بزرگ ہے، کیا دابجر کا فرمان نظر انداز کر دیں کہ امریکہ اسلام کا پہلے نمبر کا دشمن ہے، ایک شخص جو کہتا ہے کہ میں خمینی کی طرح نہیں ہوں (ہو بھی نہیں سکتا) بلکہ اوباما کی طرح ہوں، اس کے امریکہ نواز ہونے میں کیا شک؟ ایسا شخص پاکستان کو امریکہ کی مزید چراہ گاہ نہیں بنا دے گا خدانخواستہ یاد رکھو نوجوانو، اگر اب یہ حکومت بچ گئی تو اس حکومت کے تکبر اور رعونت میں مزید اضافہ ہو جائے گا، انقلاب خون مانگتا ہے یہ آدھا سچ ہے انقلاب سے پہلے نظریہ مانگتا ہے، نظریہ کے بغیر جتنا مرضی خون بہا لیں فائدہ نہیں ہوگا، میدان میں حاضر رہنا چاہیے یہ کامیابی کا آدھا فارمولا ہے میدان میں حاضری کا مقدمہ اگر بیداری نہ ہو تو یہ ایسا ہی ہے جیسے نیند میں چلنا، پاکستان بنے 67 سال ہو گئے، پاکستان کو لٹتے بھی 67 سال ہونے کو آئے، ہم نے نظریہ آپ کو دے دیا، جمہوریت یہ نہیں ہے، جس کا مظاہرہ وقت کے آمر نے کیا ہے، جمہوریت یہ ہے کہ اگر وزیراعظم ایک جھوٹ بھی بول دیتا ہے تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے، ہم یہاں ہیں ہم یہاں سے نہیں جائیں گے جب تک ہمارا مطالبہ پورا نہیں ہوتا، ہم سب مل کر نیا پاکستان بنائیں گے انشاء اللہ۔"

"انشاء اللہ یہ خواب ضرور شرمندہ تعبیر ہوگا، روشنی کی خواہش میں جو سفر شروع ہوا، اس کی منزل اب زیادہ دور نہیں۔" حیدر نے پر عزم انداز میں کہا تھا اور فلاح کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی، امید کی روشنی اس کی آنکھوں میں بھی پھر سے جھلملانے لگی تھی۔

"ہم بھی یہیں ہیں کپتان عالی شان، ہم بھی یہاں سے نہیں جائیں گے، تب تک جب تک حقوق حاصل نہیں ہوتے، جب تک نیا پاکستان نہیں بن جاتا۔" وہ سرگوشی سے مشابہہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

"انشاء اللہ!" فلاح نے بھیگی مسکراہٹ سے کہا اور اپنا سر اس کے شانے سے ٹیک دیا، دور آسمان پہ چاند زرد تھا، مگر تھکا ہوا نہیں، اندھیرا ختم ہونے کو تھا، امید بر آنے کو تھی، نیا سورج نکلنے کو تھا، تبدیلی آنے والی نہیں تھی، تبدیلی آ چکی تھی۔

قارئین کرام! یہ تحریر مصنفہ کی فرمائش پر شائع کی جا رہی ہے، اس کے مندرجات مصنفہ کی ذاتی رائے ہے، ادارہ کا ان خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆☆☆

اچھی کتابیں
پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء
اردو کی آخری کتاب .... ☼
خمار گندم .... ☼
دنیا گول ہے .... ☼
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☼
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☼
چلتے ہو تو چین کو چلیے .... ☼
نگری نگری پھرا مسافر .... ☼
خط انشاء جی کے .... ☼
اس بستی کے اک کوچے میں .... ☼
چاند نگر .... ☼
دل وحشی .... ☼
آپ سے کیا پردا .... ☼

ڈاکٹر مولوی عبد الحق
قواعد اردو .... ☼
انتخاب کلام میر .... ☼

ڈاکٹر سید عبداللہ
طیف نثر .... ☼
طیف غزل .... ☼
طیف اقبال .... ☼

لاہور اکیڈمی
چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37321690, 3710797

میں اداس رستہ ہوں شام کا

مدیحہ تبسم

”اوہ شٹ!“ بڑی ماما کی بات سن کے وہ جھلا گیا، حلق سے اترتی چائے کی شیرینی اسے تلخی سے بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”صبح ہی صبح موڈ غارت ہو گیا۔“ وہ چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے بڑبڑایا۔

”میں تو شکر کر رہی تھی کہ آج اتوار ہے، ورنہ تمہارے لئے بہت مشکل ہو جاتی۔“ بڑی ماما اس کی بڑبڑاہٹ نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔

”کیوں مجھے کیوں مشکل ہو جاتی؟“ اس نے تیوری چڑھا کے پوچھا۔

”ظاہری بات ہے جب تم اسے لینے جاؤ گے تو پھر آفس کو چھوڑنا پڑے گا، آج چونکہ تم نے آفس نہیں جانا تو پھر تمہارے لئے سہولت ہے۔“ ان کا اطمینان جوں کا توں تھا۔

”کیا؟“ وہ اچھل ہی پڑا۔

”مجھے اپنی چھٹی برباد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور وہ بھی اس آفت کی پرکالہ کے لئے تو ہرگز نہیں، تو...... نیور۔“ اس نے قطعی انداز میں سر کو جنبش دی۔

”رواحہ!“ بڑی ماما نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

”پلیز بڑی ماما! آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پہ، لیکن مجھے اپنے کان بہت عزیز ہیں اور ابھی میرے روم میں ڈھیروں کام میرے منتظر ہیں، اگر میں چھوڑ کر چلا گیا آپ کی اس لاڈلی کو لینے کے لئے، تو واپسی تک میرا دماغ بہت حد تک خالی ہو چکا ہوگا اور پھٹنے کے قریب ہوگا، لہٰذا مجھے آپ معاف ہی رکھیں۔“ اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر صاف کہہ دیا۔

مکمل ناول

"حد ہوتی ہے مبالغہ آرائی کی رواحہ! اب وہ اتنی بھی ال مینرڈ نہیں ہے۔" نور نے قدرے برہم نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھا، اس کے حمایتی اس سے پہلے ہی ٹپک پڑے ہیں۔" اس کا انداز صاف چڑانے والا تھا۔

"میں حمایتی ہوں تو خود کیا ہو؟ دشمن اول۔" نور تو اس کے انداز پہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔

"میں خوامخواہ دشمنی مول لوں اس سے، ابھی مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔" رواحہ کو گزشتہ دنوں کے واقعات ہرگز نہیں بھولے تھے۔

"بس کرو، اب لڑنا مت شروع کر دینا۔" تہمینہ نے ٹوکا تو وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے۔

"نور! تم لحاظ رکھا کرو وہ بڑا ہے تم سے اور رواحہ! تم بھی ہر بات میں بحث مت کیا کرو۔" انہوں نے باری باری دونوں کو ڈانٹا۔

"کتنے بجے آنا ہے مس علیشا فرحان نے۔" رواحہ نے فوراً ان کا موڈ بحال کرنا چاہا، نور نے اپنی بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔

"تین بجے پہنچ جانا اسٹیشن۔"

"اسٹیشن؟" رواحہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

"علیشا فرحان اور لاہور سے کراچی تک ریل گاڑی میں سفر؟"

"کسی مجبوری کی وجہ سے وہ ٹرین میں سفر کر رہی ہے ورنہ اس نے بائی ایئر ہی آنا تھا۔" نور نے اس کی حیرت کو ختم کرنا چاہا۔

"مجبوری نہیں ایڈونچر کی خاطر۔" رواحہ نے طنزاً کہا، پھر بڑی ماما کی تیز نظروں کو محسوس کر کے فوراً بولا۔

"آپ فکر مت کریں بڑی ماما! آپ کی لاڈلی کو بخیریت گھر پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔"

"کیا تھا اگر یہی بات پہلے کہہ دیتے۔" اسے کھڑا ہوتا دیکھ کر نور نے کہا، تو وہ اسے گھورتا ہوا ڈائننگ روم سے نکل گیا۔

"یہ اچھی مصیبت بڑی ماما نے میرے گلے ڈال دی ہے اب پتہ نہیں یہ محترمہ کتنے دن یہاں قیام فرمائیں گی، میرا خیال ہے میں اتنے دن ایک چکر دوبئی کا لگا آؤں، کچھ کرتا ہوں، پہلے ایک جھنجھٹ سے تو جان چھڑوا لوں۔" وہ خود ہی بڑبڑاتا ہوا سیل فون سے نمبرز پریس کرنے لگا۔

"ہیلو ساجد! کہاں ہو اس وقت؟" ساجد اس کا ڈرائیور تھا اور اپنی سہولت کے لئے ہی رواحہ نے اسے سیل فون لے کر دیا تھا، آج چونکہ سنڈے تھا لہٰذا اس کی چھٹی تھی۔

"ایسا کرنا، تین بجے اسٹیشن پہنچ جانا اور علیشا کو لے آنا، پہچان تو لو گے ناں تم۔" علیشا تقریباً ڈیڑھ سال پہلے کراچی آئی تھی اور ساجد کو اس وقت نئی نئی ملازمت ملی تھی یہاں۔

"ٹھیک ہے، بس یہی کام ہے آج تمہارے ذمے۔" سیل آف کر کے اس نے بیڈ پہ اچھالا، ایک مصیبت سے تو جان چھوٹی۔

اس کی بجائے ساجد کو جاتے دیکھ کر بڑی ماما نے خاصی خفگی کا اظہار کیا تھا لیکن اس نے اپنی مصروفیت کا بہانہ کر کے بڑی ماما کو رام کر لیا تھا اور یہ بہانہ اتنا بودا بھی نہیں تھا اسے واقعی پی سی پہ کافی کام کرنا تھا اور جس وقت اس نے پی سی ٹرن آف کر کے وال کلاک کو دیکھا تو وہ ساڑھے چار بجا رہا تھا۔

"اوہ، آئی تھنک علیشا کافی دیر کی آ چکی ہو گی، اچھی بات ہے ملاقات کا ابتدائی مرحلہ طے ہو چکا ہو گا، لگتا ہے بڑی ماما ابھی بھی ناراض ہیں ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مہمان آیا ہو اور فوراً اس سے ملاقات کا شرف نہ بخشا جائے۔" خود کلامی کے سے انداز میں کہتا ہوا وہ کھڑا ہو گیا، لیکن اس معاملے میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا، کیونکہ پچھلی دفعہ علیشا کو ایئرپورٹ سے ریسیو کرنے وہ ہی گیا تھا اور راستے میں اس نے رواحہ کے اتنے کان کھائے تھے کہ بے ساختہ اس کی جی چاہا تھا گاڑی کسی ٹرک میں مار دے، کم از کم اس کی زبان تو رکے اور اسی پہ اکتفا نہیں کیا تھا ہر کھٹی میٹھی چیز دیکھ کر اس کا دل مچلنے لگتا تھا، اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ وہ پہلی مرتبہ کراچی ان سے ملنے کے لئے آئی ہے اور اسے اتنی جلدی کسی مرد سے فری نہیں ہونا چاہیے، وہ کبھی پانی پوری کی فرمائش کر دیتی تو کبھی دہی بھلے، لیکن رواحہ بھی ٹھس بنا بیٹھا رہا مجال ہے ہاتھ کبھی ہینڈ بریک کی طرف بڑھا ہو۔

اور بات یہیں ختم نہیں ہوئی تھی، اپنے دو ماہ کے قیام میں اس نے ہر طرح سے رواحہ کو زچ کیا تھا، بس اپنی ناخوشگوار واقعات کی بناء پر رواحہ نے اس سے دور ہی رہنا چاہا تھا، اب بھی صرف بڑی ماما کے ڈر سے وہ علیشا سے سلام دعا کرنے کے لئے اٹھا تھا ورنہ ارادہ تو یہی تھا کہ ڈنر پہ ہی ملاقات ہو جائے۔

وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا، جب لاؤنج کا دروازہ کھلا اور علیشا اندر داخل ہوئی اور رواحہ کو حیرت کا جھٹکا لگا، اس نے پیچ کلر کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا اور ہم رنگ دوپٹہ نہایت سلیقے سے اوڑھا گیا تھا، چہرے پہ نہایت سنجیدہ بلکہ رنجیدہ تاثرات رقم تھے اندر آتے ہی اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا۔

"شکر ہے تم پہنچ گئی مجھے بہت فکر ہو رہی تھی۔" بڑی ماما نے فوراً آگے بڑھ کے اسے گلے لگایا تھا اور علیشا کا سارا ضبط جواب دے گیا، آنسو خود بخود ہی پلکوں کی باڑھ توڑ کر ایک تسلسل سے نکل پڑے تھے، جنہیں روکنے کی کوشش میں اس نے اپنا نچلا ہونٹ اس بے دردی سے کچلا تھا کہ اس سے خون چھلکنے کے قریب ہو گیا تھا اور رواحہ تو گویا اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا، وہ چہرہ جسے اس نے ہمیشہ کھلکھلاتے دیکھا تھا آج ناقابل یقین کیفیت میں اس کے سامنے تھا۔

دائیں ہتھیلی کی پشت سے اس نے اپنا چہرہ صاف کیا اور ان سے علیحدہ ہوئی نور بھی فوراً اس کی طرف لپکی تھی اور اسے گلے لگایا، آنسو ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں مچلے تھے اور باہر نکلنے کو بے تاب ہو گئے، آنکھیں زور سے میچتے ہوئے اس نے انہیں روکنے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔

"بی بریو علیشا! یو آر آ اسٹرانگ گرل۔" نور نے اس کی کمر پہ تھپکی دیتے ہوئے اسے تسلی دی تھی، سر کو آہستگی سے اثبات میں جنبش دیتے ہوئے وہ اس سے الگ ہوئی۔

"جاؤ نورا! بہن کے کھانے پینے کا انتظام کرو، آؤ علیشا ادھر بیٹھو۔" بڑی ماما اسے ساتھ لئے صوفے پہ بیٹھ گئیں، رواحہ اسی بے یقینی کی سی کیفیت میں نیچے اترا اور اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے پل کی پل نظریں اٹھائیں، گہری براؤن شہد رنگ آنکھوں میں ہر طرف سیلاب تھا شناسائی کی ہلکی سی رمق بھی نہ تھی، اب کی دفعہ رواحہ کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا تھا۔

"تمہیں تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتی رواحہ احمد! کیونکہ تمہیں میں نے بہت زیادہ تنگ کیا ہے، بہت ستایا ہے، تم ہمیشہ مجھے یاد رہو گے۔" علیشا نے بہت چٹخارے لیتے ہوئے یہ جملہ اس

سے کہا تھا، وہ نہ چاہنے کے باوجود اسے یاد رکھے ہوئے تھا اور وہ چاہتے ہوئے بھی اسے کیسے بھول گئی۔

‘‘بیٹھ جاؤ رواحہ! کھڑے کیوں ہو۔’’ وہ جو شش و پنج کی کیفیت میں کھڑا تھا بڑی ماما کے کہنے پر اس کے سامنے ہی سنگل صوفے پہ بیٹھ گیا۔

‘‘کیسی ہو علیشا؟’’ وہ جو صرف کھڑے کھڑے سلام کرنے آیا تھا پتہ نہیں کیوں اب چاہ رہا تھا کہ اس سے بیٹھ کے باتیں کرے، جواب دینے کی بجائے اس نے صرف سر ہلانے پہ اکتفا کیا تھا، اس کی بھیگی پلکوں نے رواحہ کو اچھا خاصا ڈسٹرب کیا تھا۔

اسی وقت نور چائے کی ٹرالی ڈھیروں لوازمات سمیت گھسیٹ لائی تھی، علیشا نے صرف ایک گلاس سادہ پانی پینے پہ اکتفا کیا تھا، بڑی ماما اور نور کے بے حد اصرار پہ اس نے صرف ایک آدھ چیز ہی چکھی تھی۔

‘‘میں اب آرام کروں گی آنٹی! بہت تھک گئی ہوں۔’’ اس سارے عرصے میں اس نے رواحہ پہ ایک کے بعد دوسری نظر نہیں ڈالی تھی، وہ تو شاید اپنے وجود سے بھی لاتعلق ہو رہی تھی۔

‘‘ہاں...... ہاں...... سو جاؤ، کچھ دیر آرام کر لو نور تمہیں بیڈ روم تک چھوڑ آتی ہے۔’’ نور اسے لے کر چلی گئی۔

‘‘یہ علیشا کو کیا ہو گیا ہے؟ صرف ڈیڑھ سال کے قلیل عرصے میں وہ سرتاپا بدل گئی ہے، کوئی انسان اتنا بھی بدل سکتا ہے؟’’ اپنے بیڈ روم میں آ کے بھی وہ مسلسل اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔

‘‘لیکن مجھے اس سے کیا، وہ ہنسے یا روئے۔’’ اس نے اپنے خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش بری طرح ناکام ہوئی تھی، اس کا دل و دماغ ابھی بھی علیشا فرحان میں اٹکا ہوا تھا۔

☆☆☆

‘‘ارے...... واہ بھئی! آج تو ہماری بیٹی آئی ہے۔’’ قاسم انکل اسے ناشتے کی ٹیبل پہ دیکھ کر چہکے، رات کا کھانا وہ تھکاوٹ کا بہانہ کر کے گول کر گئی تھی، حالانکہ تہمینہ آنٹی اور نور نے اس کی خاطر اچھا خاصا اہتمام کیا تھا۔

‘‘کیسے ہیں انکل؟’’ لہجے کو زبردستی بشاش بنانے کی اس نے اپنی سی کوشش کی تھی، رات بھر رونے کی وجہ سے آواز بھی بیٹھ سی گئی تھی، اس کی بھاری ہوتی آواز پہ رواحہ نے چونک کے اسے دیکھا، سرخ متورم آنکھیں صاف چغلی کھا رہی تھیں، کل کے مقابلے میں چہرے پہ پژمردگی اگرچہ کم تھی مگر یاسیت، سنجیدگی اور بے تحاشا دکھ کے تاثرات ہنوز برقرار تھے، رواحہ کے دل کو نئے سرے سے بے چینی ہوئی۔

‘‘بیٹا! میرے بارے میں تو تم اپنی آنٹی سے پوچھو، تعریفوں کے پل باندھ دیں گی۔’’ وہ خود ہی اپنی بات کا مزہ لیتے ہوئے مسکرائے۔

‘‘تعریفوں کے یا شکایات کے؟’’ نور نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

‘‘شکایات کے نہیں بھئی، تعریفوں کے ہی، کیونکہ ہم ہیں تعریفوں کے قابل۔’’ انہوں نے فرضی کالر اکڑائے۔

‘‘بس باتیں کروا لو جتنی مرضی آپ سے، تین دن سے واش روم کا نل پرابلم کر رہا ہے، کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کسی پلمبر کو بلوائیں اسے ٹھیک کروالیں۔’’ تہمینہ تو گویا پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں، رواحہ اور نور کے لبوں پہ دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی، علیشا گویا سارے ماحول سے لاتعلق تھی، نظریں جھکائے وہ بہت آہستگی سے چائے کے سپ لے رہی تھی۔

‘‘علیشا! رات بھی تم نے کھانا نہیں کھایا اب خالی چائے معدے میں مت انڈیلو، یہ سینڈوچ لو، بہت مزے کے بنائے ہیں نور نے۔’’ تہمینہ نے سینڈوچز اس کی طرف بڑھائے تو کسی روبوٹ کی مانند اس نے ایک سینڈوچ اٹھا لیا۔

‘‘بھئی! خوب اچھی طرح خاطر مدارت کرو ہماری بیٹی کی۔’’ قاسم انکل خوشدلی سے بولے۔

‘‘رواحہ! تم بھی ٹائم نکال کر سیر شیر کراؤ علیشا کو بلکہ سب مل کے کوئی پروگرام ترتیب دے لو، سب ہی کی آؤٹنگ ہو جائے گی۔’’ اب کی دفعہ وہ رواحہ سے مخاطب ہوئے، طبعی طور پر وہ ایک زندہ دل اور ہنس مکھ انسان تھے۔

‘‘بالکل پاپا! میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔’’ نور نے فوراً تائید کی۔

‘‘اور بھئی علیشا! گھر میں سب ٹھیک ہیں؟’’ بالآخر انہیں گھر والوں کا خیال آ ہی گیا تھا۔

‘‘جی!’’ وہ سابقہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

‘‘ہادی خیریت سے یو کے پہنچ گیا؟ جاب کیسی ہے اس کی؟’’

‘‘جی! خیریت سے پہنچ گئے ہیں، فون پہ اطلاع دی تھی انہوں نے اور جاب تو فی الحال ٹرائل بیس پہ ہے۔’’ پہلی مرتبہ اس نے اس قدر طویل جملہ ادا کیا تھا۔

‘‘یہ ہادی کب یو کے چلا گیا اور وہ بھی جاب کے سلسلے میں، حیرت ہے مجھے پتہ ہی نہیں۔’’ رواحہ کو اپنی بے خبری پہ افسوس ہو رہا تھا۔

ہادی سے اگرچہ اس کی بہت گاڑھی دوستی نہیں تھی تاہم سلام دعا ضرور تھی، وہ جب بھی کراچی آتا رواحہ سے ضرور ملتا تھا۔

‘‘ہو گئی ہو گی کوئی ایمرجنسی۔’’ اس نے خود سے ہی جواز گڑھا۔

‘‘لیکن علیشا کا یوں کراچی آنا اور بالکل بدلا ہوا انداز، ہادی کا اچانک جاب کے لئے یو کے جانا، کہیں کوئی وجہ تو ضرور ہے۔’’ وہ پھر سے الجھنے لگا۔

‘‘کہاں ہو بھئی، میں کیا کہہ رہا ہوں۔’’ قاسم نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا، تو وہ جیسے چونک پڑا۔

‘‘جی! بڑے پاپا!’’

‘‘آج یو اے ای سے ڈیلی گیشن آ رہا ہے، ان کی فائل کو پہلے ہی اسٹڈی کر لینا اور اگر ہو سکے تو ان کی ویب سائیڈ کا بھی وزٹ کر لینا تمہارے لئے سہولت رہے گی۔’’ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ کھڑے ہو گئے پھر تہمینہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

‘‘میرا بریف کیس لا دو۔’’

‘‘او کے بھئی اچھا علیشا بیٹا! بالکل تکلف نہیں کرنا تمہارا اپنا گھر ہے۔’’ تہمینہ کے ہاتھ سے بریف کیس پکڑتے ہوئے انہوں نے علیشا کے سر پہ ہاتھ رکھا اور باہر نکل گئے، تہمینہ بھی انہیں چھوڑنے کے لئے باہر تک گئی تھیں۔

فون کی گھنٹی بجی تو نور اٹھ کے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی، اب ٹیبل پہ صرف وہ دونوں ہی رہ گئے تھے، رواحہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر وہ خود کو اس سے بات کرنے سے روک نہیں سکا تھا۔

‘‘آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے علیشا؟’’ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا اس نے یہ سوال کیوں پوچھا، علیشا نے ایک پل حیرت سے اسے دیکھا، اگلے ہی لمحے نگاہیں جھکا کے وہ آہستگی سے بولی۔

"جی! میں ٹھیک ہوں۔" لہجے میں اجنبیت کا تاثر خاصا واضح تھا۔

"ناشتہ تو ڈھنگ سے کریں، کچھ بھی نہیں لیا آپ نے۔" اسے اٹھنے کے لئے پر تولتا دیکھ کر وہ بے اختیار ٹوک گیا، شکر تھا کہ نور یہاں نہیں تھی ورنہ تو شاید رواحہ کے ایسے رویے پہ بے ہوش ہی ہو جاتی۔

"میں کر چکی......بس۔"

"علیشا! تمہاری ماما کا فون ہے۔" نور نے دور ہی سے ہانک لگائی تو وہ فوراً کرسی دھکیل کے کھڑی ہوگئی، رواحہ اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

بڑا دشوار ہوتا ہے ذرا سا فیصلہ کرنا
کہ جنوں کی کہانی کو
بیانی بے زبانی کو
یہاں تک یاد رکھنا ہے
کہاں سے بھول جانا ہے
اسے کتنا بتانا ہے اس سے کتنا چھپانا ہے
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے
کہاں ہنس ہنس کے رونا ہے
کہاں آواز دینی ہے
کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں سے رستہ بدلنا ہے
کہاں سے پلٹ کر آنا ہے

واقعی فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے اور اس فیصلے پہ عمل کرنا دشوار تر اور عمل پر استقامت اختیار کرنا دشوار ترین، یہ کٹھن راستہ اب اسے تنہا ہی طے کرنا تھا کہ اعتبار کا موسم تو کب کا گزر چکا ہے، نہ صرف اعتبار بلکہ مان، چاہت، خود اعتمادی ہر موسم گزر چکا تھا اب تو صرف ایک ہی موسم بچا تھا "درد کا موسم"

کتنا بے اعتبار کر دیا گیا تھا اسے، اس کی ذات کے پرخچے اڑائے گئے، اس کے کردار پر کیچڑ اچھالا گیا، وہ کوڑی کی بھی نہیں رہی وہ، بے مول کر دیا اس کی ذات کو۔

اور وہ علیشا فرحان جس نے کبھی چپ رہنا نہیں سیکھا تھا جب وہ بولتی تھی تو بڑے بڑوں کی بولتی بند کروا دیتی تھی، نچلا بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا، آج تک کسی میں یہ ہمت نہیں پیدا ہو سکی تھی، کہ وہ علیشا فرحان پر انگلی اٹھا سکے، اس کی خود اعتمادی کی تو مثالیں دی جاتی تھیں، جب اس کے اپنوں نے اسے مٹی میں رول دیا تو دوسرے کیا خاک عزت کرتے؟ آسمان کی بلندیوں سے وہ پاتال کی گہرائیوں میں جا گری تھی، پھر تو اسے ایسی چپ لگی کہ ہادی اور ماما اس کی آواز سننے کو ہی ترس گئے۔

وہ جانتی تھی یو کے جانے کا فیصلہ ہادی نے صرف اس کی وجہ سے کیا تھا اور اسے کراچی بھیج کر خود تنہا رہنے کا فیصلہ بھی ماما نے صرف اس کی وجہ سے کیا تھا، گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس کی زندگی میں اتنی تبدیلیاں آئی تھیں کہ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بھی لرز جاتی تھی اب پتہ نہیں تقدیر کس سمت پلٹنے والی تھی۔

"علیشا! یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو؟" عقب سے آتی نور کی آواز پہ وہ بوجھل دل لئے اس کی طرف پلٹی، اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کے نور بے قرار ہوگئی۔

"کیوں چند بے وفا لوگوں کی خاطر خود کو ہلکان کرتی ہو، دفع کرو انہیں شکر کرو خدا نے تمہیں ان سے علیحدہ کر دیا، خدا کی لاٹھی بے آواز ہے تم دیکھ لینا ان سب کا انجام بہت بھیانک ہوگا، جو کسی کے ساتھ برا کرتا ہے اس کے اپنے ساتھ سب سے برا ہوتا ہے۔" نور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اسے تسلی دینے لگی، وہ تو پہلے ہی بمشکل خود پہ جبر کیے ہوئے تھی، ہمدردی پاتے ہی اس کے سینے پہ سر رکھے ضبط کھونے لگی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی نور! کہاں مجھ سے غلطی ہوئی، کون سا ایسا گناہ سرزد ہوا جس کی اتنی سنگین سزا ملی مجھے، میں جتنی بھی بری تھی نور! میں نے آج تک کسی کا برا نہیں چاہا کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی پھر میرے ساتھ ایسا کیوں؟" وہ بلکنے لگی، نور کا اپنا دل پگھلنے لگا۔

"گناہ نہیں ہوا، تمہیں تو تمہاری کسی نیکی کا صلہ ملا ہے جو ایسے کمینے، بے غیرت اور بے حس انسانوں سے اللہ رب العزت نے تمہیں بچا لیا، غلط سلط سوچوں کا دماغ میں جگہ دینے سے بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس سے اچھائی کی امید رکھو۔" اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے نور نہایت محبت اور اپنائیت سے اسے سمجھانے لگی۔

"ہیلو......کیا ہو رہا ہے؟" رواحہ جو بڑے موڈ میں گنگناتا ہوا اور ٹیرس پہ آیا تھا ان دونوں کو دیکھ کر ایکدم ٹھٹک کر رک گیا، علیشا فوراً اس سے علیحدہ ہوئی اور تیزی سے اس کی سائیڈ سے نکلتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔

"علیشا کو کیا ہوا۔" وہ اس کے روانی سے بہتے انسو دیکھ چکا تھا، اس کے آنسوؤں نے دل میں عجیب ہلچل سی مچائی تھی وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"کچھ نہیں، تم چائے پیو گے۔" وہ فوراً بات بدل گئی، رواحہ نے الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں دیکھوں شاید ماما بلا رہی ہیں۔" وہ بھی کترا کر چلی گئی تو رواحہ عجب وسوسوں میں گھرا وہیں کھڑا رہا۔

"کیا علیشا کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟ اگر ہے تو کیا ہے؟ وہ اتنی گم صم اور کھوئی کھوئی سی کیوں ہوگئی ہے؟ اس کے کھلکھلاتے لب باہم پیوست کیوں رہنے لگے ہیں؟ جگمگاتی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز کیوں رہنے لگی ہیں؟" وہ جتنا سوچتا جا رہا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ علیشا فرحان کی مسلسل خاموشی پہ وہ جشن مناتا، جتنا شکر ادا کرتا اتنا ہی کم تھا، مگر ہوا اس کے برعکس تھا، اس کے الجھے، بکھرے رویے نے رواحہ کو بری طرح ڈسٹرب کیا تھا اور کیوں کیا تھا وجہ وہ خود بھی فی الحال سمجھ نہیں پایا تھا۔

زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا ابھی ڈیڑھ سال پہلے ہی تو وہ پہلی مرتبہ ان کے ہاں آئی تھی، رواحہ کو گزشتہ واقعات ہرگز نہیں بھولے تھے۔

☆☆☆

بڑی ماما اور نور جب سے لاہور سے آئی تھیں دونوں کے لبوں پہ ایک ہی نام تھا۔

"علیشا!" علیشا ایسی ہے، علیشا ویسی ہے، رواحہ کے تو کان پک گئے تھے، بڑی ماما کے کسی جاننے والے کی شادی تھی لاہور میں اور وہیں ان کی ملاقات ندرت سے ہوئی تھی، ندرت اور تہمینہ آپس میں کزنز تھیں، شادی سے پہلے تو میل ملاقات ہوتی رہتی تھی، لیکن شادی کے بعد الگ الگ شہروں میں رہنے کی وجہ سے کبھی ایک دوسرے سے رابطہ ہی نہیں ہو پایا تھا۔

ندرت، تہمینہ اور نور کو شادی کے بعد بڑے اصرار سے اپنے گھر لے آئی تھیں، وہیں نور اور علیشا کی خوب بن گئی تو انہوں نے بصد اصرار انہیں تقریباً دو ہفتے کے لئے اپنے گھر ہی روک لیا۔

ندرت کی تین اولادیں تھیں، شیراز، ہادی اور علیشا، علیشا سب سے چھوٹی اور گھر بھر کی لاڈلی تھی، تہمینہ اور نور نے آتے وقت علیشا اور

اس کی فیملی کو کراچی آنے کی بھرپور دعوت دی تھی، تب تو نہیں البتہ چند ماہ بعد علیشا کراچی آئی تھی۔

''ارے بابا! اندھا نہیں ہوں میں، پہچان لوں گا۔'' علیشا کو ائرپورٹ سے ریسیو کرنے چونکہ رواحہ نے جانا تھا اسی لئے نور، علیشا کی تصویر اسے صبح سے ہزار مرتبہ دکھا چکی تھی، وہ آفس کے لئے نکلنے ہی لگا تھا جب نور ایک مرتبہ پھر اس کے پیچھے تصویر لے کے لپکی تو وہ عاجز آ کے بولا۔

''پھر بھی رواحہ! میری مانو تو یہ تصویر اپنے پاس رکھ لو کیا پتہ تمہیں علیشا کی شکل بھول جائے اور تم اس کی جگہ کسی اور کو اٹھا لاؤ۔'' نور ہمیشہ بولنے کے بعد سوچتی تھی۔

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ! تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں کسی کو اغواء کرنے جا رہا ہوں۔'' وہ بھنا کے بولا اور غصے سے تن فن کرتا باہر نکل گیا۔

آفس بھی اس نے دو تین مرتبہ فون کر کے اسے یاد دلایا تھا، وہ پورے ٹائم پہ ائیر پورٹ پہنچ گیا تھا اور علیشا کو پہچاننے میں اسے قطعاً دشواری پیش نہیں آئی تھی، ریڈ گھٹنوں سے اونچی شرٹ، پرپل چوڑی دار پاجامہ، ریڈ اور پرپل ٹائی اینڈ ڈائی کا بڑا سا دوپٹہ لاپروائی سے دائیں کندھے پہ ڈالے، شولڈر کٹ بالوں کو دائیں بائیں جھٹکتی وہ غالباً اس کی تلاش میں ہی نظریں دوڑا رہی تھی، قریب جاتے ہوئے اس نے اپنا تعارف کروایا تھا۔

''میں رواحہ ہوں نور کا کزن۔''

''میں علیشا ہوں کیسے ہو؟ ویسے دیکھنے میں تو ٹھیک ہی لگ رہے ہو، پر میرا حال بہت برا ہے جلدی سے نکلو یہاں سے، میری برابر والی سیٹ پہ ایک اماں بی بیٹھی تھیں، اللہ معاف کرے سارے راستے اپنی بہو کی چغلیاں لگاتی رہی ہیں، میرے تو سر میں درد شروع ہو گئی ہے۔'' اس کے ہمراہ چلتے ہوئے وہ تو یوں بول رہی تھی جیسے برسوں کی شناسائی ہو، رواحہ کو باتونی لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں، جبھی اسے اچھی خاصی کوفت ہوئی تھی اور پھر یہی نہیں اس نے راستے میں بھی اسے اچھا خاصا زچ کیا تھا۔

''ہائے اللہ! یہاں بھی پانی پوری ملتی ہے، کتنی مزے کی لگ رہی ہے رواحہ، ذرا گاڑی تو روکنا۔'' آپ جناب کے مخاطب کی بجائے وہ ڈائریکٹ ''تم'' کا صیغہ ہی استعمال کر رہی تھی، رواحہ کے کانوں پہ جوں تک نہیں رینگی وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

''اچھا...... چلو یہ دہی بڑے ہی لا دو۔'' تھوڑا آگے جا کے اس نے پھر فرمائش کر ڈالی، رواحہ کان لپیٹے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

''اگر تمہارے پاس پیسے نہیں تو میں اپنے پیسوں سے لے لیتی ہوں۔'' اسے ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر وہ دانت کچکچا کر بولی۔

''فضول کاموں کے لئے میرے پاس ٹائم نہیں، مجھے واپس آفس بھی جانا ہے ایک ضروری کام چھوڑ کر آ رہا ہوں۔'' اس نے طعنہ ایسا دیا تھا کہ اسے بولنا ہی پڑا، آخر میں وہ جتاتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

''تو نہ چھوڑ کر آتے، میں نے کون سا تمہارے انتظار میں ساری عمر ائیر پورٹ پہ بیٹھے رہنا تھا، خود ہی چلی جاتی۔'' اس کا جتاتا لہجہ اسے سلگا ہی تو گیا اور رواحہ کا جی چاہا ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ایسی بدلحاظ اور منہ پھٹ لڑکی کو گاڑی سے نیچے اتار دے، بڑی ماما کا لحاظ مانع تھا ورنہ شاید وہ ایسا کر بھی گزرتا۔

بڑی ماما اور نور بڑے پرتپاک انداز میں اس سے ملی تھیں اس کا موڈ البتہ اتنا آف تھا کہ وہ لنچ کیے بغیر ہی آفس چلا گیا، رات کے کھانے پر البتہ اس سے پھر ٹکراؤ ہوا تھا، بڑی ماما ایک ایک ڈش اٹھا کے اس کے سامنے رکھ رہی تھیں، اسے اتنی اہمیت دیئے جانے پہ رواحہ کو اندر ہی اندر جیلسی ہوئی تھی۔

''رواحہ! تم کیا سلاد ہی ٹونگے جا رہے ہو، یہ اپنے پسندیدہ کریلے گوشت لو ناں۔'' اس کی ناز برداریوں کے درمیان بالآخر بڑی ماما کو اس کا خیال آ ہی گیا تھا۔

''رہنے دیں آنٹی! جن کا مزاج پہلے ہی کریلے جیسا ہو انہیں مزید کڑوا کسیلا ہونے کی ضرورت نہیں۔'' علیشا تو اس کے روکھے پھیکے رویے پہ دوپہر سے ہی بھری بیٹھی تھی، اس کی بات سن کے تہمینہ اور نور کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی جبکہ رواحہ کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی، اس نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا، جو بڑے مزے سے بریانی کھا رہی تھی، رواحہ نے کریلے گوشت کی ڈش کو ہاتھ سے پرے کیا اور دوبارہ سلاد کھانے لگا۔

''ہونہہ...... ایک تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔'' وہ ناک سکوڑ کے بولی۔

''تم......'' رواحہ کی قوت برداشت جواب دینے لگی۔

''یہ ٹرائفل لو ناں، بڑا میٹھا ہوتا ہے، جلے بھنے مزاج والے لوگوں کے لئے بڑی اکسیر دوا ہے، ٹیسٹ تو کر کے دیکھو، آزمائش شرط ہے۔'' اس کے غصے کی قطعاً پرواہ کیے بغیر وہ بڑی اپنائیت و یگانگت سے نازک سا ٹرائفل والا باؤل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی، بے اختیار رواحہ کا جی چاہا یہ باؤل اسی کے سر پہ دے مارے۔

''تم بھی نہ علیشا!'' نور بے ساختہ ہنس پڑی۔

''رواحہ میٹھا نہیں کھاتا، اسے بالکل پسند نہیں۔''

''اوہ! اب میں سمجھی، اس میں بیچارے رواحہ کا کوئی قصور نہیں، شوگر کی کمی کی وجہ سے مزاج ویسے ہی ڈاؤن رہتا ہے۔'' نور کے وضاحت کرنے پر وہ جیسے بڑی سمجھداری سے سر ہلا کے بولی، جبکہ ''بیچارے رواحہ'' کے الفاظ اسے اچھا خاصا سلگا گئے تھے۔

''دوسروں کے مزاج کو جانچنے اور پرکھنے کی بجائے تم اپنے کام سے کام رکھو تو زیادہ بہتر ہے۔'' وہ الفاظ چبا چبا کے بولا، جب وہ منہ پھٹ اور بدتمیز لڑکیوں کی طرح اس پر کمنٹ پاس کر رہی تھی، تو وہ بھی اس کے مہمان ہونے کا کیونکر لحاظ رکھتا۔

''اوہ...... تو تم بول بھی لیتے ہو، ویری گڈ خوب گزرے گی۔'' وہ گویا اس کی بات سے حظ اٹھا رہی تھی، نور کے لئے مسکراہٹ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا، اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ علیشا کو مزے دے گئے تھے، جبکہ وہ اس کے منہ لگنے کی بجائے دو چار لقمے زہر مار کر کے ہی اٹھ گیا تھا، بڑی ماما نے اگرچہ اسے کافی روکا تھا مگر اس کا تو سارا موڈ ہی غارت ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد رواحہ نے پوری کوشش کی تھی کہ علیشا سے کم سے کم سامنا ہو اور اپنی اس کوشش میں وہ خاصا کامیاب بھی رہا تھا، آج چونکہ سنڈے تھا اور چھٹی تھی، بڑے پاپا بھی گھر میں ہی موجود تھے، سنڈے والے دن وہ چاروں بیٹھ کے خوب گپ شپ لگایا کرتے تھے، وہ لاؤنج میں آیا تو بڑے پاپا، ماما اور نور کے ساتھ ساتھ علیشا بھی وہیں موجود تھی اور حسب عادت خاصا چہک رہی تھی، بڑے پاپا اس کی باتوں پہ محظوظ

ہوتے قہقہے لگا رہے تھے، اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا، جی تو چاہا یہیں سے واپس پلٹ جائے مگر بڑے پاپا نہ صرف اسے دیکھ چکے تھے بلکہ انہوں نے آواز بھی دے ڈالی تھی۔

”دیکھیں نہ انکل! میں یہاں سیر و تفریح کرنے آئی ہوں نہ کہ لوگوں کی سڑی بسی شکلیں دیکھنے کے لئے اور ابھی تک میں نے کراچی کا ایک پکنک سپاٹ بھی نہیں دیکھا۔“ وہ جونہی صوفے پہ قاسم انکل کے برابر آ کے بیٹھا علیشا کی رگ شرارت بھڑک اٹھی، ”سڑی بسی شکلیں“ سے اس کی مراد کون تھا اور کوئی سمجھے یا نہ سمجھے رواحہ بخوبی سمجھ گیا تھا، اسی لئے جلبلا کے پہلو بدلا تھا۔

”بھئی یہ تو بہت بڑی زیادتی ہے ہماری بیٹی کے ساتھ، چلو بھئی ایسا کرتے ہیں کہ آج ہی پروگرام بنا لیتے ہیں، اسی بہانے ہماری بھی آؤٹنگ ہو جائے گی، کیا خیال ہے تہمینہ؟“ آخر میں انہوں نے بیوی سے رائے لی۔

”بہت اچھا ہے میں تو خود سوچ رہی تھی کہ رواحہ سے کہوں کسی دن چھٹی کر کے علیشا کو گھمانے پھرانے ہی لے جائیں۔“ تہمینہ نے فوراً تائید کی اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی ان کی گاڑی کلفٹن کی طرف رواں دواں تھی۔

”تم شروع سے ہی ایسے ہو یا صرف میرے ساتھ ہی ایسا برتاؤ کرتے ہو۔“ ساحل کی ٹھنڈی نرم ریت پہ چلتے ہوئے وہ کب اس کے ہم قدم ہوئی اسے خود خبر نہیں ہوئی۔

”کیا مطلب...... کیسا ہوں میں؟ کیا میرے سر پہ سینگ اگے ہوئے ہیں؟“ وہ تنک کر بولا۔

”اگر پاگلوں کے سر پہ سینگ ہوتے تو آئی بلیو کہ تمہارے سر پہ بالوں سے زیادہ سینگ ہوتے۔“ وہ مسکرائی ہوئی اسے زہر سے بھی زیادہ بری لگی۔

”میرے سر پہ سینگ ہوں یا بال، تمہیں اس سے مطلب۔“ وہ سخت لہجے میں گویا ہوا۔

”مطلب نکلنے اور نکالنے میں کون سا دیر لگتی ہے۔“ چپ رہنا تو اس نے بھی نہیں سیکھا تھا۔

”شٹ اپ، مجھے فضول میں فری ہونے والی لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“ وہ دہاڑا، اس کی دہاڑ پر سہمنے کی بجائے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”اور مجھے فضول میں جلنے کڑھنے والے لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے۔“ ادھار رکھنے کی تو وہ بھی قائل نہ تھی۔

”تمہیں کیا اچھا لگتا ہے، کیا برا لگتا ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔“ تند خو لہجے میں کہتا وہ اس سے آگے بڑھ گیا۔

”بالکل...... اسی طرح مجھے بھی اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تمہیں فضول میں فری ہونے والی لڑکیاں بری لگتی ہیں یا چپ چاپ رہنے والی۔“ وہ ڈھیٹوں کی ملکہ اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

”تم آخر چاہتی کیا ہو؟“ وہ جیسے زچ ہو کے مڑا۔

”تمہیں تو بالکل بھی نہیں۔“ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی بات کو خود ہی انجوائے کرتی کھلکھلائی، رواحہ کا جی چاہا اسے اٹھا کر پانی میں پھینک دے، خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھتے ہوئے وہ سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

”بس...... اتنی جلد ہی ہار گئے؟“ علیشا نے گویا اس کی خامشی کا بھی مزہ لیا تھا۔

اسی وقت نورا سے آوازیں دینے لگی تو وہ ایک مسکراتی نگاہ اس پہ ڈال کر نور کی طرف بڑھ گئی، رواحہ نے بلا ٹل جانے پہ خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

☆☆☆

”بیٹا! تم ایسا کرو کہ گھر چلے جاؤ تمہاری ماما کا فون آیا ہے نور اور علیشا نے کچھ شاپنگ وغیرہ کرنی ہے۔“ رواحہ جو قاسم کے آفس کسی کام سے آیا تھا ان کی بات پہ بدک کے انہیں دیکھنے لگا۔

”لیکن بڑے پاپا! ابھی تو آفس میں بہت کام ہے، میں ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں، ساجد بخوبی یہاں کے ہر بازار سے واقف ہے۔“ علیشا کا تو نام سنتے ہی اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

”بیٹا! تمہاری ماما نے بطور خاص تمہارا نام لیا ہے اور ابھی آنے کی تاکید ہے لہٰذا تم جاؤ میں شکیل سے کہہ دیتا ہوں چند ایک ضروری کام وہ نمٹا دے گا باقی تم صبح آ کے دیکھ لینا۔“ انکار کی تو اب گنجائش ہی نہیں رہی تھی طوعا کرہا اسے اٹھنا ہی پڑا۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا، اس کی پسندیدہ کتابوں کا ڈھیر بڑی بے ترتیبی سے سینٹرل ٹیبل پہ لڑھک رہا تھا، کوئی کتاب الٹی دھری تھی تو کوئی سیدھی، کسی کے بیچ کو بری طرح فولڈ کیا گیا تھا تو کسی کے ٹائٹل کا حشر نشر ہوا تھا، اسے اپنی کتابیں اس قدر عزیز تھیں کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو چھونے تک نہیں دیتا تھا اور محترمہ علیشا بڑی شان سے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے مطالعے میں مصروف تھیں۔

”کس کی اجازت سے تم نے یہ کتابیں لی ہیں؟“ وہ اس کے سر پہ کھڑا پوچھ رہا تھا، علیشا نے چونک کے سر اٹھایا اور اس کے غصیلے چہرے پہ ایک نظر ڈال کے مسکرائی۔

”اس میں اجازت والی کون سی بات ہے میں نے کون سا ان کتابوں کو ساتھ لے جانا ہے، پڑھ کے واپس کر دوں گی۔“ وہ اپنے ازلی پرواہ انداز میں بولی۔

”پڑھنے کے لئے بھی مالک کی اجازت درکار ہوتی ہے۔“

”میرے سے یہ چونچلے نہیں ہوتے، جب پڑھ لوں گی تو As it is واپس رکھ آؤں گی۔“ ہاتھ میں پکڑی کتاب کو بند کر کے میز پہ رکھتے ہوئے وہ بھنویں اچکا کے بولی، جبکہ اس کے As it is کے الفاظ پہ رواحہ خاصا تلملایا تھا۔

”انہیں چونچلے نہیں ایٹی کیٹس اور مینرز کہتے ہیں۔“ وہ الفاظ چبا چبا کے بولا۔

”یہ سب فضولیات غیروں میں ہوتی ہیں اپنوں میں نہیں۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر ناک پر سے مکھی اڑائی۔

”تم سے تو بحث کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ غصے سے سر جھٹکتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اور پھر باقی رہی سہی کسر نے اس نے شاپنگ میں پوری کر ڈالی، اسے اتنا تھکایا اور اتنا زچ کیا کہ کئی بار رواحہ کا جی چاہا کاش وہ کوئی منتر پڑھ کے اسے یہیں کہیں کسی اسٹیچو میں تبدیل کر سکتا۔

”یہ آخری شاپ ہے جو بھی لینا ہے یہیں سے لے لو ورنہ میں واپس جا رہا ہوں بعد میں خود ہی کسی ٹیکسی سے آتی رہنا۔“ بالآخر اس کا ضبط جواب دے ہی گیا تھا، اس کی دھمکی کا علیشا پر تو مطلق اثر نہ ہوا تھا البتہ نور ضرور متاثر ہو گئی تھی اور پھر شاید نور نے ہی اس کی منت سماجت کی تھی جو وہ کچھ خریدنے پہ آمادہ ہو ہی گئی تھی۔

جب نہیں خریدا تھا تو کچھ بھی نہیں خریدا تھا اور جب خریدنے پہ آئی تو پھر خریدتی ہی چلی گئی، اس کے یوں دھڑا دھڑ شاپنگ کرنے پہ رواحہ کو اچھی خاصی کوفت ہوئی تھی۔

’’کیا بات ہے؟ پریشان ہو گئے ہو؟‘‘ اس کے کوفت زدہ انداز کو بھانپتے ہوئے وہ اس کے قریب چلی آئی۔

’’میں کیوں پریشان ہونے لگا، تم لے لو اگر مزید کچھ لینا ہے تو۔‘‘ خلاف توقع وہ بڑے تحمل سے بولا تھا۔

’’نہیں مجھے تو اور کچھ نہیں لینا مگر میں سوچ رہی تھی اگر تمہاری بیوی فضول خرچ نکلی تو تم کیا کرو گے۔‘‘ اس کی بات پہ رواحہ نے شرر بار نگاہوں سے گھورا تھا۔

’’میری بیوی فضول خرچ ہو یا قناعت پسند تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔‘‘ علیشا کا وار کامیاب گیا تھا وہ حسب عادت تڑخ کے بولا تھا۔

’’بڑے پوزیسو لگتے ہو اس معاملے میں، ویسے کہیں کوئی پسند تو نہیں کر رکھی؟‘‘ وہ یوں راز دارانہ لہجے میں پوچھ رہی تھی جیسے ان کے درمیان بڑی دوستی ہو۔

’’فکر نہ کرو، تم تو ہرگز نہیں ہو۔‘‘ اس کا انداز سراسر تمسخرانہ تھا، اب کی دفعہ سلگنے کی باری علیشا کی تھی۔

’’تم جیسا سڑیل انسان مجھے پسند کر بھی نہیں سکتا، ویسے فار یور کائنڈ انفارمیشن آئم آل ریڈی انگیجڈ۔‘‘ بڑے کروفر سے کہتی وہ تن فن کرتی اس کے سامنے سے ہٹی تھی اور رواحہ کو اپنے سر سے بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا، ورنہ جس طرح بڑی ماما اور نور اس کی واری صدقے جاتی تھیں رواحہ کو خدشہ تھا کہیں یہ عذاب مستقل ہی اس کے سر نہ تھوپ دیا جائے۔

رواحہ کا خیال تھا اب وہ اس کے منہ نہیں لگے گی مگر یہ اس کی خام خیالی ہی نکلی وہ پہلے کی طرح اب بھی اسے ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی اور پھر شاید رواحہ کی دعائیں رنگ لے ہی آئی تھیں، جو چند دن بعد ہی ہادی جو کہ علیشا کا بڑا بھائی تھا اسے لینے آ گیا، ہادی سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک تھا، رواحہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ علیشا جیسی اوٹ پٹانگ لڑکی اس کی بہن ہے البتہ ایک بات اس نے بطور خاص نوٹ کی تھی کہ دونوں بہن بھائی کی محبت دیدنی تھی، ان کے سب سے بڑے بھائی شیراز کی شادی تھی ہادی اسی لئے اسے لینے آیا تھا۔

’’آنٹی! اب رواحہ کی بھی شادی کر دیں، اکیلا انسان یونہی سٹھیا جاتا ہے۔‘‘ جاتے جاتے بھی وہ اس پہ چوٹ کرنا نہیں بھولی تھی۔

’’میں اکیلا نہیں ہوں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں۔‘‘ وہ لفظ فیملی پہ زور دے کر بولا۔

’’دیکھ لیں آنٹی! اسے فیملی بنانے کا کتنا شوق ہے۔‘‘ وہ الفاظ کو اپنے مطلب کے معانی پہناتے ہوئے ہنسی تھی، تہمینہ بھی مسکرا دیں، البتہ رواحہ کے اعصاب تن گئے۔

’’تمہیں تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتی رواحہ احمد! کیونکہ تمہیں میں نے بہت زیادہ تنگ کیا ہے، بہت ستایا ہے۔‘‘ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے جی بھر کے محظوظ ہوتے ہوئے وہ بڑے مزے سے گویا ہوئی۔

’’لیکن میں تمہیں بالکل بھی یاد رکھنا نہیں چاہتا۔‘‘ وہ تپ کے بولا تو وہ زور سے ہنس پڑی۔

’’یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون کس کو یاد رکھتا ہے۔‘‘ وہ آخری الوداعی نظر اس پہ ڈال کر ہادی کی طرف بڑھ گئی جو تہمینہ سے الوداعی کلمات کہہ رہا تھا۔

’’کتنا سونا سونا سا لگ رہا ہے گھر، علیشا کے بغیر، بڑی ہی زندہ دل بچی ہے، اگر اس کی بچپن سے ہی منگنی نہ ہوئی ہوتی تو میں ندرت سے اسے اپنے رواحہ کے لئے ہی مانگ لیتی۔‘‘ تہمینہ ان کے جانے کے بعد بڑی حسرت سے گویا ہوئیں اور اس کے منگنی شدہ ہونے پر رواحہ نے بے ساختہ ہی خدا کا شکر ادا کیا تھا جس نے اسے بہت بڑے عذاب سے بچا لیا تھا۔

☆☆☆

اور ابھی بھی علیشا کی آنکھوں میں اس کے لئے کوئی رنگ نہ تھا، شاید واقعی پچھلے واقعات اس کے ذہن سے محو ہو گئے تھے، اسے یہاں آئے ہوئے ہفتہ سے اوپر ہو چلا تھا لیکن اس کے مزاج میں بالکل بھی تبدیلی نہیں آئی تھی، رواحہ محسوس کر رہا تھا وہ سب ہی اسے چیئر اپ کرنے کی کوشش کرتے تھے کہیں کچھ ’’غلط‘‘ ضرور تھا جس سے سب واقف تھے ماسوائے اس کے اور اسے شاید اس لئے نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ تو علیشا کے نام سے بھی خار کھاتا تھا اس کی داستان کیسے سنتا؟ خود سے اس نے باتوں ہی باتوں میں بڑی ماما اور نور سے پوچھنے کی کوشش کی تو وہ دونوں ہی ٹال گئیں، اب حقیقت حال تو صرف علیشا ہی بتا سکتی تھی اور وہ اس سے کیا کسی سے بھی زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔

’’رواحہ! موسم تبدیل ہو رہا ہے بیٹا! نور نے کچھ شاپنگ کرنا تھی میں چاہ رہی تھی علیشا بھی موسم کی مناسبت سے کچھ کپڑے وغیرہ لے لے تم آج آفس سے ذرا جلدی آ جانا۔‘‘ صبح آفس کے لئے نکلنے سے پہلے بڑی ماما نے اس سے کہا تو اس نے بڑی سعادتمندی سے سر ہلا دیا تھا اور پھر واقعی وہ شام ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے ہی لوٹ آیا تھا۔

’’نہیں آنٹی! میرے پاس سب کچھ ہے، کسی چیز کی ضرورت نہیں، میں کیا شاپنگ کروں گی، آپ نور کو ہی بھیج دیں۔‘‘ تہمینہ نے اسے شاپنگ کا کہا تو اس نے فوراً ہی انکار کر دیا، وہ کسی بھی طرح ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔

’’کیوں ضرورت نہیں ہے، موسم تبدیل ہو رہا ہے اب تو سردی لگنے لگی ہے اور تم ابھی تک لان، کاٹن کے کپڑوں میں گھومتی رہتی ہو، سردیوں میں تو خریدنے کی ہزار چیزیں ہوتی ہیں۔‘‘ تہمینہ کی بجائے نور تیز لہجے میں بولی تھی، رواحہ خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا پھر اس کے ہزار نہ کرنے کے باوجود نور سے اسے اپنے ساتھ گھسیٹ ہی لیا تھا۔

’’علیشا! یہ کارڈیگن دیکھو، کتنا خوبصورت ہے، تم پہ بہت سوٹ کرے گا۔‘‘ نور نے ایک براؤن کلر کے اسٹائلش سے کارڈیگن کی طرف اشارہ کیا، کارڈیگن واقعی بہت خوبصورت تھا، علیشا نے بھی پسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا تھا، لیکن جیسے ہی اس کی نظر اس کی پرائز پہ پڑی، اس نے خاموشی اسے ہاتھ سے پرے کر دیا، تین چار ہزار تو علیشا کے لئے معمولی سی رقم ہوا کرتی تھی، اتنی رقم کی چیزیں تو وہ عام استعمال کے لئے خرید لیا کرتی تھی، مگر آج یہ بتیس سو کا کارڈیگن اسے اچھا خاصا مہنگا لگ رہا تھا۔

’’ارے بی بی! تم جو خون پسینے سے کمائی گئی رقم یوں چٹکیوں میں اڑا دیتی ہو کبھی خود کماؤ تو پتہ چلے، پھر تو ایک ایک پیسہ بھی سوچ سمجھ کر خرچ کرو گی، مگر یہ پیسہ تو تمہارے لئے حرام مال کی طرح ہے ہاتھ کی میل سمجھتی ہو ہونہہ، مال مفت دل بے رحم۔‘‘ کسی کی چنگھاڑتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو وہ جیسے خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

’’کیوں؟ کیا ہوا...... پسند نہیں آیا؟‘‘ اسے آگے بڑھتا دیکھ کر نور نے متعجب ہو کر پوچھا۔

’’ہوں...... کچھ خاص نہیں۔‘‘ مدہم لہجے میں کہتی وہ یونہی اور چیزوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

رواحہ جو اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا فوراً ہی وہ کارڈیگن خرید ڈالا، پھر جتنی بھی شاپنگ کی نور نے ہی کی، علیشا کے لئے سب کچھ اس نے ہی خریدا تھا، اگرچہ علیشا اس کے لئے کسی طور نہیں مان رہی تھی۔

"تو تم مجھے بھی غیر ہی سمجھتی ہو؟ تمہارے نزدیک میں بھی اس جاہل عورت کی طرح ہوں، میں تمہیں بات بات پہ طعنے دوں گی، احسان جتلائے گی۔" اس کی ہر بات کے جواب میں انکار سن کر نور تڑخ کے بولی۔

"یہ بات نہیں ہے نور! تم میرے لئے کیا ہو میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔" علیشا اس کی بات پر تڑپ کر اس کی طرف مڑی۔

"لیکن زندگی کا برتاؤ میرے ساتھ کچھ یوں بدلا ہے کہ میں فی الحال خود کو بھی سمجھنے سے قاصر ہوں، اگر تمہیں میری کوئی بات بری لگی تو آئم سوری۔" اس کے ہاتھ تھام کر وہ نم پلکوں سمیت بولی، رواحہ جو کہ ان کے قریب کھڑا تھا، بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس لڑکی کے سارے دکھ اپنے ہاتھوں سے اپنے کھاتے میں ڈال لے اور کوئی ایسی بات کر دے کہ یہ نم آنکھیں پہلے کی طرح کھلکھلا اٹھیں۔

"کیسی سوری علیشا؟ میں ہی کچھ جذباتی ہو گئی تھی، سوری تو مجھے کہنا چاہیے۔" نور کے لہجے میں قدرے شرمساری کا تاثر تھا۔

"چلو آؤ، کچھ ماما کے لئے بھی خرید لیں ورنہ ماما کیا سوچیں گی کیسی بیٹیاں ہیں اپنی ہی شاپنگ کر کے واپس آ گئی ہیں ماں کا ذرا خیال نہیں کیا۔" اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے نور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے آگے کی طرف بڑھ گئی۔

جبکہ رواحہ ایک مرتبہ پھر مختلف سوچوں میں گھرا وہیں کھڑا رہ گیا، اس کا دل علیشا کے بارے میں اتنا پریشان کیوں رہتا تھا اسے خود علم نہیں تھا۔

☆☆☆

"انکل! میں جاب کرنا چاہتی ہوں، آپ کی اجازت درکار ہے۔" صبح ناشتے کی ٹیبل پہ وہ سب بڑے خوشگوار موڈ میں ناشتہ کر رہے تھے جب علیشا کی بات پر ایک لمحے کے لئے ڈائننگ روم میں سکوت چھا گیا نور نے بھی حیران ہو کے اسے دیکھا تھا ایسا کوئی ارادہ اس نے ظاہر تو نہیں کیا تھا۔

"کیوں بیٹا! کوئی مسئلہ ہے یہاں؟" قاسم صاحب نے نہایت مشفقانہ لہجے میں دریافت کیا تھا۔

"نہیں انکل! مسئلہ تو کوئی نہیں، میں ویسے ہی گھر میں بیٹھی بور ہو جاتی ہوں، فارغ ہی ہوتی ہوں تو میں نے سوچا کہ کوئی جاب ہی کر لوں۔" وہ فوراً وضاحتی انداز میں بولی۔

"اگر اپنا دھیان بٹانا ہی چاہتی ہو تو پھر بہتر ہے کہ آگے پڑھائی شروع کر لو، جاب تو ویسے بھی ایک ٹینشن ہے نری خواری اور سر درد۔" اب کی دفعہ تہمینہ نے کہا۔

"لیکن آنٹی! شاید میں فی الحال پڑھائی کو پوری توجہ نہ دے پاؤں، میں کہہ رہی تھی کہ اگر کوئی جاب وغیرہ کر لوں تو ایک اچھی مصروفیت مل جائے گی۔" اسٹڈی شروع کر کے وہ ان لوگوں پہ مزید کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی بلکہ وہ تو یہ چاہ رہی تھی کہ اپنا خرچ بھی آپ اٹھائے اور کچھ رقم ماما کو بھی بھیج دیا کرے، خدا جانے وہ اپنا گزارا کس طرح کر رہی ہوں گی۔

"ہونہہ۔" قاسم صاحب نے پرسوچ انداز میں ہنکارا ابھرا تھا۔

"تو بیٹا! آپ کی نظر میں کوئی جاب ہے؟" ان کا یہ سوال اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ انہوں نے اس کی رائے سے اتفاق کر لیا ہے۔

"پاپا! اس کی نظر میں جاب کہاں سے آ گئی وہ سیکنڈ ٹائم تو کراچی آئی ہے اور ویسے بھی ہم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے، یہ کام تو اب آپ کو ہی کرنا پڑے گا۔" اس کی بجائے نور نے صرف جواب دیا تھا بلکہ یہ ذمہ داری بھی ان کے کندھوں پہ ڈال دی تھی، علیشا جس فیز سے گزر رہی تھی وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہے پھر وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ علیشا پہلے کی طرح زندگی کی طرف لوٹ آئے وہ اسے اس کا اعتماد واپس دلانا چاہتی تھی اور اس کے خیال میں اس معاملے میں جاب اس کی معاون ثابت ہو گی جب وہ مختلف لوگوں کو جان پرکھ سکے گی۔

"بیٹا! یہ چیف ایگزیکٹو تو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اس سے پوچھو کہ تمہارے آفس میں کوئی ویکنسی ہے؟" انہوں نے رواحہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے اگر رواحہ کے آفس کوئی ویکنسی مل سکتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ویٹ کرو، جب کوئی سیٹ ہو گی تو رواحہ بلا لے گا، میں بچی کو باہر بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتی۔" تہمینہ نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

"کیوں رواحہ! تمہارے آفس میں کوئی جگہ ہے۔" نور اب اس کی طرف متوجہ ہوئی، کیونکہ وہ جانتی تھی علیشا خود تو براہ راست اس سے پوچھے گی نہیں

"آپ کی کوالیفیکشن کیا ہے؟" رواحہ نے براہ راست اسے مخاطب کر کے پوچھا۔

"بی سی ایس۔" اس نے جواب دیا۔

"کوئی شارٹ کورس، ڈپلومہ، کوئی تجربہ وغیرہ ہے آپ کے پاس۔" وہ خالص پروفیشنل لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے۔" اس نے گہری سانس بھری پھر قاسم صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"مس ثمن کی شادی ہونے والی ہے وہ آج کل میں ریزائن دے رہی ہیں تو ثاقب کو ایک کمپیوٹر اسٹنٹ کی ضرورت ہو گی آئی تھنک کہ مس علیشا کو پھر وہاں اپائنٹ کر لیا جائے، ثاقب انہیں اسٹ کرے گا۔"

"اوکے ٹھیک ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا، علیشا میری بیٹی ہے تم باقی ورکرز کی طرح نہ تو اس پہ غصہ نکال سکتے ہو اور نہ ہی رعب و دبدبہ ڈال سکتے ہو۔" انہوں نے علیشا کے کندھے پہ شفقت بھری تھپکی دیتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں اسے دھمکایا تھا۔

"رولز تو رولز ہیں ناں بڑے پاپا! اگر یہ رولز اینڈ ریگولیشنز کو فالو کریں گی تو کوئی بھی آفیسر انہیں کچھ نہیں کہہ سکے گا۔" اس نے ایک سنجیدہ سی نظر اس پہ ڈالتے ہوئے کہا تھا جو سپاٹ چہرہ لئے چائے کے چھوٹے سیپ لے رہی تھی۔

"یہ تو مجھے پوری امید ہے کہ تمہیں میری بیٹی سے ایسی کوئی شکایت نہیں ملے گی، کیوں بیٹا!" انہوں نے آخر میں تائید طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"جی...... انشاء اللہ۔" وہ یونہی نظریں جھکائے ہوئے بولی تھی۔

"چلیں بس کریں آپ لوگ تو یہیں آفس کھول کے بیٹھ گئے ہیں۔" تہمینہ نے اکتاہٹ بھرے انداز میں ان دونوں کو ٹوکا تھا۔

"شکر ہے یہاں آفس نہیں کھل سکتا ورنہ آپ تو ہمیں کوئی کام نہ کرنے دیں۔" وہ

مسکرائے اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔

انہیں کھڑے ہوتا دیکھ کر تہمینہ ان کا بریف کیس لینے چلی گئیں، رواحہ بھی رسٹ واچ پہ نظر دوڑاتا کھڑا ہوگیا تھا، نور اٹھ کے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگ گئی تو علیشا بھی اس کی ہیلپ کو کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

بہت امید رکھنا اور پھر بے آس ہونا بھی
بشر کو مار دیتا ہے بہت حساس ہونا بھی
سنو اک کان سے اور دوسرے سے پھینک دو باہر
بہت تکلیف دہ ہے صاحب احساس ہونا بھی
یونہی تو ابر رحمت کی طلب کرتا نہیں کوئی
ضروری ہے مقدر میں ذرا سی پیاس ہونا بھی
بہت سے قلب رک جاتے ہیں خوشیوں کی خبر پاکر
ہمیں تو خوب جچتا ہے غموں کا راس ہونا بھی

ہر طرف بلا کی سردی تھی گہری دھند نے ہر چیز کو اپنی سرد لپیٹ میں لے رکھا تھا، سخت سردی کے باعث ہر چیز ہی ٹھٹھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ بھی ایک مجسمہ ہوتی، برف کا مجسمہ، یا پھر پتھر کا تراشا ہوا مجسمہ، جو زمانے کے سرد و گرم سے بے نیاز ہوتا ہے، کسی کا خشک روکھا پھیکا اور تذلیل بھرا رویہ اس پہ اثر انداز نہیں ہوتا، کوئی پیار سے اسے چھوئے یا ایک حقارت بھری نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جائے وہ سب سے بے نیاز اپنی جگہ اپنے مقام پہ ایستادہ رہتا ہے، اس کے کوئی جذبات، کوئی احساسات نہیں ہوتے۔

کل شام آفس سے واپسی پر رواحہ نے ان سے کہا تھا کہ وہ کل آفس جانے کے لئے تیار رہے، نور نے رات ہی اس کے کپڑے پریس کر ڈالے تھے اور اب بھی صبح سے وہ اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی، جبکہ علیشا کا ذہن پچھلے ماہ و سال میں گھوم رہا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ آئی سی ایس کے ایگزمز سے فارغ ہوئی تھی تو اس کی کلاس فیلو عفرا نے اس سے کہا تھا۔

”یار! ابھی تو رزلٹ آنے میں ٹائم پڑا ہے کیوں نہ اس دوران کوئی چھوٹی موٹی جاب کرلی جائے وقت بھی گزر جائے گا اور ایک مشغلہ بھی ہاتھ آجائے گا۔“

”یہی وقت تو گھومنے پھرنے اور انجوائے کرنے کا ہے مائی ڈیئر فرینڈ شاید تم جانتی نہیں کہ مابدولت دنیا میں صرف راج کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، دم چھلا بن کے کسی کی جی حضوری کرنا یہ میرے بس کی بات نہیں نو...... نیور۔“ گردن اکڑاتے ہوئے اس نے خاصی شان بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا علیشا! کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔“ اس کی بے نیازی پہ عفرا نے اسے آنکھیں نکالتے ہوئے تنبیہ کی تھی۔

”مجھے وقت کی کیا فکر، وہ شارق ہے ناں، وہ کس دن کام آئے گا۔“ اس کے لبوں کے گوشوں میں بڑی خوبصورت مسکان مچلی تھی اور آنکھیں جگر جگر کرنے لگی تھیں۔

شارق کا ذکر یونہی اس کا موڈ خوشگوار کر دیا کرتا تھا جو اس کے لئے ایک خوبصورت احساس تھا، دونوں کی نسبت طے تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

”ہاں...... تم واقعی بہت خوش بخت ہو۔“ عفرا نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

وہ دو بھائیوں کی لاڈلی، اکلوتی بہن تھی، باپ بچپن میں وفات پا گیا تھا لیکن بھائیوں نے کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی، بڑا

بھائی باپ کی طرح مشفق تھا تو چھوٹا کسی بہترین دوست جیسا، ماں اس کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ پکی سہیلی بھی تھی اور پھر شارق تھا جو اس کا منگیتر تھا، ہر لحاظ سے مکمل اور خوشحال فیملی سے تعلق رکھنے والا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ علیشا کو بہت چاہتا تھا، نہ چاہنے والی بات ہی نہیں تھی اس میں۔

”میں خوش بخت نہیں، علیشا ہوں علیشا فرحان۔“ اس نے اس کی بات ہنسی میں اڑائی۔

اور آج تقدیر اس پہ مسکرا رہی تھی شاید اس وقت بھی اس کی باتوں پہ مسکراتی ہو اور کتنا صحیح کہتی تھی عفرا کہ۔

”وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔“

وقت واقعی بہت بدل جاتا ہے اور کتنی جلدی بدل جاتا ہے ہماری توقع سے بڑھ کر جلد اور تیز رفتاری کے ساتھ پیچھے انسان رہ جاتا ہے اس کی گرد دیکھنے کو۔

”چلو یار! پاپا کہہ رہے ہیں کہ علیشا سے کہو جلدی آئے رواحہ تیار ہے۔“ وہ اپنی ہی سوچوں کے گرداب میں پھنسی تھی جب نور اونچی آواز سے اسے پکارتی اندر داخل ہوئی۔

”تو......؟“ علیشا نے سمجھ نہ آنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

”تو یہ کہ رواحہ کے ساتھ جاؤ گی ناں۔“ نور نے جیسے اس کی کند ذہنی پہ افسوس کیا۔

”ان کو تکلیف ضرور دینی ہے میں وین سے چلی جاؤں گی۔“ وہ مضطربانہ انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

وہ اپنا بوجھ خود اٹھانے کے لئے تو یہ قدم اٹھا رہی تھی اور یہاں بھی وہ لوگ اس پر احسان کرنے پہ تلے ہوئے تھے۔

”تم وین سے نہیں رواحہ کے ساتھ جاؤ گی اینڈ یو نو ماما اور پاپا کبھی اس پہ ایگری نہیں ہوں گے بی کاز ہماری فیملی میں لڑکیاں لوکل ٹرانسپورٹ پر ٹریول نہیں کرتیں۔“ نور کے حتمی لہجے نے اسے اچھی طرح باور کروا دیا تھا کہ کم از کم یہ والی بات تو اس کی ہرگز نہیں مانی جائے گی۔

”اوکے۔“ اس نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔

”شاباش...... گڈ گرل اور سنو، آفس میں زیادہ ڈرنے سہمنے کی ضرورت نہیں ہے، پورے دھڑلے سے وہاں کام کرنا تم کوئی عام ورکر نہیں ہو، نور کی کزن ہو، جس کے ایک اشارے پہ تخت سے تختہ ہو سکتا ہے، جب تک یہ تگڑی سفارش تمہارے پاس موجود ہے تمہیں کوئی نہیں دبا سکتا۔“ اس نے سینہ تان کے بڑے بھڑکیلے انداز میں اسے جوش دلانا چاہا تھا۔

”تھینک یو۔“ وہ اس کا دل رکھنے کو ہلکے سے مسکرائی تو نور اسی میں خوش ہوگئی اور پھر وہ دونوں آگے پیچھے ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں جہاں سے ناشتے کے بعد اس نے رواحہ کے ساتھ اس کے آفس جانا تھا۔

☆☆☆

آفس نہایت شاندار تھا وہ رواحہ کے ساتھ ہی آفس میں داخل ہوئی تھی جس پہ کئی سوالیہ اور متعجب نظروں نے آخر تک ان کا پیچھا کیا تھا، رواحہ خود اگر وقت کا پابند تھا تو اس کا سٹاف بھی اس بات کا خوب خیال رکھتا تھا کیونکہ جس وقت وہ اس کے ہمراہ اندر داخل ہوئی تو ہر ممبر اپنی چیئر سنبھالے کام میں مگن نظر آیا، سوائے ایک ٹیبل کے جو خالی پڑی تھی اور سامنے دھرا کمپیوٹر بھی آف تھا۔

”شاید یہی مس ثمن کی سیٹ تھی جو اب مجھے ملنے والی ہے۔“ اس نے دل میں قیاس لگایا۔

کئی لڑکے لڑکیوں نے اسے سلام کیا تھا جس کا شائستگی و متانت سے جواب دیتے ہوئے وہ اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''بیٹھیے۔'' اندر داخل ہو کر اس نے اپنی ٹیبل کے سامنے والی چیئر پہ اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔

بغیر کچھ کہے وہ خاموشی سے چیئر گھسیٹ کے بیٹھ گئی، جھکی ہوئی نگاہیں اپنے ہاتھوں پہ مرکوز کیے وہ اردگرد سے قطعی بے نیاز اس کے سامنے بیٹھی تھی، وائٹ اور بلیک امتزاج کا بڑا سا اسکارف اچھی طریقے سے لپیٹے، بڑا سا دوپٹہ سلیقے سے کندھوں پہ پھیلائے اس کی شخصیت سنجیدہ اور کم گو ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے سوگواریت کی عکاسی بھی کر رہی تھی، چھوٹی سی ستوان ناک شدید سردی کے باعث سرخ ہو رہی تھی لب یوں باہم ایک دوسرے میں پیوست تھے گویا صدیوں تک وا ہونے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔

''ثاقب صاحب! آپ ذرا اندر آیئے۔'' انٹر کام اٹھاتے ہوئے اس نے کہا اور اگلے ہی چند لمحوں کے بعد اس کے دروازے پہ دستک ہو رہی تھی۔

''یس کم آن۔'' وہ دراز سے کوئی فائل نکال رہا تھا۔

''آؤ ثاقب بیٹھو۔''

''تھینک یو سر!'' وہ علیشا کے برابر والی چیئر گھسیٹ کے بیٹھ گیا۔

''ثاقب! یہ مس علیشا فرحان ہیں آپ کی نئی کمپیوٹر اسسٹنٹ اور مس علیشا یہ ثاقب سجانی ہیں ہمارے کمپیوٹر ڈائریکٹر، آج سے یہ آپ کو اسسٹ کریں گے۔'' اس نے خالص پروفیشنل انداز میں دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا تھا۔

ثاقب نے نہایت شائستہ لہجے میں اسے سلام کیا تھا، ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائے ہوئے اس نے جواب دیا تھا اور دوبارہ سے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

''اگرچہ مس علیشا آج سے مس ثمن کی سیٹ سنبھال رہی ہیں لیکن چونکہ یہ ابھی ناتجربہ کار ہیں اس لئے ثاقب پہلے تو آپ کو انہیں ان کا کام سمجھانا پڑے گا پھر اسے چیک کرنے کے بعد فائنل ٹچ دینا ہوگا، اس لئے جب تک مس علیشا اپنے ورک میں ایکسپرٹ نہیں ہو جاتیں آپ کا برڈن بڑھ جائے گا ایسے میں آپ چاہیں تو حسن کو اپنا معاون بنا سکتے ہیں میں انہیں بریف کر دوں گا۔'' وہ ثاقب سے مخاطب تھا۔

''نو پرابلم سر! میں کور کر لوں گا۔'' ثاقب نے کہا۔

''اوکے ویسے مجھے امید ہے کہ مس علیشا جلد تمام کام کو سمجھ لیں گی۔'' اس نے ایک علیشا پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی انشاء اللہ۔'' آہستگی سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس نے گویا اسے یقین دہانی کروائی تھی۔

''ٹھیک ہے ثاقب! آپ پھر آج سے ہی اسٹارٹ لے لیں۔'' اس نے ثاقب سے کہا پھر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''آپ یہاں ایزی ہو کر کام کر سکتی ہیں مس علیشا! اور اگر آپ کو کسی بھی قسم کی کوئی پرابلم ہو کسی آفیسر کسی ورکر سے کوئی شکایت ہو تو آپ بلا جھجک مجھ سے بات کر سکتی ہیں۔''

''جی۔'' اس نے ایک دفعہ پھر سر اثبات میں ہلا کر فقط جی کہنے پر اکتفا کیا تھا۔

''اوکے اب آپ دونوں کام شروع کر سکتے ہیں۔'' اس نے اپنے سامنے پڑی فائل کھول لی، گویا ان دونوں کے وہاں سے جانے کا واضح اشارہ تھا۔

''تھینک یو سر! آیئے مس علیشا۔'' وہ کھڑا ہوا تو علیشا بھی ساتھ کھڑی ہو گئی اور اس کے ہمراہ آفس سے نکل آئی۔

ثاقب نے پہلے سب سے اس کا تعارف کروایا تھا اور پھر وہ خالی سیٹ جو مس ثمن کی تھی اس کے پاس اسے لے آیا، علیشا کا قیاس ٹھیک نکلا تھا یہی سیٹ اسے ملی تھی۔

''آپ کی کوالیفکیشن کیا ہے تاکہ میں اسی لیول سے کام کا آغاز کر سکوں۔'' اس کی ٹیبل کے دائیں طرف رکھی چیئر پہ بیٹھتے ہوئے اس نے دریافت کیا تھا۔

''بی سی ایس۔'' وہ اسی سنجیدگی سے بولی۔

''گڈ، اس مین آپ جلد سیکھ لیں گی، ویسے آپ کو ٹائپنگ تو آتی ہو گی۔'' وہ بڑے نرم دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''جی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوکے میں آپ کو ٹائپ رائٹر اور ایک لیٹر بھجوا رہا ہوں، آپ اسے ٹائپ کر کے مجھے دکھائیں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پیون اسے ٹائپ رائٹر اور لیٹر دے گیا تو وہ خاموشی سے اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

''ارے...... یہ مس ثمن شادی کے بعد اتنی دبلی پتلی اور خوبصورت کیسے ہو گئیں۔'' اسے بالکل اپنے قریب حیرت میں ڈوبی تجسس آواز سنائی دی تو وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔

سامنے ستائیس اٹھائیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان متحیر آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا، علیشا جز بز ہو کے رہ گئی۔

''بیوقوف! یہ مس ثمن نہیں مس علیشا ہیں، اس فرم کی نئی کمپیوٹر اسسٹنٹ۔'' اس کے دائیں طرف والے ٹیبل پہ بیٹھی مس عظمیٰ گیلانی نے ہنستے ہوئے اس کی غلط فہمی کو دور کیا تھا۔

''ہک ہا...... میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید شادی کے بعد ہر انسان اتنا ہی خوبصورت ہو جاتا ہے، تو کیوں نہ میں بھی شادی کروا لوں۔'' اس نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا اور علیشا کے سامنے دھری چیئر پہ ہی بیٹھ گیا، علیشا کے ماتھے پہ ناگواری کی شکن نمودار ہوئی تھی۔

''میرا نام عمران ہے اور میں اکاؤنٹنٹ منیجر ہوں۔'' اس نے خود ہی اپنا تعارف کروایا تھا۔

''یہ صرف اکاؤنٹنٹ ہے منیجر کا اضافہ اس نے از خود کیا ہے۔'' مس عظمیٰ نے ہنستے ہوئے اس کا بھانڈا پھوڑا تھا، جواباً اس نے سخت ناراض نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''آپ کیوں ہر وقت میری ویلیو ڈاؤن کرنے پہ تلی رہتی ہیں۔'' علیشا سر جھٹک کر دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

''ہیں...... میں یعنی کہ عمران حیدر، پورے چھ فٹ کا بندہ آپ سے مخاطب ہے اور آپ اپنے کام میں منہمک ہو گئی ہیں۔'' اس کے تنے ہوئے ابرو اور ماتھے پہ ابھری شکنوں کی قطعی پرواہ کیے بغیر وہ پھر اس سے مخاطب ہوا۔

''سوری...... آئم بزی۔'' وہ ایک پل کو ہاتھ روک کے متانت سے بولی اور اگلے پل پھر ٹائپنگ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''اچھا جی!'' وہ خاصا مایوس ہو کے اٹھا تھا۔

بڑے بے آبرو ہو کے تیرے کوچے سے ہم نکلے

ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے وہ اپنی سیٹ کی طرف بڑھا تو مس عظمیٰ بھی اس کی حالت پہ مسکراتے ہوئے کمپیوٹر آن کرنے لگیں۔

بریک ٹائم میں جب لنچ کا ٹائم ہوا تو پیون نے آ کر اس سے پوچھا تھا۔

"بی بی جی! سر پوچھ رہے ہیں کہ آپ کے لئے کھانا بھیجوں۔"

"نہیں شکریہ، ان سے کہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

مس عظمیٰ خود ہی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی تھیں، وہ ایک شادی شدہ ایجڈ خاتون تھیں اور یہاں کام کرتے ہوئے انہیں آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا، تجربہ کار ہونے کے ناطے وہ سب کو مفید مشوروں سے نوازتی رہتی تھیں، اسی وجہ سے سارا اسٹاف ان کی بہت عزت کرتا تھا، ان کی نرم طبیعت کے باعث علیشا کو بھی ان سے مل کر اچھا لگا تھا۔

"اتنی پریٹی گرل پہ اتنی سنجیدگی اچھی نہیں لگتی، تھوڑا ہنسا بولا کرو۔" وہ ہولے سے اس کا گال تھپتھپا کے بولیں۔

"میرے ہنسنے بولنے نے ہی تو یہ دن دکھلائے ہیں مجھے۔" اس کا اندر کرلانے لگا تھا، بریک کے بعد وہ خاموشی سے اپنی سیٹ پہ آن بیٹھی تھی۔

☆☆☆

اسے یہاں آئے ہوئے ہفتہ سے اوپر ہو چلا تھا کافی حد تک وہ سب کے مزاج کو سمجھ گئی تھی، لیکن وہ زیادہ تر اپنے کام سے ہی کام رکھتی تھی بہت کم کسی سے مخاطب ہوتی تھی، اس کا اپنا انداز لئے دیئے رہنے والا ہی تھا، اسی لئے سب اس کی طرف سے محتاط تھے، کچھ وہ رواحہ کے ساتھ آئی تھی اس کا بھی سٹاف پر رعب تھا، لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے پوچھ لے۔

البتہ اپنے کام کے ساتھ وہ بالکل مخلص تھی، اس کے کام کی وجہ سے کسی کو اس سے شکایت نہیں تھی، ثاقب اکثر و بیشتر ہی اس کے کام کی تعریف کر کے اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا، وہ اس کی توقع سے بڑھ کر ٹیلنیٹڈ نکلی تھی۔

حسب معمول لنچ آورز میں پیون اس سے کھانے کا پوچھنے آیا تھا، اس نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا تھا، آج اس کا ارادہ تھا ماما کو فون کرنے کا، کیونکہ پچھلے کافی دنوں سے ماما کا کوئی فون نہیں آیا تھا، اسے ہادی کی خیر خیریت بھی پتہ نہیں چلی تھی۔

صبح رواحہ نے اسے کسی کام کے لئے طلب کیا تو اس نے بہت جھجکتے ہوئے اس سے دریافت کیا تھا۔

"سر کیا...... میں آفس کے فون سے ایک کال کر سکتی ہوں آؤٹ آف سٹی۔" کتنا مشکل ہوتا ہے کسی سے کچھ مانگنا، اگرچہ وہ اجازت ہی کیوں نہ ہو، اس کی پیشانی ایک جملے میں ہی عرق آلود ہو گئی تھی اور ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں۔

"یس...... وائے ناٹ...... آپ جب چاہیں جہاں چاہیں کال کر سکتی ہیں میری طرف سے آپ کو کھلی پرمیشن ہے۔" رواحہ نے بڑے کھلے دل سے اسے اجازت دی تھی۔

نجانے کیا بات تھی لیکن اسے اپنے دل کے ایک حصے میں ایک انجانا سا دکھ محسوس ہوا تھا، وہ علیشا جو بڑے آرام سے کبھی اس کی ساری لائبریری کو تہس نہس کر کے بغیر اجازت کتابوں کا بیڑہ غرق کر آئی تھی، آج فقط ایک فون کال کے لئے کتنی بے بسی سے اس کی اجازت مانگ رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اس خواہش نے دل میں انگڑائی لی تھی کہ وہ اس سے اس کے حالات کے متعلق پوچھے، اس حد تک تبدیلی کی وجہ جانے، لیکن ایک مرتبہ پھر اس نے اپنی خواہش کو دبا لیا تھا، کیونکہ فی الحال وہ ایسا کوئی حق نہیں رکھتا تھا۔

"تھینک یو۔" ممنون لہجے میں کہتی وہ اٹھ کر جا چکی تھی۔

ایک بار، دو بار، سہ بار، بار بار ٹرائی کے باوجود نمبر مل کے نہیں دیا، ہر دفعہ رابطہ نمبر بند ہی ملا، ریسور، کریڈل پر ڈالتے ہوئے وہ از حد پریشان ہو چکی تھی۔

"پتہ نہیں فون ڈیڈ ہو گیا ہے یا کسی نے پلگ ہی نکال کے پھینک دیا ہے۔" وہ اضطراری انداز میں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگی۔

"اب کیسے رابطہ ہو سکتا ہے ماما سے؟" وہ پریشانی سے سوچنے لگی۔

"سیل فون بھی تو نہیں ہے ناں، اب ان کے پاس۔" اس کی پریشانی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

"فاطمہ بھابھی!" ایکدم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

فاطمہ ان کی پڑوسن تھیں علیشا کی ان سے کافی اچھی علیک سلیک تھی کئی دفعہ مشکل وقت میں علیشا نے ان کا ساتھ دیا تھا، فاطمہ اس کی بہت عزت کرتی تھیں، شکر تھا کہ اس کے ذہن میں ان کا نمبر یاد رہ گیا تھا، اس نے لپک کر ریسور اٹھایا اور تیزی سے نمبر پریس کرنے لگی۔

"السلام علیکم!" اس کی توقع کے مطابق فون فاطمہ بھابھی نے ہی ریسو کیا تھا۔

"وعلیکم السلام بھابھی! میں علیشا بات کر رہی ہوں۔"

"کیسی ہو علیشا! بھئی کہاں گم ہو گئی ہو تم، میں کئی دفعہ ندرت آنٹی سے تمہارا پوچھ چکی ہوں، کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے تمہاری آواز سن کے۔"

دوسری طرف سے ان کی پرجوش سی آواز سنائی دی تھی، وہ ایک ہی سانس میں بولے گئیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور کہیں گم نہیں ہوئی، اسی دنیا میں ہوں اچھا بھابھی مجھے ماما سے بات کرنی ہے گھر کا نمبر نہیں مل رہا، میں ذرا جلدی میں ہوں، کیا آپ ان سے میری بات کروا سکتی ہیں۔" وہ فوراً مطلب کی بات پر اتر آئی۔

اگر رواحہ نے اسے اجازت دے دی تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ شروع ہی ہو جاتی اور آئندہ اس رعایت سے بھی جاتی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں تم پانچ منٹ بعد فون کر لینا میں بلا لاتی ہوں بچے تو اسکول گئے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"او کے ٹھیک ہے، شکریہ۔" اس نے تشکر بھری سانس خارج کرتے ہوئے ریسور رکھا اور دل میں دعا کرنے لگی کہ ماما گھر پہ ہی ہوں۔

پانچ منٹ بعد اس نے دوبارہ نمبر پریس کیے، اس دفعہ فون ماما نے ہی اٹھایا تھا۔

"کیسی ہیں ماما؟" ماما کی آواز سنتے ہی اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

وہ جو کبھی ماما کے بغیر ایک منٹ نہیں رہتی تھی، آج کتنے دن بعد ان کی آواز سن رہی تھی اور شکل تو پتہ نہیں کب دیکھنا نصیب ہونا تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم کیسی ہو؟" دوسری طرف ماما کی حالت بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھی۔

"میں بھی ٹھیک ہوں، گھر کا نمبر کیوں نہیں مل رہا، میں آدھے گھنٹے سے ٹرائی کر رہی ہوں۔" اس نے جلد خود کو سنبھال لیا تھا۔

"بیٹا! لینڈ لائن تو کافی دن ہوئے شیراز نے کٹوا دیا ہے۔" ان کا کرب میں بھیگا لہجہ سنائی دیا۔

’’کٹوا دیا؟ کیوں؟‘‘ اس نے ازحد حیرانی سے دریافت کیا۔

’’بس بیٹا! شاید بل وغیرہ کا کوئی مسئلہ تھا، تم سناؤ، طبیعت ٹھیک ہے تمہاری، گھر میں سب کیسے ہیں؟‘‘ انہوں نے بات کا رخ بدل دیا۔

’’لیکن ماما! ہادی نے بھی تو رابطہ کیا ہوگا، وہ وہاں بیٹھا کتنا پریشان ہو رہا ہوگا، آج مجھے کوئی کم پریشانی اٹھانی پڑی ہے، وہ تو شکر ہے کہ فاطمہ بھابھی کا نمبر میرے ذہن میں تھا۔‘‘ اس کا لہجہ بے بسی کی گہری تڑپ لئے ہوئے تھا، کاش اسے کاش وہ کچھ کر سکتی، کچھ تو ہوتا اس کے اختیار میں۔

’’آیا تھا ہادی کا فون بھی، اسی نمبر پہ ٹھیک ہے وہ بھی تمہیں سلام دعا دے رہا تھا۔‘‘ انہوں نے ہادی کی خیر خیریت اس تک پہنچائی، علیشا کا دل دکھ سے بھر گیا۔

کتنے وقار اور تمکنت سے ان کی ماما نے ساری زندگی گزاری تھی اور اب اس بڑھاپے میں انہیں یوں ذلیل و خوار ہونا پڑ رہا تھا، ایک فون کال کے لئے وہ دوسروں کی محتاج ہو گئی تھیں۔

’’گھر میں سب ٹھیک ہیں تہمینہ کیسی ہے؟‘‘ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے خود ہی ادھر ادھر کی باتیں شروع کر لیں۔

’’جی ہاں سب ٹھیک ہیں اور بہت اچھے ہیں۔‘‘ اس نے گہرا سانس کھینچا اور پھر اصل بات کی طرف آ گئی جس کے لئے اس نے فون کیا تھا۔

’’ماما! میں نے جاب کر لی ہے۔‘‘ یہ جملہ ادا کرتے وقت وہ کس کرب سے گزری تھی یہ صرف وہی جانتی تھی یا اسے جنم دینے والی ماں۔

’’کہاں؟‘‘ وہ متفکر ہو گئیں۔

’’یہیں قاسم انکل کے آفس میں، وہ لوگ تو بہت اچھے ہیں مجھے آگے پڑھنے کا کہہ رہے تھے، لیکن میرا دل نہیں مانا، کہ مزید کسی پہ بوجھ بنوں، میں نے ٹھیک کیا ناں ماما؟‘‘ ایک تو ہستی تھی جس سے وہ اپنے دل کی ہر بات بلا خوف وہ جھجک کہہ سکتی تھی، بغیر کسی عار کے۔

’’ہاں شاید۔‘‘ وہ مبہم سا بولیں۔

’’چلو اس طرح تمہارا تو دھیان تو بٹا رہے گا۔‘‘ پتہ نہیں انہوں نے کس کو تسلی دی تھی اسے یا خود کو۔

’’آپ دعا کریں ہادی اچھی طرح سیٹل ہو جائے، بس پھر ہم لوگ بھی یو کے چلے جائیں گے اور میں نے جاب بھی اسی لئے کی ہے تاکہ کچھ اماؤنٹ جمع کر سکوں۔‘‘ دوسری طرف ایک پل کو سکوت چھا گیا تھا۔

’’اوکے ماما، میں آپ کو پھر کال کروں گی ابھی آفس کے فون سے کر رہی ہوں، زیادہ دیر بات نہیں کر سکتی، آپ اپنا خیال رکھیے گا ڈھیرا سارا، میں جلد ہی سیل فون خرید لوں گی تاکہ آپ سے اور ہادی سے آسانی سے رابطہ ہو سکے اوکے اللہ حافظ۔‘‘ جلدی جلدی کہتے ہوئے وہ ایک ہی سانس میں کئی جملے بول گئی اور ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔

ٹائم دیکھنے کے لئے اس نے جونہی وال کلاک کی طرف نظر اٹھائی تو اپنے سامنے رواحہ کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے بھونچکی ہو گئی۔

نجانے وہ کب سے کھڑا اس کی گفتگو سن رہا تھا، ماما سے بات کرتے ہوئے اسے قطعاً احساس نہیں ہوا۔

’’پتہ نہیں میں کتنی دیر سے باتیں کیے جا رہی تھی کیسا سوچتا ہوگا میری پرمیشن کا کتنا ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔‘‘ اندر ہی اندر اسے ازحد ندامت نے آن گھیرا۔

’’مس علیشا! صبح آپ کو ثاقب نے جو رائل انڈسٹری کی فائل دی تھی اس میں کو مارکیٹنگ سیلری کے پرسنٹیج والا پیج ہے اس کے دو تین پرنٹ نکال کر میرے آفس میں بھیج دیں۔‘‘ اس نے بڑے نارمل انداز میں کہا تھا، گویا اس نے اس کی ٹیلیفونگ گفتگو کو سنا ہی نہیں تھا۔

’’پتہ نہیں واقعی نہیں سنا یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔‘‘ اس نے دل میں سوچا۔

’’جی سر!‘‘ وہ کہنے کے ساتھ ہی سب سے نچلی دراز میں رکھی فائل کو نکالنے لگی۔

اس نے ایک نظر اس کے اسکارف سے ڈھکے سر کو دیکھا اور پھر اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا، وہ بھی سر جھٹکتے ہوئے فائل میں سے صفحہ نکالتے ہوئے پرنٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

’’آفس میں دل لگ گیا بیٹا!‘‘ آج اتوار ہونے کے باعث چھٹی تھی اور ناشتہ بھی متفرق ٹائم پہ ہوا تھا، تینوں خواتین نے تو ٹائم پہ ناشتہ کیا تھا جبکہ رواحہ اور قاسم انکل رات کسی ڈنر پہ انوائیٹ تھے، بزنس ڈنر ہونے کی وجہ سے ان کی واپسی کافی رات گئے ہوئی تھی، اس لئے آج ان کا ناشتہ بھی لیٹ تھا۔

سو وہ تینوں ناشتے سے فراغت کے بعد لاؤنج میں بیٹھی تھیں، وہ اخبار کی سرخیوں پہ نظر دوڑا رہی تھی جب تہمینہ آنٹی نے اسے مخاطب کیا۔

’’وہ آفس ہے ماما، کوئی تفریحی پارک نہیں جہاں دل لگ جائے گا۔‘‘ علیشا کی بجائے نور نے جواب دیا تھا، جو غالباً سنڈے میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے کسی خبر پہ جھنجھلائی تھی، کیونکہ یہ جھنجھلاہٹ اس کے لہجے میں بھی نمایاں تھی۔

’’جہاں چار انسان رہتے ہوں وہاں دل تو خود بخود ہی لگ جاتا ہے اور پھر کام تو ہر جگہ ہوتے ہیں، کام کی وجہ سے ہی تو انسان ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔‘‘ تہمینہ آنٹی نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا۔

’’تمہیں کام وام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم کوئی ورکر تھوڑی ہو، بس بیٹھ کر ادھر نگرانی کیا کرو اور ہاں ذرا یہ رواحہ پہ بھی نظر رکھا کرو۔‘‘ وہ اب تہمینہ کو چھوڑ علیشا کی طرف متوجہ ہو گئی، آخری جملہ بڑی رازداری سے ادا کیا گیا تھا۔

’’یہ تم اسے کیا پٹیاں پڑھا رہی ہو؟‘‘ اسی وقت رواحہ اندر داخل ہوا تھا اور نور کا جملہ اس کے کانوں میں پڑ گیا تھا، اس نے سخت نظروں سے اسے گھورا، وہ ایک لمحے کو ٹپٹائی لیکن اگلے ہی لمحے وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔

’’ہاں تو کچھ غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں، آفس میں کوئی تو میرا مخبر ہو جو تمہاری سرگرمیوں کی رپورٹ مجھ تک پہنچائے۔‘‘ وہ ناک چڑھا کے بولی۔

’’کیوں، تم کیا تھانیدارنی لگی ہو۔‘‘ وہ اسے گھور کے رہ گیا۔

’’تم پر تو ضرور ہی لگی ہوں۔‘‘ اس نے آنکھیں سیکڑ کے اسے دیکھا، علیشا ان کی بحث میں خود کو انتہائی مس فٹ فیل کر رہی تھی۔

’’بڑی ماما! دیکھ رہی ہیں اسے، کیسے قینچی کی طرح بلکہ مہرٹھ کی قینچی کی طرح اس کی زبان چل رہی ہے، اگلے گھر جا کر ناک ہی کٹوائے گی۔‘‘ اس سے خود کوئی جواب نہ بن پڑا تو تہمینہ بیگم کو درمیان میں کھینچ لیا۔

’’ماما کو بیچ میں کیوں گھسیٹتے ہو، اپنی زبان دیکھی ہے وزیر آباد کی چھری سے بھی زیادہ تیز ہے۔‘‘ وہ تو ننگے جھاڑ کے میدان میں اتر آئی

تھی۔

’’توبہ...... چھریوں، قینچیوں کا تذکرہ تو یوں کر رہے ہو گویا تم لوہاروں کی نسل سے ہو۔‘‘ تہمینہ نے دونوں کو ڈپٹتے ہوئے کہا تھا، اسی وقت کپڑے دھونے والی ماسی اندر چلی آئی۔

’’سلام بی بی جی!‘‘

’’وعلیکم السلام، کیسی ہو پروین، بچے ٹھیک ہیں؟‘‘ سلام کے جواب میں انہوں نے ساتھ ہی دوسرے سوال پوچھ ڈالے اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر نور کی طرف متوجہ ہو کے بولیں۔

’’اٹھو نور! پروین کو کپڑے نکال کے دو، بیڈ شیٹس اور کشنز کے کور بھی اتار کے دو۔‘‘ انہوں نے پہلی فرصت میں نور کو وہاں سے اٹھایا، ورنہ ان دونوں کا جنگ ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

’’بعد میں دیکھ لوں گی تمہیں۔‘‘ وہ سخت دھمکاتی نظروں سے اسے گھورتی وہاں سے اٹھی تھی۔

’’میری وارڈ روب میں سے بھی میلے کچیلے کپڑے نکال دینا۔‘‘ اس نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔

’’مائی فٹ۔‘‘ وہ پاؤں پٹختی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

’’بڑی ماما ناشتہ۔‘‘ وہ صوفے پہ پھیل کے بیٹھتے ہوئے بڑے لاڈ سے بولا تھا۔

’’کیا ناشتہ کرے گا میرا بیٹا!‘‘ انہوں نے نہال ہوتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بڑے دلار سے پوچھا تھا۔

’’بس اب تو کچھ ہلکا پھلکا ہی لا دیں لنچ کا ٹائم قریب ہے اور ہاں لنچ آن ذرا وی آئی پی قسم کا تیار کر لیں آج تو گھر میں کھانا کھانا ہے۔‘‘ بڑی ماما سے بات کرتے ہوئے اس نے سرسری سی نظر علیشا پہ بھی ڈالی تھی جو ان دونوں کی باتوں سے بے نیاز اخبار کے مطالعے میں گم تھی۔

’’ہاں ہاں کیوں نہیں میں ابھی ناشتہ لے کر آتی ہوں۔‘‘ تہمینہ اٹھنے لگی تھیں جب علیشا انہیں ٹوکتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

’’آپ بیٹھیں آنٹی میں بنا لاتی ہوں۔‘‘ پھر رواحہ کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔

’’کیا لیں گے آپ ناشتے میں؟‘‘ رواحہ کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی، اس کا مطلب تھا وہ قصداً ان دونوں سے بے نیاز بیٹھی تھی ویسے اس کا دل و دماغ یہیں موجود تھا۔

’’کاش یہ سوال مجھے ساری زندگی سننے کو مل جائے۔‘‘ اس کے دل میں خواہش نے چٹکی لی تھی۔

’’جو بھی آپ سہولت سے بنا دیں۔‘‘ وہ بولا تو یہی کہہ سکا، وہ سر اثبات میں ہلاتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

’’کیا بناؤں۔‘‘ فریج کھولتے ہوئے اس نے ایک نظر اندر موجود اشیاء کا جائزہ لیا، حالانکہ وہ دونوں ایک ہی ٹیبل پہ روزانہ ناشتہ کرتے تھے، لیکن اس نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا کہ کون کیا کھا لیا ہے۔

اس نے سلائس سینکے کباب فرائی کیے انڈے بوائل کر کے ان کو ہلکا سا بیسن لگا کے فرائی کیا، چکن کے ریشے کر کے آملیٹ بنایا، چائے وہ پہلے ہی رکھ چکی تھی، جوش آنے پر اسے ٹی پاٹ میں ڈال کر ساری چیزیں ٹرالی میں سیٹ کر کے جب وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو رواحہ اخبار کو پڑھ رہا تھا، تہمینہ آنٹی غالباً کسی کام سے اٹھ کر جا چکی تھیں، اسے آتا دیکھ کر اس نے اخبار رول کر کے ٹھوڑی کے نیچے رکھی اور انہماک سے اسے دیکھنے لگا۔

’’ارے...... آپ نے تو اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا، میں تو خالی سلائس اور چائے سے بھی کام چلا لیتا ہوں۔‘‘ اس نے ٹرالی اس کے قریب لا کے روکی تو وہ اتنے لوازمات پہ نظر پڑتے ہی بول اٹھا۔

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ آہستگی سے کہتی وہ ناشتہ ٹرالی سے ٹیبل پہ منتقل کرنے لگی۔

’’اگر کوئی بات نہیں تو کیا آپ روزانہ مجھے ناشتہ بنا دیا کریں گی۔‘‘ وہ مسکراتی نگاہیں اس پہ ٹکا کے متبسم لہجے میں بولا۔

’’بنا دوں گی۔‘‘ وہ چونکے بغیر سنجیدگی سے بولی۔

’’آئیں ناں آپ بھی ساتھ دیں میرا۔‘‘ وہ اس کے ماتھے پہ لگے سنجیدگی اور نو لفٹ کے بورڈ کی پرواہ کیے بغیر بڑی اپنائیت سے شریک طعام ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔

’’نہیں شکریہ میں ناشتہ کر چکی ہوں۔‘‘ اس نے متانت سے انکار کیا۔

’’چلیں پھر کم از کم پاس تو بیٹھ سکتی ہیں۔‘‘ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

’’جی۔‘‘ وہ اس سے کافی فاصلے پہ رکھے سنگل صوفے پہ بیٹھ گئی۔

’’آفس ورک کیسا چل رہا ہے آپ کا؟‘‘ وہ ناشتہ شروع کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے نگاہیں اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پہ جمائی ہوئی تھیں۔

طوعاً کرہاً وہ بیٹھ تو گئی تھی لیکن دل اندر سے بہت بے چین ہو رہا تھا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر بھاگ ہی جاتی۔

’’گڈ...... ویسے بھی ثاقب بہت کوآپریٹو انسان ہے وہ جلد ہی آپ کو ٹرینڈ کر دے گا۔‘‘ وہ تسلی آمیز لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا۔

پتہ نہیں وہ یہ باتیں یہاں کیوں کر رہا تھا، علیشا سمجھ نہ سکی وہ اس کے جواب میں کیا کہتی، خاموش ہی رہی، البتہ کسی کا طنز بھرا جملہ کسی تازیانے کی مانند اس کے کانوں میں گونجا تھا۔

’’ارے...... ایسی ہی حرافہ عورتیں، مردوں کی رکھیل ہوتی ہیں، ان کا کام صرف مردوں کو لبھانا ہوتا ہے گھر بسانا نہیں۔‘‘ اسے لگا تھا اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی، احساس اذیت سے چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا تھا، رواحہ کیا کہہ رہا تھا اسے کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

’’کیا ہوا علیشا! خیریت تو ہے۔‘‘ وہ اس کے بھنچے ہوئے لب اور لبریز آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو اٹھا۔

جبکہ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر دونوں ہاتھ اپنے کانوں پہ رکھ کے گویا کسی ان سنی آواز کو روکنا چاہ رہی تھی، بڑی شدت سے اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

’’علیشا کو کیا ہوا؟‘‘ وہ ناشتہ چھوڑ چھاڑ متفکر ہو کر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆☆☆

اسے پہلی سیلری ملی تو سب سے پہلے اس نے ماما کے لئے موبائل سم اور ساتھ میں چند کارڈ بھی خرید لئے، اب مسئلہ تھا یہ سب چیزیں ماما کو بھیجنے کا، دل تو اس کا چاہ رہا تھا کہ ایک کارڈیگن اور گرم شال بھی ان کے لئے خرید لئے، لیکن فی الحال یہ چیزیں ان کے لئے مسئلہ کھڑا کر سکتی تھیں لہٰذا وہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی۔

’’میرا خیال ہے فاطمہ بھابھی کے ایڈریس پہ بھیج دیا جائے۔‘‘ اس نے دل میں سوچا۔

’’لیکن ان کی ساس تو ہر جگہ ڈھنڈورا پیٹ

دیں گی اور اس طرح جس کو نہیں بھی پتہ چلنا اسے بھی خبر ہو جائے گی۔" اس نے خود ہی اپنی سوچ کی تردید کر دی۔

"کیسی ہیں مس علیشا!" وہ اپنی سوچوں میں مستغرق تھی جب ثاقب سبحانی نے اس کے سامنے والی چیئر سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

اس کے ہاتھ میں دو تین فائلیں تھیں جو غالباً وہ اسے ہی دینے آیا تھا، رواحہ سے اس کا واسطہ کم ہی پڑتا تھا، ثاقب سبحانی ہی اسے گائیڈ کرتا تھا، رواحہ کے آفس جانے میں وہ خود بھی قصداً احتراز کرتی تھی۔

"فائن۔" مختصر جواب دیتے ہوئے وہ سر جھٹک کے اپنی سوچوں سے نکلی تھی۔

اس کی گہری براؤن شہد رنگ آنکھوں میں عجیب سی کسک آمیز تڑپ تھی، گویا درد ان آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا ہو، ثاقب سبحانی کے دل نے اس سے ملتے وقت ہر دفعہ یہ خواہش کی تھی کہ وہ ان آنکھوں کو ہنستا دیکھے، اگرچہ سوگوار حسن لئے بھی وہ بے حد پرکشش دکھائی دیتی تھی لیکن پھر بھی اس کا دل چاہتا تھا وہ اسے ہنسائے، بے تحاشہ ہنسائے اور پھر اس کا کھلکھلاتا ہوا۔

لیکن اس کا انداز اس قدر ریزرو ہوتا تھا کہ وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی ابھی تک اس سے زائد از ضرورت بات نہیں کر سکا تھا۔

"یہ گیلانی انٹر پرائزر کی فائلز ہیں، ہماری اور ان کی گزشتہ تمام ڈیلنگز کی تفصیلات ان میں موجود ہیں ہمارا اور ان کا کانٹریکٹ تین سال کا تھا، آپ نے ان تین سالوں میں ہونے والی ہر ڈیلنگ کے لاس اور پراوفٹ کی مجموعی پرسنٹیج نکال کے ایک خاکہ تیار کرنا ہے، تاکہ نیکسٹ کانٹریکٹ کے بارے میں غور کیا جائے۔" وہ تینوں فائلیں اس کے ٹیبل پہ رکھتے ہوئے اسے تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

"اور تمام ڈیٹا کو آفس کے پرسنل آفس میں بھی سیو کر دیجئے گا، آپ ان فائلز کو ایک مرتبہ اسٹڈی کر لیں، میں فی الحال یہیں ہوں، لنچ آورز کے بعد میں نہیں ہوں گا اور مزید دو دن بھی میں لیو پر ہوں، ایکچوئیلی میری پھپھو بیمار ہیں میں لاہور ان کی عیادت کے لئے جا رہا ہوں۔" اس نے اسے اپنے آئندہ کے پروگرام سے آگاہ کیا۔

علیشا جو بڑی توجہ سے اس کی ہدایات سن رہی تھی، اس کے لاہور جاتے کے تذکرے پہ چونک گئی، اسے لگا قدرت نے خود ہی اس کے لئے انتظام کر دیا ہے، لیکن مسئلہ تو ثاقب سبحانی سے بات کرنے کا تھا، وہ ضرورتاً ہی اس سے بات کیا کرتی تھی اور پھر پتہ نہیں وہ اس کا کام کر بھی سکے گا یا نہ، کچھ کہنے اور نہ کہنے کی کشمکش کا شکار وہ متذبذب سے بیٹھی تھی۔

"آپ کو کچھ کہنا ہے مس علیشا؟" وہ شاید خود ہی اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ گیا تھا۔

"آپ کی پھپھو لاہور میں کہاں رہتی ہیں؟" نظریں جھکائے، فائل کا کونا کریدتے ہوئے اس نے بے حد جھجکتے ہوئے یہ سوال کیا تھا۔

"وہ صدر میں ہوتی ہیں۔" اس کے سوال نے اسے اچھا خاصا متحیر کر ڈالا تھا، کیونکہ علیشا نے اس سے کبھی ذاتیات کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا، بلکہ اس سے کیا کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔

"اچھا پھر تو دور ہی پڑ جائے گا۔" وہ مایوس کن لہجے میں خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

"کیا آپ کو لاہور میں کسی سے کوئی کام تھا؟" اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا۔

"نہیں تو۔" وہ پھر جھجک گئی۔

"آپ کو اگر کوئی کام ہے تو آپ بلا جھجک کہہ سکتی ہیں، مجھے ہرگز کوئی پریشانی نہیں ہو گی بلکہ دلی خوشی محسوس ہو گی۔" اس نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

وہ دل میں انتہائی مسرت محسوس کر رہا تھا کہ آج علیشا نے اس سے کام سے ہٹ کر کچھ کہا ہے، شاید فی الحال وہ خود بھی اپنی اس خوشی کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

"ایکچوئیلی لاہور میں میری ماما ہیں مجھے ان کے لئے کچھ بھیجنا ہے، وہ ماڈل ٹاؤن میں ہوتی ہیں، اگر آپ کو پرابلم نہ ہو تو......"

"ارے...... مس علیشا، پرابلم کیسی، آپ تو تکلف برت رہی ہیں، آپ نے جو کچھ بھیجنا ہے مجھے دے دیں اور ایڈریس بتا دیں، ماڈل ٹاؤن میں میرا ایک دوست بھی رہتا ہے اسی بہانے اس سے بھی مل لوں گا اور آپ کا کام بھی کر دوں گا۔" وہ بڑی خوشدلی سے کہہ رہا تھا، علیشا کی اپنائیت نے اسے بے انتہا خوشی بخشی تھی۔

"تھینک یو۔" وہ ممنون لہجے میں بولی، ایک بہت بڑا بوجھ اس کے سر سے سرک گیا تھا، موبائل کل سے اس کے بیگ میں تھا، اس کا ارادہ تھا کہ آج یہ چیزیں کوریئر سروس کے ذریعے بھجوا دے گی۔

"میں لنچ آورز میں آپ کو پیک کر دوں گی اور ایڈریس لکھ دیتی ہوں۔" اس نے پیڈ کھسکایا اور اس پر فاطمہ بھابھی کا ایڈریس اور فون نمبر لکھا اور پھر کاغذ الگ کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ٹھیک ہے میں انشاء اللہ پہلی فرصت میں آپ کی امانت پہنچا دوں گا اور آپ یہ کارڈ رکھ لیں اس پہ میرا سیل نمبر ہے ضرورت پڑنے پر آپ مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں۔" اس نے ایک نظر ایڈریس پہ دوڑائی اور پھر اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا، علیشا نے شکریہ کے ساتھ کارڈ پکڑا۔

ثاقب سبحانی اٹھ کے گیا تو سب سے پہلے اس نے فاطمہ بھابھی کو فون کر کے ثاقب کے آنے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی ہی ریکوسٹ بھی کر دی کہ وہ اپنی ساس سے اس بات کو پوشیدہ رکھیں۔

فون رکھنے کے بعد اس نے موبائل کو ڈبے میں پیک کرتے ہوئے ساتھ میں احتیاطاً کچھ رقم بھی رکھ دی، تاکہ ماما اپنی ضرورت کی کوئی چیز خرید سکیں، آج وہ اپنے دل کے ایک کونے میں اطمینان محسوس کر رہی تھی کہ کم از کم وہ ماما اور ہادی سے بات تو کر سکے گی۔

☆☆☆

ہم دشت کے باسی ہیں اے شہر کے لوگو
یہ روح پیاسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
دکھ درد سے صدیوں کا تعلق ہے ہمارا
آنکھوں کی اداسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
جان دینا روایت ہے قبیلے کی ہماری
یہ سرخ لباسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
جو بات بھی کہتے ہیں اتر جاتی ہے دل میں
تاثیر جدا سی ہمیں ورثے میں ملی ہے
جو ہاتھ بھی تھاما ہے سدا ساتھ رہا ہے
احباب شناسی ہمیں ورثے میں ملی ہے

اگلا دن اس کو نہایت بے چینی میں گزرا تھا، آفس سے واپس گھر جا کر اس نے ثاقب سبحانی کے سیل پر رابطہ کر کے پوچھا تھا اور جب اس نے کہا۔

"جی مس علیشا! میں نے آپ کی امانت آج دوپہر میں ہی پہنچا دی تھی۔"

"تھینک یو سو مچ، میں آپ کی بہت احسان

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مند ہوں۔'' اس کا لہجہ تشکر کے احساس سے بھیگ رہا تھا۔

رات کو اس نے ماما کو فون کرکے ہادی کا نمبر لیا تھا، اپنا سیل تو وہ خرید ہی چکی تھی، لہٰذا اس نے فوراً ہی ہادی کو کال کر دی۔

''السلام علیکم!'' دوسری طرف سے فون ریسیو ہو چکا تھا۔

علیشا کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں، آج وہ اپنے پیارے بھائی کی آواز اتنے عرصے بعد سن رہی تھی، جس سے روزانہ لڑے بغیر اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا، پتہ نہیں اس کا نازوں پلا بھائی کیسے ان سب کے بغیر وہاں گزارا کر رہا تھا۔

''ہیلو...... کون؟'' مسلسل خاموشی پر وہ دوبارہ بولا تھا۔

''ہادی! یہ میں ہوں۔'' وہ آنسوؤں کو بمشکل حلق سے نیچے اتارتے ہوئے نم لہجے میں بولی۔

''علیشا! کیسی ہو تم؟'' اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں، تم تو وہاں جا کے بھول ہی گئے۔'' شکوہ آیوں آپ ہی اس کے لبوں سے پھسل گیا۔

''لو...... تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں جنگلی بلی! میں یہاں کون سا کسی گوری میم کے چرنوں میں بیٹھا ہوں، جو تمہیں بھول جاؤں گا، بھلا کوئی بھائی بھی کسی بہن کو بھول سکتا ہے۔'' پتہ نہیں وہ واقعی وہاں خوش تھا یا صرف اس کی خاطر لہجے کو بشاش بنا رکھا تھا۔

''یہ اکیسویں صدی ہے ہادی! یہاں بہن بھائی کی ذمہ داری نہیں صرف ایک بوجھ ہے ناقابل برداشت بوجھ۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے کٹیلے لہجے میں گویا ہوئی۔

''پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی علیشا! خیر چھوڑو، یہ بتاؤ تم ٹھیک ہو؟ اور گھر میں باقی سب کیسے ہیں؟ رواحہ کیسا ہے؟'' وہ بات بدل گیا۔

جانتا تھا ابھی زخم ہرا ہے بھرا نہیں، ان ہرے زخموں پہ کھرنڈ جمنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔

''سب ٹھیک ہیں، تمہاری جاب کا کیا ہوا؟'' وہ جان بوجھ کر رواحہ کا ذکر گول کر گئی۔

''ہاں فی الحال تو ٹھیک ہے، یہاں ایم ڈی سے میری اچھی ہیلو ہائے ہو گئی ہے، اس نے کافی امید دلائی ہے کہ اگر میری پراگرس اسی طرح رہی تو وہ میری مستقل جاب پہ غور کریں گے۔'' وہ خود بھی کافی پرامید تھا۔

''ویری گڈ، تم ایک دفعہ سیٹل ہو جاؤ پھر ہم بھی تمہارے پاس آ جائیں گے، ہمیں نہیں رہنا یہاں۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولی۔

''دیکھو کیا بنتا ہے، میری تو اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمارے لئے بہتری کا فیصلہ کرے۔'' وہ مبہم سا گویا ہوا۔

''لیکن ہادی! مجھے اس ملک میں نہیں رہنا، مجھے...... مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہر نگاہ میرا تمسخر اڑا رہی ہے، ہر ایک کی نظر میں میرے لئے حقارت ہے، یوں لگتا ہے جیسے...... جیسے میری کوئی وقعت، کوئی حیثیت، کوئی مقام نہیں، فضا میں معلق ایک ذرہ بھی اپنا وجود رکھتا ہے لیکن علیشا فرحان نہیں۔'' وہ اگرچہ اسے اتنی دور پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لیکن آخر وہ بھی انسان تھی، کسی سے اپنا حال دل کہتی، کس کو اپنی کتھارس کہتی؟

''ایسے نہیں سوچتے علیشا! اللہ پاک ہمارے لئے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں وہی ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے، لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا، ہمیشہ اپنے رب سے اچھی امید رکھو، میں کسی

کو بددعا نہیں دے رہا لیکن دوسروں کا دل توڑنے والے، زندگی برباد کرنے والے خود بھی خوش نہیں رہ سکتے، کبھی بھی نہیں، آج یا کل انہیں احتساب کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔'' وہ بڑے وثوق سے کہہ رہا تھا، علیشا کا بلکتا ہوا دل بھی ایک پل کو قرار پا گیا تھا۔

''اچھا چلو اب فون بند کرو ورنہ تمہارا سارا بیلنس اڑ جائے گا، میں خود اب تم سے رابطہ کر لیا کروں گا۔'' اس کے یاد دلانے پر ہی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اسے پاکستان نہیں لندن بات کر رہی ہے۔

''اوکے یہ میرا ہی سیل نمبر ہے سیو کر لینا اور اپنا ڈھیر سارا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' ہادی سے بات کرکے اس کا موڈ کافی حد تک بہتر ہو گیا تھا، پژمردگی اور احساس کمتری میں خاطر خواہ کمی آئی تھی۔

☆☆☆

آج سارا آفس سٹاف رواحہ کی طرف سے میریٹ میں ڈنر پہ انوائیٹڈ تھا، کمپنی کو ایک فارنر گرینڈ پیکج سے اچھا خاصا پروفٹ ہوا تھا، جس کی خوشی میں آج ہاف ڈے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سب ڈنر پہ بھی انوائیٹڈ تھے۔

اور مس عظمٰی گیلانی اسے بتا رہی تھی کہ جب بھی کمپنی کو کسی ڈیلنگ میں پروفٹ حاصل ہوتا ہے تو سر رواحہ ڈنر ضرور کرواتے ہیں، علیشا نے محسوس کیا سارا اسٹاف ہی بہت خوش تھا۔

''علیشا جی! آپ کا تو یہ پہلا ڈنر ہے ناں ہمارے پاس۔'' یہ عمران حیدر تھا۔

جو اس کے ریزرو موڈ کی قطعی پرواہ کیے بغیر اکثر ہی اس کی ٹیبل پہ آن دھمکتا تھا اور اوٹ پٹانگ باتوں سے اسے ہنسانے کی کوشش کرتا تھا، لیکن مجال ہے جو کبھی علیشا کے چہرے پہ بھولے سے بھی مسکان نے چھب دکھلائی ہو، وہ بھی پتہ نہیں کس مٹی سے بنا تھا، ہار ماننے کی بجائے ڈھیٹ بن کے پھر آ جاتا۔

''جی!'' وہ اس کی موجودگی کو خاطر میں لائے بغیر اپنے کام میں مگن بولی۔

''پتہ نہیں علیشا جی! آپ ہنستی ہوئی کیسی لگتی ہیں؟'' وہ کسی بھی تجسس کے بغیر سادہ لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔

اس کے عجیب و غریب سوال پہ علیشا نے ٹھٹک کے اسے دیکھا، آنکھوں میں ناگواری کا واضح تاثر اترا تھا۔

ثاقب سبحانی نے بھی بے حد چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا، یہ سوال تو کئی دفعہ اس کے دل میں بھی مچلا تھا، لیکن وہ اسے لبوں تک نہ لا سکا۔

چلو آج کوئی بچپن کا کھیل پھر کھیلیں
بڑی مدت ہوئی بے ساختہ ہنس کر نہیں دیکھا

وہ اس کے تاثرات کو نوٹ کیے بغیر بڑی روانی سے شعر پڑھ گیا۔

''سوری، میں فضول باتیں پسند نہیں کرتی۔'' وہ سخت لہجے میں گویا ہوئی۔

''پتہ ہے علیشا جی! میری ایک چھوٹی بہن تھی، وہ بالکل آپ کے جیسی تھی، تقریباً سترہ پرسنٹ تو آپ دونوں کی شکل ضرور ہی ملتی ہو گی لیکن وہ بلا کی ہنس مکھ اور حاضر جواب تھی جب میں نے آپ کو دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میری عالیہ میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہو لیکن...... آخر میں اس کی آنکھوں میں بھی ایسا درد ٹھہر گیا تھا جیسا آپ کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔'' وہ کسی غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے نجانے کس احساس کے تحت بولتا چلا گیا تھا، آخر میں اس کا گلا رندھ گیا تو وہ خاموشی سے کرسی کھسکا کے کھڑا ہو گیا۔

''عمران صاحب!'' علیشا نے بے ساختہ اسے پیچھے سے پکارا۔

اسے اپنے کرخت لہجے کا احساس ہوا تو خود بخود ہی شرمندگی نے آن گھیرا۔

''جی!'' وہ اس کی طرف پلٹا۔

''آپ کی سسٹر اب کہاں ہیں؟'' نجانے کیوں یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کا دل بے تحاشہ زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

کسی انجانے خدشے کے پیش نظر! کسی انہونی کو محسوس کرتے ہوئے!!

''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے شاید وہ اپنے اللہ کو ہم سے بھی زیادہ پیاری تھی۔'' وہ بھیگے لہجے میں کہتے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا، علیشا کو لگا تھا اس کا دل بند ہو گیا ہے۔

اور اندر کہیں سناٹے اتر آئے ہوں، عمران حیدر کا دکھ اسے اپنا دکھ لگا تھا، حالانکہ بظاہر ان دونوں کے بیچ کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا، لیکن شاید پھر بھی ایک بات ان دونوں کے درمیان مشترک تھی اور وہ تھی ''غم''۔

دکھ درد بھی انسان کو کیسے ایک دوسرے کے قریب لے آتے ہیں، وہ عمران حیدر جس سے وہ کچھ دیر پہلے انتہائی کوفت محسوس کرتی آ رہی تھی، اب کیسے اسے ہادی کی طرح دکھنے لگا تھا، بالکل ایسے ہی جیسے عمران کو اسے علیشا کی شکل میں عالیہ نظر آئی تھی۔

آج چونکہ ہاف ڈے تھا لہٰذا سارا اسٹاف ہی جلدی روانہ ہو گیا تھا، البتہ عمران حیدر ابھی تک اپنی ٹیبل پہ بیٹھا کمپیوٹر پہ نظریں ٹکائے ہوئے تھا، بالکل خالی، ویران، بنجر نگاہیں، وہ خود کو اس کی ٹیبل تک جانے سے روک نہیں پائی تھی۔

''عمران صاحب!'' اس نے آہستگی سے اسے پکارا، تو وہ چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''آئم ساری۔'' وہ نگاہیں جھکا کے بولی۔

''فار واٹ علیشا جی!'' اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

لگتا ہی نہیں تھا کہ عمران حیدر کے اندر اتنے بڑے بڑے دکھ بسیرا کیے ہوئے ہیں، بظاہر وہ ہر وقت ہنستا مسکراتا رہتا تھا، لیکن اس کا اندر ہر وقت کرلاتا تھا۔

''ایکچویلی میں نہیں جانتی تھی کہ آپ کی سسٹر...... آئی مین آپ کے ساتھ اتنی بڑی ٹریجڈی ہو چکی تھی۔'' اس نے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

''یہ دنیا ہے علیشا جی! یہاں تو یہی سلسلہ ہے، کل کسی کی باری تھی آج ہماری ہو گی، لیکن خدارا، آپ اپنے ساتھ یوں نہ کیجئے، غم چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ہمیشہ اپنے اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے میں آپ کی آنکھوں میں زندگی کے احساس کو مرتے دیکھتا ہوں تو میرے سامنے عالیہ آ جاتی ہے اس نے بھی اپنی امید توڑ ڈالی تھی، حالانکہ ڈاکٹرز کہتے تھے اگر یہ اپنی ول پاور سے کام لیں تو ہماری کوشش بھی کامیاب ہو سکتی ہے لیکن وہ ہار گئی۔'' وہ چند ثانیے کو خاموش ہو گیا، پھر خود کو سنبھال کر اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ نے ہارنا نہیں ہے علیشا جی! اس زندگی کو جیت کے دکھانا ہے جن لوگوں نے ہمیں جھکایا ہوا نہی کو سر اٹھا کے دکھانا ہے کہ اسی کا نام زندگی ہے۔''

''جی ضرور انشاء اللہ۔'' عمران حیدر کی باتوں سے اسے بھی توانائی بخشی تھی۔

''ویری گڈ۔'' اس کے مثبت جواب نے اسے حقیقتاً خوش کیا تھا۔

''اوکے میں اب چلتی ہوں ٹائم کافی ہو گیا ہے۔'' وہ اپنا بیگ سنبھالتی کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

گھر آ کے شاور لے کر وہ لمبی نیند سونے کے لئے لیٹ گئی، کیونکہ وہ خود کو فریش کرنا چاہتی تھی اور ویسے بھی ڈنر اٹینڈ کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا، وہ لیٹی تو واقعی نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی، آنکھ تو تب کھلی جب نور نے آ کے اسے جھنجھوڑا۔

''اٹھ بھی جاؤ محترمہ! کیا اصطبل بیچ کے سو رہی ہو۔''

''اوں۔'' اس نے مندی مندی آنکھیں کھولیں۔

''چلو میں تمہیں پچھلے دو گھنٹے سے جگا رہی ہوں اور تم ابھی اوں آں ہی کر رہی ہو، اٹھ جاؤ، میں لان میں سب کے لئے چائے لگا کے آ رہی ہوں، ماما کا آرڈر ہے کہ تمہیں بھی اٹھایا جائے۔'' اس نے کمبل کھینچتے ہوئے بلند آواز سے حلق پھاڑا، گویا وہ بہری ہو۔

''اچھا...... تم چلو میں آ رہی ہوں۔'' وہ بیڈ سے اتر کے سلیپر پہنتے ہوئے بولی۔

''جی بہتر میڈم صاحبہ!'' وہ کورنش بجا لائی۔

علیشا مسکراتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی، منہ ہاتھ دھو کے وہ نیچے آئی تو تہمینہ آنٹی اور نور کے ساتھ اسے رواحہ بھی بیٹھا ہوا نظر آیا، سب کو مشترکہ سلام کر کے وہ نور کے برابر والی چیئر پہ بیٹھ گئی۔

خوشگوار باتوں کے درمیان ان سب نے چائے ختم کی، تہمینہ آنٹی کی کوئی عزیزہ آ گئیں تو وہ ان کے ساتھ ڈرائینگ روم میں چلی گئیں، نور بھی ان کے ساتھ اندر تک گئی وہ چونکہ انہیں جانتی نہیں تھی، اس لئے وہ سلام دعا کے بعد وہیں بیٹھ گئی۔

''شام سات بجے تک تیار ہو جایئے گا، میں آپ کو ساتھ لیتا ہوا جاؤں گا۔'' رواحہ نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

''لیکن میرا تو ڈنر پہ جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' وہ چند لمحے تو گومگو کی کیفیت میں بیٹھی رہی لیکن پھر بول ہی پڑی۔

''کیوں؟'' اس نے اچنبھے سے دریافت کیا۔

''بس ایسے ہی، کیا میرا جانا بہت ضروری ہے؟'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ضروری تو کسی کا بھی نہیں ہے، لیکن پھر بھی آپ کو شرکت کرنی چاہیے، آپ کے لئے فائدہ ہو گا۔'' اس کے انداز میں اصرار تھا۔

''نفع، نقصان سوچنا چھوڑ دیا ہے میں نے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی، رواحہ جو مزید کچھ کہنے جا رہا تھا نور کو اپنی طرف آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

وہ لڑکی جس سے وہ حد درجہ متنفر تھا اب خوامخواہ ہی دل ہر وقت اس سے بات کرنے کے لئے ہمکتا رہتا تھا، جس سے وہ خود دور بھاگتا تھا اور خار کھاتا تھا، اب جب وہ خود اس سے کتراتی تھی تو وہ اس کے پیچھے لپکتا تھا۔

اس نے تو بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی، پہلے اپنی پڑھائی میں مصروف رہا پھر بزنس کی طرف لگ گیا، کبھی لڑکیوں کی طرف دھیان ہی نہیں کیا، اگرچہ بڑی ماما اور نور نے بھی کئی دفعہ اس سے پوچھا تھا کہ اگر کوئی لڑکی اس کی نظر میں ہے تو اسے بتا دے، لیکن اس نے کبھی کسی کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا، تو انہیں کیا بتاتا؟

بڑی ماما تو پچھلے دنوں اس کے لئے لڑکی ڈھونڈنے میں بڑی سرگرم تھیں، علیشا کی آمد سے یہ سلسلہ فی الحال ختم ہو گیا تھا۔

''لیکن علیشا تو انگیجڈ ہے مجھے اس کے

بارے میں یوں نہیں سوچنا چاہیے۔" اس نے اپنے دل کو سرزنش کی۔

"دھت تیرے کی رواحہ احمد! کوئی لڑکی پسند بھی آئی تو وہ جو پہلے سے کسی کے ساتھ منسوب ہے۔" وہ ملال میں گھرا وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن اپنی چیئر سنبھالتے اس نے جیسے ہی پی سی آن کیا ٹھٹک کر رک گئی، اس کے Desktop پر غزل لگی ہوئی تھی۔

تمہاری آنکھیں کہتی ہیں حصار ذات سے نکلو
تمنا میری بن جاؤ شب برباد سے نکلو
کنارہ تھام لو دل بھلا دو ہر گلہ شکوہ
کبھی سچی ہنسی نہیں لب پہ آتی یاد سے نکلو
خیال یار اچھا ہے مگر جس نے وفا نہ کی
پلٹ کر پھر صدا نہ دو در فریاد سے نکلو
نہیں کوئی محبت بھی ہجر رت بھی رقابت بھی
تو یہ دھڑکا سا کیا کیسے وہم کی گھات سے نکلو
سخنور ہم سے کہتا ہے سجا لو آنکھ میں کچھ خواب
دھڑکتا دل کو سکھلا دو اماوس رات سے نکلو
نہیں تم کو گوارا اب ہمارا قرب تو کہہ دو
ہمارے کرب کی چھوڑو تم اب گرداب سے نکلو
سر مقتل جو جاتے ہو نہ ہو درماندگی دل کو
زمانہ دیکھ تھم جائے کچھ اس انداز سے نکلو

"یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟" وہ الجھ کر سوچنے لگی۔

"میں تو خود کل اپنا پی سی آف کر کے گئی تھی اور کل تو ویسے بھی سارا اسٹاف جلدی چلا گیا تھا صرف میں اور عمران حیدر تھے تو کیا عمران نے......؟" اس نے قیاس لگایا۔

"کیسی ہیں مس علیشا!" وہ ابھی انہی سوچوں میں گھری تھی جب ثاقب سبحانی نے اس کی ٹیبل کے قریب آتے ہوئے ہمیشہ والا سوال دہرایا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ ذہن جھٹکتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ کل ڈنر پہ نہیں آئیں، ہم سب آپ کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔" ثاقب سبحانی کے لہجے میں ہلکے سے شکوے کا تاثر تھا۔

اس نے احتیاطاً ہم سب کہا تھا، ورنہ تو وہ اکیلا ہی بڑی بے چینی سے اس کا منتظر تھا، کیونکہ آفس ٹائم میں تو زیادہ بات چیت ہوتی ہی نہیں تھی، کچھ وہ ویسے بھی بولنے میں بہت احتیاط برتتی تھی، چنانچہ اس کا خیال تھا کہ ڈنر پہ تو وہ اس سے کچھ بات چیت تو کر ہی لے گا۔

"بس ایسے ہی، کچھ تھکاوٹ سی ہو گئی تھی۔" اسے ثاقب سبحانی سے اس سوال کی توقع نہیں تھا، پھر بھی وہ بات کو گول کر گئی۔

یہ کچھ جہد مسلسل سے تھکاوٹ نہیں لازم
انسان کو تھکا دیتا ہے سوچوں کا سفر بھی

عمران حیدر پتہ نہیں کہاں سے آن ٹپکا تھا، اس کے آخری جملے کے کانوں میں پڑتے ہی وہ بے ساختہ شعر کہہ اٹھا۔

"کیسے ہیں عمران صاحب آپ!" چیئر کو ذرا سا گھماتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اوں ہوں، عمران صاحب نہیں بھائی، آپ مجھے بھائی کہیں گی تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔" وہ بڑے مان بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"بھائی بننا کوئی آسان نہیں ہے عمران! پورا ٹرک بھر کے جہیز میں دینا پڑے گا۔" مس عظمیٰ گیلانی نے بھی مسکراتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"ہائیں...... یہ تو سراسر ظلم ہے۔" اس نے

مسکینیت سے کہتے ہوئے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"نہیں یار! تم دل چھوٹا نہ کرو، آج کے دور میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، یہ اکیسویں صدی ہے۔" ثاقب سبحانی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"ہائے میرے اللہ! تیرا شکر ہے ورنہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ یہ ٹرک میرے دل کے اوپر سے گزر کر ہی رہے گا۔" اس نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے بے ساختہ دونوں ہاتھ اپنے دل کے مقام پہ رکھتے ہوئے یوں تشکر بھرے لہجے میں کہا تھا، گویا بہت بڑی مصیبت سے جان چھوٹ گئی ہو۔

"توبہ۔" علیشا اس کے انداز پہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

وہ ہولے سے سر کو جنبش دیتی مسکراتی ہوئی اس قدر دلکش لگ رہی تھی کہ ثاقب سبحانی مبہوت سا اسے دیکھے گیا، اس کے ذہن کے پردے پر فی الفور یہ شعر ابھرا تھا۔

کنارہ تھام لو دل کا بھلا دو ہر گلہ شکوہ
کبھی سچی ہنسی ہنس دو پرانی یاد سے نکلو

"ایں...... تو آپ مسکراتی بھی ہیں۔" عمران حیدر نے باقاعدہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے یوں دیکھا تھا جیسے اسے اپنی بصارت پہ شک گزر رہا ہو۔

"جی!" اس نے پلکوں کو ذرا سی جنبش دیتے ہوئے کہا، لبوں پہ ابھی بھی دھیمی سی مسکان تھی۔

ثاقب سبحانی نے کن اکھیوں سے ڈیسک ٹاپ پر دیکھا جہاں غزل کے الفاظ جوں کے توں موجود تھے، اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے پڑھ چکی ہے اب کی دفعہ اس نے سرسری نگاہوں سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا، جو معمول سے ہٹ کر قدرے نارمل تھے، روزانہ والے سرد و سپاٹ انداز کے بجائے کچھ نرمی تھی، اس کے دل نے خوشگوار جذبات میں گھر کر ایک بیٹ مس کی تھی۔

"آہم...... کم بیک۔" سرسری سی نگاہ کب اس کے دلکش چہرے پہ ٹک گئی، اسے خود احساس نہیں ہوا، عمران حیدر نے جب اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے معنی خیزی سے گلا کھنکارا تو وہ ایکدم جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔

"آں...... ہاں...... میں ظہور انڈسٹری کی فائل لینے آیا تھا، مس علیشا سے۔" اس نے گڑبڑا کر جلدی سے وضاحت کی۔

"لیکن وہ فائل تو ابھی میں آپ کے ٹیبل پہ دیکھ کے آ رہا ہوں۔" عمران حیدر نے اک محفوظ سی مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے اس کے بوکھلائے ہوئے انداز کو نوٹ کیا۔

"اوہ...... ہاں...... میں بھول گیا...... شاید۔" بے ربط سے لہجے میں کہتا وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

"یہ ثاقب صاحب کو کیا ہوا ہے آج۔" اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔

"ہو جاتا ہے علیشا جی، یہ ظالم چیز ہی ایسی ہے اچھا بھلا انسان ہوش گنوا بیٹھتا ہے۔" عمران حیدر نے اس کی الجھن کو رفع کرنا چاہا تھا۔

"کون سی چیز؟" اس نے متعجب ہو کر استفسار کیا۔

"آپ نہیں سمجھو گی ابھی۔" آہستگی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بھی اٹھ گیا، وہ بھی بے نیازی سے کندھے جھٹکتے ہوئے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

"تم آج ہمارے ساتھ شاپنگ لئے جا رہی

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

ہو اور کل بھی ہر حال میں تمہیں فنکشن اٹینڈ کرنا ہے اور بس۔‘‘ نور نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے حتمی لہجے میں فیصلہ سنایا تھا۔

‘‘لیکن نور! میں انجان لوگوں میں جا کر کیا کروں گی۔‘‘ وہ ابھی بھی متامل تھی۔

تہمینہ آنٹی کے خاندان میں کسی عزیز کی شادی تھی، نور تو بڑے جوش و خروش سے اس کے لئے پروگرام بنا رہی تھی اور ساتھ میں اسے بھی گھسیٹ رہی تھی، جبکہ وہ انکاری ہو رہی تھی، کبھی تو وہ ان محافل کو بڑے ذوق و شوق سے اٹینڈ کیا کرتی تھی لیکن اب تو وہ زیادہ بھیڑ بھاڑ سے ویسے ہی بڑی جلد گھبرا جاتی ہے۔

اور اس کی اس خامی کو ہی تو نور دور کرنا چاہتی تھی، اس نے بھی پکا تہیہ کر لیا تھا وہ جتنا بھی انکار کر لے وہ اس کے انکار پر ہرگز کان نہیں دھرے گی۔

‘‘انجان لوگوں سے ہی تعلقات پیدا کر کے جان پہچان بنائی جاتی ہے۔‘‘ نور نے اس کے لنگڑے عذر کو چٹکیوں میں اڑا دیا تھا۔

‘‘لیکن مجھے نہ تو کسی سے جان پہچان بنانی ہے اور نہ ہی تعلقات استوار کرنے ہیں۔‘‘ وہ اس کی مسلسل ضد سے عاجز ہو کے بولی تھی۔

‘‘ایک تو تم بحث بہت کرتی ہو علیشا!‘‘ وہ بھی زچ ہو گئی، لیکن اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹی تھی۔

‘‘لیکن ساتھ تو میں تمہیں لے کر ہی جاؤں گی۔‘‘

‘‘مائی گاڈ!‘‘ علیشا نے اپنا سر دونوں ہاتھ میں گرا لیا۔

‘‘لڑکیو! جلدی کرو رواحہ آ گیا ہے، جلدی تیاری کرو ورنہ شور مچا دے گا۔‘‘ تہمینہ آنٹی کے اندر داخل ہوتے ہوئے دونوں کو وارن کیا۔

‘‘جی ماما! ہم تو تیار ہیں۔‘‘ اس کے لفظ ‘‘ہم‘‘ پہ علیشا فقط اسے دیکھ کے رہ گئی اور پھر واقعی اس کے نہ نہ کرنے کا باوجود وہ اسے گھسیٹتی ہوئی اپنے ہمراہ کھینچ لائی تھی۔

وہ شادی سے زیادہ شاپنگ سے گھبرا رہی تھی، وہ جانتی تھی نور نے فنکشن کے نام پر اس کے لئے ڈھیروں الم غلم چیزیں خرید لینی ہیں، لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے اس کی بالکل نہیں سنی تھی۔

‘‘علیشا! یہ دیکھو یہ ڈریس تم پہ بہت سوٹ کرے گا۔‘‘ ٹی پنک اور کاپر کلر کے امتزاج کا نہایت دیدہ زیب اور جدید تراش خراش کا یہ سوٹ اپنی قیمت خود اپنے منہ سے بتا رہا تھا۔

‘‘نہیں نور! میں اتنا ہیوی ڈریس نہیں پہن سکتی۔‘‘ اس نے فوراً سے پیشتر مسترد کر دیا۔

‘‘کیوں نہیں پہن سکتی، تم شادی پہ جا رہی ہو کسی سوگ میں تو نہیں۔‘‘ وہ اس کے انکار کو قطعی اہمیت دیے بغیر بولی تھی۔

‘‘تو تم اپنے لئے خرید لو ناں، اتنا ہی پسند آ گیا ہے تو۔‘‘ اس نے اپنے تئیں بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔

‘‘اگر میں تمہارے جتنی خوبصورت ہوتی ناں تو ایک سیکنڈ کی تاخیر کیے بغیر خرید لیتی۔‘‘ وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

وہ رواحہ کے سامنے ہی یوں منہ پھاڑ کے اس پہ کمنٹ پاس کر دے گی اسے اندازہ نہیں تھا۔

‘‘فضول باتیں مت کیا کرو۔‘‘ وہ سرخ چہرہ لئے دوسری سمت مڑ گئی۔

‘‘فضول بات کب کی ہے تم چاہے رواحہ سے پوچھ لو، کیوں رواحہ! یہ والا ڈریس علیشا پہ سوٹ کرے گا یا نہیں؟‘‘ وہ رواحہ کو متوجہ کر کے

اسے پوچھنے لگی۔

مارے خجالت کے علیشا کا چہرہ مزید سرخ پڑ گیا، ایسی بے باکی نور نے کبھی اس کے ساتھ کی تو نہیں تھی پتہ نہیں آج وہ کون سا بدلہ چکانے کے موڈ میں تھی۔

‘‘مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ڈریس بنا ہی مس علیشا فرحان کے لئے ہے۔‘‘ رواحہ نے دونوں بازو سینے پہ لپیٹتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنی نرم گرم نظروں کی زد پہ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

‘‘ارے! مس علیشا! آپ یہاں۔‘‘ ابھی تو وہ اپنے جملے کا ردعمل بھی اس کے چہرے پہ ڈھنگ سے دیکھ نہیں پایا تھا جب ایک جانی پہچانی پرجوش سی آواز پہ اسے پلٹ کے دیکھنا پڑا۔

سامنے ثاقب سبحانی کھڑا تھا وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا اسی لئے پہلے اس کی طرف بڑھا۔

‘‘السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟‘‘ نجانے کیوں رواحہ کو یوں محسوس ہوا تھا کہ علیشا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک کئی گناہ بڑھ گئی تھی، رواحہ نے اپنا وہم سمجھ کر اسے جھٹلانا چاہا تھا۔

‘‘سر! یہ میری آپا ہیں اور آپا یہ ہمارے باس سر رواحہ احمد ہیں۔‘‘ وہ اب اپنے ساتھ کھڑی میں بتیس سالہ خاتون سے اس کا تعارف کروا رہا تھا۔

‘‘اچھا تو آپ علیشا ہیں۔‘‘ رواحہ سے سلام دعا کے بعد وہ خود ہی علیشا سے مخاطب ہو گئی تھیں اور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے نہ صرف اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا بلکہ گال کو بھی ہلکا سا پیار کیا تھا، علیشا بلش ہو کے نظریں جھکا گئی تھی۔

رواحہ کی نظر بے اختیار ثاقب سبحانی کی طرف اٹھی تھی جو بے خود ہو کر علیشا کو دیکھ رہا تھا، اسے ناگواری کے شدید احساس نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا اور کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔

‘‘ماشاء اللہ بہت پیاری ہو۔‘‘ وہ سراہتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کے بولیں۔

‘‘لگتا ہے آپ کا پہلے سے علیشا سے تعارف ہو چکا ہے۔‘‘ نور کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تو وہ خود ہی بول پڑی۔

‘‘نہیں بائے فیس تو آج ہی ملاقات ہوئی ہے ویسے پہلے تذکرہ کیا تھا ثاقب نے۔‘‘ وہ بغیر ہچکچاہٹ کے بولی تھیں۔

‘‘یہ نور ہیں میری کزن۔‘‘ علیشا کو ان کی مسلسل نظروں نے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا، وہ ان کی توجہ ہٹانے کو ان کا تعارف نور سے کروانے لگی۔

‘‘نائس ٹو میٹ یو۔‘‘ نور نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

‘‘جلدی کرو نور! مجھے اور بھی کام ہیں۔‘‘ رواحہ اس سارے سلسلے سے اکتا گیا تھا، اس کا بس چلتا تو جادو کی چھڑی گھما کر علیشا کو ان دونوں بہن بھائی کی نظروں سے غائب کر دیتا۔

اتنا بدھو تو نہیں تھا وہ کہ ثاقب اور اس کی آپا کی نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھ سکتا۔

‘‘پھر ملاقات ہو گی آپ سے، ابھی ہمیں شاپنگ کرنی ہے۔‘‘ نور کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

‘‘انشاء اللہ ضرور۔‘‘ وہ پر یقین لہجے میں بولیں۔

رواحہ کا دل مزید مکدر ہو گیا، اس نے علیشا کے چہرے کو کھوجنا چاہا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا، ثاقب کی آپا سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے بھی اس کے چہرے پہ بڑی فارمل سی مسکان تھی، اسے دل کے ایک کونے میں اطمینان محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

‘‘ماشاء اللہ! آج تو مجھے اپنی بیٹی کی نظر اتار لینی چاہیے۔‘‘ وہ نور کے ہمراہ تیار ہو کے نیچے

اتری تو تہمینہ آنٹی نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر کہا تھا۔

اسے اچھی خاصی شرم محسوس ہوئی تھی، نور نے اس کے لاکھ نہ نہ کرنے کے باوجود نہ صرف اسے اتنا ہیوی ڈریس پہنایا تھا بلکہ میچنگ جیولری کے ساتھ میک اپ بھی کر دیا تھا۔

آج کچھ اس کا اپنا موڈ بھی خوشگوار تھا کیونکہ آج صبح ہی ماما اور ہادی دونوں کے ساتھ بات ہوئی تھی، ہادی کی جاب فائنل ہو گئی تھی اور اچھی سیلری کے ساتھ رہائش اور کھانے کا بندوبست بھی ہو گیا تھا اور اس نے علیشا سے کہا تھا۔

''اللہ نے بہت مہربانی کی ہے علیشا! اب ہماری آزمائش کے دن ختم ہو گئے ہیں، میں جلد ہی تمہاری اور ماما کی الگ رہائش کا ارینج کر دوں گا، جہاں تمہاری اپنی مرضی کی لائف ہو گی۔'' ہادی کا لہجہ دلی خوشی اور اطمینان کا غماز تھا۔

اور علیشا کو بھی یوں لگا تھا کہ آج اس نے بہت صدیوں بعد کوئی خوشی کی خبر سنی ہو، ایک بوجھ تھا جو اسے اپنے وجود سے سرکتا ہوا محسوس ہوا تھا اور بہت عرصے بعد اس نے کسی حد تک خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

نور اس کے اندر مثبت تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور اسی خوشی میں اس نے دھونس بھرے انداز میں اسے تیار کر ڈالا تھا۔

''ماما! یہ سارا کریڈٹ آپ کی دختر نیک اختر نور النساء کو جاتا ہے۔'' نور نے فخریہ انداز میں گردن اکڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''بالکل بھئی اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے تائید کی تھی۔

''چلیں ماما! دیر کس بات کی ہے۔'' نور نے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹا! رواحہ آتا ہی ہو گا تم دونوں اس کے ساتھ چلی جاؤ، تمہارے پاپا ذرا لیٹ آئیں گے، ہم پھر بعد میں آ جائیں گے۔'' انہوں نے آگاہ کیا۔

''اور یہ رواحہ صاحب کب تک تشریف لائیں گے۔'' اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے ایک مرتبہ پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔

''یہ لو...... وہ آ ہی گیا۔'' تہمینہ آنٹی نے داخلی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں سے وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔

''شیطان کا نام لیا شیطان حاضر۔'' وہ علیشا کی طرف متوجہ ہو کے بولی، اس کے انداز پہ علیشا زیر لب مسکرائی تھی۔

دائیں ہاتھ میں بریف کیس اور بائیں بازو پہ کوٹ ڈالے اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس نے جونہی نگاہیں اوپر اٹھائیں، ٹھٹک کر وہیں مبہوت ہو گیا۔

ٹی پنک اور کاپر امتزاج کا وہ ڈریس واقعی اس پہ بہت جچ رہا تھا، میچنگ جھمکے سے لٹکتے موتی اس کے گردن کو خم دینے پر بار بار اس کے صبیح رخسار کو چھو رہے تھے، لبوں پہ مدھم مسکان لئے وہ واقعی نظر لگ جانے کی حد تک حسین دکھائی دے رہی تھی اور رواحہ کو یوں لگ رہا تھا گویا کائنات کی گردش بھی اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہی چند ثانیے کے لئے تھم گئی ہو۔

''رواحہ! چلو بیٹا جلدی کر لو، بارات پہنچنے والی ہو گی۔'' تہمینہ کی آواز اسے ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔

''جی بڑی ماما!'' وہ اپنی بے خودی پر خجل سا ہو گیا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ ہے جب لڑکیاں تیار کھڑی ہیں اور مرد حضرات ابھی تک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہیں۔'' نور ناک چڑھا کے کہتے ہوئے سامنے صوفے پہ جا کے بیٹھ گئی تھی۔

لیکن اس کی حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی جب رواحہ اسے منہ توڑ جواب دینے کی بجائے چپ چاپ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

''ہائیں...... یہ رواحہ کو کیا ہوا؟'' وہ متعجب ہو کر سوچنے لگی اور پھر ہی راستے میں بھی وہ اسے کھویا کھویا سا لگا تھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے رواحہ!'' وہ تشویش زدہ لہجے میں استفسار کر رہی تھی۔

''آں...... ہاں...... ٹھیک ہوں...... کیا ہوا ہے مجھے۔'' وہ چونکا اور الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

''مجھے تو تمہارا دماغ بالکل سیٹ نہیں لگ رہا بلکہ مجھے تو ڈر ہے تم گاڑی کہیں کسی ٹرک سے نہ مار بیٹھو۔'' اس نے متوقع خدشے کا اظہار کیا اور ساتھ ہی خوف سے جھرجھری بھی لے لی۔

''فکر نہ کرو اب ایسا بھی غائب دماغ نہیں ہوں۔'' وہ اس کے انداز پہ مسکرایا۔

علیشا پچھلی سیٹ پہ بیٹھی خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھیں، نجانے کیوں آج اسے رواحہ کا انداز کچھ بدلا بدلا محسوس ہو رہا تھا، پتہ نہیں وہ پہلے سے ہی ایسا تھا یہ آج وہ ہی اپنے خول سے باہر نکلی تھی تو اپنے علاوہ کسی اور کی ذات کا نوٹس لیا تھا۔

لیکن اسے شک سا گزرا تھا رواحہ کی آنکھوں میں بھی وہی رنگ اترے تھے جو بھی شارق کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر اترا کرتے تھے، جسے وہ اپنا وہم سمجھ کر بار بار جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اپنی سوچوں میں غلطاں سفر کب تمام ہوا اور وہ مطلوبہ منزل پہ پہنچ گئے اسے خبر تک نہ ہوئی، نور کی غالباً کوئی اپنی جاننے والی نظر آ گئی تھی جو وہ گاڑی سے اترتے ہی اس کی طرف لپک گئی تھی، اسے لامحالہ رواحہ کا انتظار کرنا پڑا، جو گاڑی پارک کر کے اسے لاک کر رہا تھا۔

وہ چونکہ یہاں نو وارد تھی کسی سے جان پہچان بھی نہیں تھی، منہ اٹھا کر اکیلی تو اندر جا نہیں سکتی تھی اسی لئے اس کے انتظار میں رک گئی۔

''چلیں۔'' وہ گاڑی پارک کر کے سیدھا اس کی طرف آیا تھا۔

''جی!'' وہ اس کے ساتھ چل پڑی، اس کے ہمراہ قدم ملا کے چلنا رواحہ کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

ریسپشن پہ ان کی ملاقات ایک سوبر سی خاتون سے ہوئی تھی جنہوں نے ان دونوں کو دیکھ کر چہرے پہ نہایت خیر مقدمی مسکراہٹ سجا لی تھی۔

''کیسے ہو رواحہ! اور یہ اتنی پیاری سویٹی کون ہے کہیں چپ چاپ شادی تو نہیں کروالی۔'' علیشا کو گلے لگاتے ہوئے انہوں نے ہنستے ہوئے رواحہ کو چھیڑا تھا۔

''فکر نہ کریں آنٹی! ولیمہ دھوم دھام سے کروں گا۔'' اس نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''نائی بوائے ابھی تو کل مجھے ندرت بتا رہی تھی کہ رواحہ شادی کے لئے نہیں مان رہا ورنہ میں تو آج ہی اس کی شادی کر دوں۔'' وہ کافی سے زیادہ باتونی لگ رہی تھی۔

شکر تھا کہ اتنی دیر میں اور لوگ آ گئے تو وہ ان سے ملنے لگ گئیں، اندر تو رنگ و بو کا ایک سیلاب امڈا آ رہا تھا، ہر طرف رنگین آنچل لہرا رہے تھے، قہقہے بلند ہو رہے تھے، کہیں سے دھیمی ہنسی کی آوازیں ابھر رہی تھیں تو کہیں چوڑیوں کی کھنک سنائی دے رہی تھی، اس نے متلاشی نظروں

سے نور کو تلاشنا چاہا، اس کو یہاں لا کر وہ خود پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔

''آپ اگر نور کو تلاش کر رہی ہیں تو ایسا کرنا بے کار ہے وہ اب اتنی جلدی ملنے والی نہیں ہے۔'' رواحہ اس کی متلاشی نظروں کا مصداق جان گیا تھا، اسی لئے آگاہ کرنا ضروری سمجھا، اس کی بات سن کر اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

''اس بدتمیز کو تو میں گھر جا کر پوچھوں گی میں یہاں لوگوں کو دیکھنے اور دیواروں سے باتیں کرنے تو نہیں آئی، محترمہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہیں۔'' اس نے دل ہی دل میں نور کو ڈپٹ کے اپنا غصہ کم کرنا چاہا۔

''بٹ آپ پریشان مت ہوں، میں آپ کو کمپنی دوں گا، آیئے وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے وہ اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا، اسی لئے بڑی اپنائیت سے کہتے ہوئے اس نے سامنے رکھی چیئرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تھینک یو۔'' وہ جب اس سے اتنے اخلاق سے پیش آ رہا تھا تو اتنی مروت نبھانا بھی اس کا بھی حق بنتا تھا، اس نے رش سے قدرے الگ چیئرز اور ٹیبل کا انتخاب کیا تھا۔

''آئی تھنک کافی عرصے بعد آپ کسی فنکشن کو اٹینڈ کر رہی ہیں۔'' اس کے سامنے چیئر سنبھالتے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

''ہاں واقعی بہت عرصے بعد۔'' وہ دل میں حساب لگاتے ہوئے بولی۔

دھیان ایک دفعہ پھر پیچھے کی طرف گیا تھا لیکن رواحہ کی آواز نے اسے خیالات کی دنیا میں پہنچنے نہیں دیا تھا۔

''مصروفیت اور حالات اپنی جگہ لیکن کبھی کبھار ماحول بدل لینے سے کوئی حرج نہیں ہوتا بلکہ صحت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔'' وہ شاید اس کی اور نور کی بحث سن چکا تھا جو یہاں آنے کے متعلق ہو رہی تھی اسی لئے اپنے خیال کا اظہار کر رہا تھا۔

''شاید آپ کی بات ٹھیک ہی ہو۔'' وہ مبہم سے انداز میں بولی۔

''شاید نہیں یقیناً۔'' وہ نہایت وثوق سے بولا تھا۔

''مجھے دیکھئے میری لائف کتنی بزی ہے لیکن پھر بھی میں فنکشن وغیرہ ضرور اٹینڈ کرتا ہوں۔'' وہ ہلکی پھلکی باتوں سے اسے ترغیب دلا رہا تھا۔

''بس میری دلچسپی نہیں رہی۔'' وہ یاسیت سے بولی، آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تھی۔

''تو دلچسپی پیدا کریں ناں، نور کو دیکھئے تقریباً آپ کی ہم عمر ہے بلکہ دو تین سال بڑی ہو گی لیکن ابھی تک بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہے اور آپ نے اتنی سی عمر میں خود پر بڑھاپے کو طاری کر لیا ہے دس از ناٹ فیئر علیشا! زندگی کو ایسے نہیں جیا جاتا۔'' آخری جملہ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا، علیشا نگاہیں چرا گئی۔

''پتہ نہیں لیکن اب تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے زندگی مجھے گزار رہی ہے۔'' وہ نگاہیں جھکائے مدھم لہجے میں گویا ہوئی۔

''آپ کو پتہ ہے آپ کی سب سے بڑی غلطی کیا ہے؟'' وہ ہنوز نگاہیں اس پہ مرکوز کیے ہوئے تھا، جس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کسی گہرے زخم کی عکاسی کر رہے تھے۔

''کیا؟'' سوالیہ نگاہیں بے ساختہ اس کی طرف اٹھی تھیں۔

''آپ کی بزدلی۔'' وہ یقین سے بھرپور انداز میں بولا تھا۔

''میری بزدلی۔'' اس کی آنکھوں میں حیرت واستعجاب کا دریا امڈ آیا تھا، جس کے بہت پیچھے کہیں دکھ کے سائے پہ لہرا رہے تھے۔

''ہاں آپ کی بزدلی، آئی ڈونٹ نو آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، لیکن اس دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جنہیں آپ سے بھی بڑے غم ملے ہوں، جنہیں زندگی نے آپ سے بھی بڑا دھوکہ دیا ہو گا لیکن وہ یوں آپ کی طرح ہار کر بیٹھ نہیں جاتے، بلکہ آزمائش کی بھٹی میں کندن بن کر اسی سے داد وصول کرتے ہیں اور ایسا کام بزدل نہیں بہادر لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وہ دونوں اس موضوع پہ آ گئے جسے زیر بحث لانے کا دونوں کا ارادہ و خیال نہیں تھا۔

''جب پاؤں کے نیچے زمین اور آسر کے اوپر آسمان نہ ہو ناں تو انسان ہمت ہار ہی جاتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں بے بسی ہلکورے لے رہی تھی۔

''یہی تو آزمائش کا وقت ہوتا ہے اگر آپ پہلے قدم پہ ہی ڈھے جائیں گے تو اتنی کا سفر کیسے طے کریں گے۔'' وہ بڑی خوبصورتی سے اسے سمجھا رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں شاید، میں واقعی بزدل ہوں۔'' وہ ہار مان کے بولی تھی، رواحہ اس کے معصومیت بھرے انداز پہ بے ساختہ مسکرا اٹھا، اس سمے اسے ٹوٹ کر پیار آیا تھا اس پر۔

''چلیں شکر ہے آپ نے کچھ تو تسلیم کیا۔'' مسکراہٹ لبوں میں دباتے ہوئے وہ ماحول پر چھائی سنجیدگی کو یکدم ختم کر چکا تھا۔

''ویسے آپ ایک بات تو بتائیں، یہ ہر بات میں آپ ضد کیوں کرتی ہیں۔'' بظاہر تو اس نے اپنا لہجہ بہت سنجیدہ بنایا ہوا تھا لیکن آنکھوں سے واضح شرارت ٹپک رہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' اس نے متعجب ہو کر دریافت کیا، وہ واقعی اس کی بات نہیں سمجھی تھی۔

''بھئی سیدھا سا مطلب ہے، پہلے یہاں آنے پہ ضد، پھر شاپنگ پر ضد، پھر ڈریسز پر ضد اور یہ بات بھی میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اتنا تیار ہونے پر بھی آپ نے خوب ضد کی ہو گی۔'' اس کے لہجے میں واقعی یقین بول رہا تھا۔

اس کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ بے ساختہ دھیمے سروں میں مسکرا اٹھی اور رواحہ کے دل نے بھی بے اختیار کئی بیٹس ایک ساتھ مس کی تھیں۔

''مسکراتی رہا کریں، مسکراہٹ زندگی کی علامت ہوا کرتی ہے اور زندگی تو زندہ دلی کا نام ہے وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔''

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

''جی ضرور۔'' اس نے آہستگی سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

اس نے محسوس کیا واقعی اسے خود پر چھائی کثافت چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''ڈیٹس گڈ۔'' وہ سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

''ویسے میں سوچ رہا ہوں کہ نور بالکل ٹھیک رہی تھی۔'' اس نے سرسری سا لہجہ اپناتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا؟'' علیشا نے بڑی دلچسپی سے پوچھا تھا۔

''یہی کہ یہ ڈریس آپ پہ بہت سوٹ کرے گا واقعی آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔'' دل میں مچلتی بات کو بالآخر وہ زبان تک لے ہی آیا تھا، علیشا شرم سے گڑبڑا کر نگاہیں جھکا گئی تھی۔

''یہ نور پتہ نہیں کہاں نکل گئی ہے۔'' اس کی

مسلسل نظروں سے گھبرا کر وہ جزبز ہو کے ادھر ادھر نگاہیں دوڑا کے نور کو کھوجنے لگی تھی، رواحہ کے لبوں پہ بڑی محظوظ سی مسکان نمودار ہوئی تھی۔

وہ جو نور کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھی، یکدم اس کی نظر سامنے سے آتے ایک جوڑے پہ پڑی تھی اور پل بھر میں ہی اس کا چہرہ فق ہو گیا، پوری شدت سے اس کا جی چاہا تھا کہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر وہ یہاں سے بھاگ جائے مقابل کی نظروں سے غائب ہو جائے لیکن لاکھ کوشش اور چاہنے کے باوجود بھی وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہل سکی تھی۔

اسی اثناء میں مقابل کی نظر بھی اس پہ پڑ چکی تھی، اس کی آنکھوں میں پہلے استعجاب اور پھر تمسخر کا رنگ اترا تھا، وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھا، ساتھ کھڑی لڑکی نے اس کا بازو کھینچ کر اس کی توجہ کسی جانب مبذول کرنا چاہی تھی، لیکن اس کے مسلسل آگے بڑھنے پر وہ بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اسے دیکھ چکی تھی۔

''اوہ۔'' اس نے بڑے طنزیہ انداز میں ہونٹوں کو سکیڑا تھا۔

''علیشا! کیا ہوا؟ آر یو اوکے؟'' رواحہ اس کی پل پل متغیر ہوتی رنگت کو دیکھ کر ایکدم پریشان ہوا تھا۔

اس نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر کچھ کہنے کی کوشش میں بولنا چاہا تھا، لیکن لگ رہا تھا کہ زبان تالو سے جا چمٹی ہے اور حلق میں لاکھوں ببول کے کانٹے اگ آئے ہوں۔

''اوہ...... تو تم یہاں ہو۔'' تب تک وہ اس کی ٹیبل کے پاس پہنچ چکا تھا۔

رواحہ نے عقب سے آتی آواز پہ چونک کر پیچھے دیکھا تو سامنے ایک خوش شکل نوجوان کھڑا تھا، جس کی نگاہیں علیشا پر جمی تھیں، اس کے بازو میں بازو ڈالے ساتھ ایک لڑکی بھی چپکی کھڑی تھی، جو انتہائی ماڈرن اور بے باک ڈریس پہنے ہوئے تھی۔

''میں بھی کہوں علیشا بی بی کدھر غائب ہو گئی ہیں، اب پتہ چلا تم تو یہاں چھپی بیٹھی ہو۔'' اس کا لہجہ انتہائی تمسخر اڑاتا ہوا تھا۔

''ایسی لڑکیوں کا کیا بھروسہ، جہاں چاہا منہ مار لیا۔'' ساتھ کھڑی لڑکی نگاہوں میں حقارت و تذلیل لئے ناک سکوڑ کر طنز سے بولی تھی۔

''ایکسکیوز می، کنٹرول یور لینگویج۔'' رواحہ کی قوت برداشت جواب دے گئی، وہ زور سے کرسی پیچھے دھکیل کے کھڑا ہوا تھا۔

وہ دونوں شاید اس کی موجودگی سے بے خبر تھے، یا اس پر دھیان نہیں دے پائے تھے، چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''اوہ تو آپ ہیں اس کے ساتھ۔'' لڑکی نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''جی!'' وہ غصہ دباتے ہوئے دانت پیس کر بولا تھا۔

''اس دفعہ تو لگتا ہے اونچا ہی ہاتھ مارا ہے علیشا بی بی نے۔'' رواحہ کی پرسنالٹی سے متاثر ہونے کے باوجود وہ طنز کرنا نہیں بھولی تھی۔

''میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کنٹرول یور لینگویج، میں صرف فی میل ہونے کی وجہ سے آپ کا احترام کر رہا ہوں، لیکن آئی تھنک آپ کو عزت راس نہیں ہے۔'' اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ اس کا شعلوں میں گھرنا لازمی تھا۔

''دیکھ رہے ہو تم، کیسی بھری محفل میں یہ میری انسلٹ کر رہا ہے۔'' احساس توہین سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا، وہ غصے سے اپنا بازو اس سے چھڑواتے ہوئے اسی پر چڑھ دوڑی۔

''چھوڑو میری جان، اس عورت کا جادو ہی ایسا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے، میں بھی ایسے ہی ساری زندگی اس کے لئے پاگل ہوتا رہا، لیکن اس عورت کے پاس سوائے حسن کے اور کچھ نہیں حتیٰ کہ کردار بھی نہیں کیونکہ......'' اس کی باقی بات منہ کے اندر ہی رہ گئی تھی۔

کیونکہ رواحہ نے پوری قوت سے اس کے جبڑے پہ گھونسہ مارا تھا، وہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہیں تھا، الٹ کر پیچھے گرا، پیچھے ٹیبل پر پڑا تھا، جس سے اس کا سر ٹکرایا خون کی پتلی سی لکیر اس کی ناک سے نکل کر بہنے لگی تھی، سر میں بھی کافی چوٹ آئی تھی۔

لیکن رواحہ نے اسی پہ اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اپنے بھاری بوٹوں سے اس کی اچھی خاصی دھلائی کر ڈالی تھی، اس کے ساتھ کھڑی لڑکی نے چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔

نور کے کانوں میں بھی شور شرابے کی آواز پڑی تھی، وہ بھی سب کے ساتھ بھاگم بھاگ جائے وقوعہ پہ پہنچی تھی، لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا تھا، وہ فوراً رواحہ کی جانب لپکی تھی، لیکن اس سے پہلے ہی دوسرے حضرات نے اسے زبردستی پیچھے کھینچ لیا تھا۔

رواحہ کو خود اپنی کیفیت سمجھ نہیں آ رہی تھی، اس کے سر پہ تو بس خون سوار تھا، تہمینہ اور قاسم ابھی کچھ دیر قبل ہی پہنچے تھے وہ بھی افتاں و خیزاں یہاں تک پہنچے تھے۔

قاسم صاحب نے بمشکل اسے بٹھا کر پانی کا گلاس پلایا تھا، وہ خود اس قدر متحیر تھے کہ ہر حالت میں پرسکون رہنے والے رواحہ کو آخر کیا ہو گیا کہ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔

''ماما...... پاپا...... علیشا کو دیکھیں۔'' نور کی چیخ نما آواز پہ تہمینہ نے بے ساختہ اپنے دل پر ہاتھ رکھا تھا اور فوراً نور کے پیچھے لپکی تھیں، علیشا چیئر سے نیچے گری بے ہوش پڑی تھی، شادی کا اچھا خاصا بارونق فنکشن یکدم بدمزگی کا شکار ہو گیا تھا، قاسم صاحب نے فوراً گاڑی نکالی تھی اور علیشا کو لے کر ہسپتال پہنچ گئے تھے۔

(باقی اگلے ماہ)

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیے
ابن انشاء
اردو کی آخری کتاب .... ☆
خمار گندم .... ☆
دنیا گول ہے .... ☆
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☆
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☆
چلتے ہو تو چین کو چلیے .... ☆
نگری نگری پھرا مسافر .... ☆
خط انشا جی کے .... ☆
بستی کے اک کوچے میں .... ☆
چاند نگر .... ☆
دل وحشی .... ☆
لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور
فون نمبرز 7321690-7310797

اک جہاں اور ہے

سدرۃ المنتہیٰ

نویں قسط کا خلاصہ

ایک جوبیس سالہ نوجوان گھر سے باہر جانا چاہتا ہے پڑھائی کے سلسلے میں، کبیر احمد اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے ہیں۔

ہالار اپنے دوست جوزف سے پاکستان جانے کی بات کرتا ہے جوزف اس سے ایک لڑکی کے بارے میں پوچھتا ہے، ہالار کا کہنا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔

امرت حنان کو شادی کے لئے ہاں کہہ دیتی ہے اور مس یاسمین اور عمارہ کو لے کر فنکار کے گھر جاتی ہے انٹرویو کے کرنے۔

نواز حسین علی گوہر کو زخمی حالت میں دیکھ کر اٹھا کر ہسپتال اور بعد میں گھر لے جاتا ہے۔

امرکلہ پروفیسر غفور کی غیر موجودگی میں گھر لوٹتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیئے

دسویں قسط

”انسان ہمیشہ اڑنے کے لئے پر کھولتا رہتا ہے، جب ہم زمین پر ہوتے ہیں تب نگاہ آسمان پر ہوتی ہے مگر جب انسان بلندی پر پہنچتا ہے تو نظر بلندیوں کے نیچے زمین پر ہوتی ہے، یہاں سے انسانی ذات کا ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے، وہ سفر جو بلندی سے پستی کی طرف جاتا ہے، یہ سفر واپسی کا ہوتا ہے اور میں اپنے سفر کی واپسی پر ہوں۔“ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ سیدھے ہوئے جہاں پر بات ختم ہوئی تھی، وہ وہیں سے بات شروع کرنے لگے تھے۔

”کچھ کہانیاں وہاں سے شروع ہوتی ہیں، جہاں پر کہانی ختم ہوتی ہے۔“

ان کی کہانی بھی وہیں سے شروع ہونے لگی جہاں پر کہانی ختم ہوئی تھی، امرت کہانی کو پلٹنے کے لئے پہلے کہانی کی بات کی، وہ کچھ لمحے خاموش رہی، پھر ان کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

”تو پھر یہ بتائیے کہ کہانی کیا ہے؟“ امرت نے ٹانگ پر ٹانگ جمائے ان کی آنکھوں میں ایسے جھانکا تھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ حقیقت کیا ہے؟

”کہانی ایک اختلاف ہے۔“ فنکار کو پتہ تھا وہ کہانی کو کچھ اور طرف لے جانے لگی ہے، (حقیقت واقعی ایک اختلاف ہے)۔

”وہ اختلاف ہے کہانی جو ہمیں اپنی اور معاشرے کی کمزوریوں سے ہوتا ہے، جب ہم خود سے اور دوسروں سے لڑنا چاہتے ہیں بیٹے تب ہم کہانی لکھتے ہیں، مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں لڑ نہ سکا تھا تب میں نے کہانی لکھی تھی، اس کے بعد جب بھی میں نے خود کو بے بس محسوس کیا، تب بھی کہانی لکھی، جب ہم کچھ بولنا چاہتے ہیں، جب ہم کام کرنا چاہتے ہیں، یا سوچنا چاہتے ہیں، تب ہم کہانی لکھتے ہیں۔“ وہ لکھتے ہوئے سامنے دیوار پر نظریں جمائے ہوئے تھے، اتنے دن بعد انہیں احساس ہوا کہ دیوار کے اس کونے میں دونوں دیواروں کے درمیان ایک دراڑ سی پڑ گئی ہے، جس سے دونوں دیواروں کے درمیان سوراخ سا بن گیا ہے، ایسے جیسے دیمک لکڑی کو چاٹ لیتی ہے ویسے دیوار میں سے مٹی گارا چونا جھڑ رہا تھا اور ہول جیسے جیسے بڑا ہوگا دیوار اور کمزور ہوگی، وہ پریشان سے ہوگئے یہ سوچ کر۔

”اس سفر میں آپ کہاں تک کامیاب ہوئے سر؟“ وہ پوچھنا کچھ اور چاہ رہی تھی، مجبوراً پوچھ کچھ اور رہی تھی۔

”بات کامیابی یا ناکامی کی نہیں ہوتی، بات یہ ہوتی ہے کہ ہمارے خیال فارورڈ ہوتے رہیں، لوگوں تک پہنچیں، بات تو فقط کوشش کی ہوتی ہے، تعارف تنقید تجزیہ توجہ یہ سب اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں، بات یہ ہے کہ آپ کا پیغام ویسے ہی پہنچے جیسے آپ پہنچانا چاہ رہے ہوں، یہ آپ کی دیانت داری پر منحصر ہوتا ہے اور یقین جانو امرت بچے اگر آپ دیانت دار ہیں تو آپ کا ریڈر آپ سے زیادہ دیانت سے اس پیغام کو تھام لیتا ہے، بات شاید پیغام کی بھی نہیں بات احساس کی ہے، آپ کا احساس فارورڈ ہوتا ہے اور نہ سوچنے والا سوچنا شروع کر دیتا ہے۔“ ان کی نظر دیوار سے ہٹ کر اس طرف ہوگئی جہاں مس یاسمین بیزاری سے برے سے منہ بناتے ہوئے اردگرد نظریں گھما رہی تھیں، عمارہ کسی اور ٹون میں خیالات میں گم تھی، اس کا ذہن کہیں اور ہی گھوم رہا تھا، جب کہ امرت پوری توجہ سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی بغور، وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے بظاہر اس کے

سوالوں کے تفصیل سے جواب دیتے ہوئے بھی وہ خود کو غیر مطمئن سا محسوس کر رہے تھے کیونکہ اس لڑکی کا لہجہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا، کچھ کریدتا لہجہ، کچھ محسوس کرتا اور کراتا، کچھ رکھائی لئے ہوئے عجیب سا۔

”آپ پر، آپ کی کہانی پر ہمیشہ شدید نفرت اور شدید محبت کی طرح شدید تعریف اور تنقید کا دور رہا ہے، اس کی وجہ یقیناً آپ کے اندر کی شدت پسندی ہی ہوگی؟“ اس سوال کا جواب بھی اس نے خود ہی دے دیا تھا، اس لئے وہ خاموشی سے مسکرائے۔

”کہانی کا سفر کتنا اذیت ناک ہوتا ہے؟“ یہ سوال بھی تھا اور جواب بھی۔

”آج کی کاروباری کہانی کا سفر اذیت ناک نہیں ہے امرت، لکھاری کھانا چاہتا ہے اور کہانی اسے کما کر دے رہی ہے مگر امرت اس کھینچا تانی میں کہانی اپنے اندر کی نرمی اور گہرائی کھو رہی ہے، اب آج کا لکھاری مجبور بھی ہے اسے معاملات زندگی نبھانے کے لئے ایسا کرنا ہے، ورنہ وہ کہاں سے کھائے، کہانی پیٹ نہیں بھرتی، ہاں کہانی اور کئی خالی جگہوں کو پر کرتی ہے، اس کا ہونا اشد ضروری ہے، اگر ہمارے وقت کی بات کرو تو صرف جلے اور جل کر راکھ بھی ہوئے، مگر جل کر کندن بھی ہوئے، اتنے جلے کہ پک گئے اچھی طرح سے، جیسے پکا ہوا پھل ہوتا ہے، میٹھا ذائقہ دار، مگر اب جل جل کر ایسے پکے کہ جلنے کا کوئی اثر نہیں ہے آگ اپنا اثر کھو چکی اور پانی سر سے اونچا ہونے کے بعد گزر بھی گیا، اب صحرا جیسا ٹھہراؤ ہے، لاکھ نہر میں پتھر پھینکو، صرف بھنور ہی پیدا ہوتا ہے، آج کل تالاب کی مچھلی پکڑ میں نہیں آتی، زمین کے آخری تہہ سے لگی ہوئی سو رہی ہے، جس پر موت کا گمان ہے۔“ لہجہ عجیب سا ہو گیا ٹھہرا ہوا بہت گہرا، جیسے بہت دنوں بعد ان کے اندر کا فنکار بیدار ہو کر بول رہا تھا۔

”ہمیشہ الجھے رہے اور لوگوں کو الجھا دیا، اپنی کہانی کو اختتام نہیں دیا، ہمیشہ کہانی کو لکھتے لکھتے چھوڑ دیا کیوں؟“

(یہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کی کہانیوں کے اینڈ نہیں ہوتے، کہانی چلتے چلتے رک جاتی تھی اچانک بے ساختہ)

”میں نے اختتام کو پڑھنے والے پر چھوڑ دیا، جو جیسا چاہے کر دے۔“ وہ اب کی بار مسکرا نہ سکے تھے۔

”میں نے ہمیشہ آپ کی کہانیوں کے اختتام خود سے الگ کاغذ پر لکھ کر کہانی کے بیچ رکھ دیئے، کبھی سوچا جب آپ تک پہنچے گا کوئی خط تو اس میں رکھ دوں گی، آج تک وہ کہانیاں میرے پاس محفوظ ہیں۔“

”تم کتنی اچھی ہو، ایک اور لڑکی بھی تھی وہ بھی میری کہانیوں کے اختتام لکھتی تھی اس نے بھی مجھے کئی خط لکھے مگر بھیجا ایک بھی نہیں تھا۔“

”میں سمجھی کہ اکیلی ایسے میں ہی ہوں...... خیر۔“

”اتنی شدت، اتنا غم، اتنی آوارہ گردی اتنی گہرائی اور محبت، ان کی بہت سی وجوہات ہوں گی، کوئی ایک وجہ بتا دیں جو میں پیپر میں لکھ سکوں۔“

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

’’جو معاشرے نے ہمیں دیا، وہ ہم نے لوٹایا، لوگ کہتے تھے آپ آسان کب لکھیں گے؟ میں کہتا تھا جب ہمیں آسانیاں ملیں گی۔‘‘

’’مشکل پسندی کو ہم عام زبان میں ایب نارملٹی بھی کہتے ہیں۔‘‘ وہ پہلی بار مسکرائی تھی۔

’’امرت بیٹے ہم میں اگر کوئی مختلف ہوتا ہے تو...... یا تو وہ واقعی ایب نارمل ہوتا ہے یا پھر سارے ایب نارمل لوگوں کے بیچ وہی ایک نارمل ہوتا ہے جو ہٹ کر سوچتا ہے، جو سچ کہنا اور سچ سننا چاہتا ہے، اسے معاشرے کے اصولوں اور روایتوں منافقتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔‘‘

’’ہم بھی آپ سے سچ سننے آئے ہیں سر!‘‘ اب اس کی مسکراہٹ پھیکی تھی۔

’’میں سچ ہی بولنے کی کوشش کر رہا ہوں امرت۔‘‘ وہ مسکرا نہ سکے۔

☆☆☆

ماں نے اس کا نام کبیر احمد رکھا تھا، اس کی ماں کمار خاندان سے تھی اور باپ اس کا ’’سید زادہ‘‘ اور سید زادہ جو سالوں کمہارنی کے سحر میں مبتلا رہا، وہ کمہارنی کے حسن نہیں اس کی شخصیت میں گم تھا، کمہاری حالانکہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے حسن میں بھی بے مثال تھی، کچے مٹی کے برتن گھڑتے وقت اللہ اللہ کرنے والی پہلی نظر میں اس کے دل کو بھائی تھی، اس کو پڑوس والے اللہ والی کہتے تھے، کیونکہ اس کو بچپن سے ہی کچھ حوابات ملتی تھیں، اسے خواب آتے تھے اور آوازیں بھی، وہ ساری رات اپنی کوٹھی میں ایک کونے سے لگی کانپتی رہتی، اسے ان آوازوں سے پہلے پہل ڈر لگتا تھا وہ چیختی تھی مگر آہستہ آہستہ عادی ہوئی گئی، اس کے پاس کوئی علم نہ تھا نہ ہی وہ عبادت گزار تھی، ہاں مگر کردار کی بہت صاف اور سچی تھی، وہ جھوٹ سے کوسوں دور بھاگتی تھی، ہاں اس نے اپنے بیمار ابے کی بڑی خدمت کی ہوئی تھی، کمہارنی شریف ماں باپ کی شریف اور با اخلاق اولاد تھی اس کا ابا بڑا ہی عبادت گزار تھا اور ماں بھی نیک تھی اس کو یہ شرافت ورثے میں ملی تھی، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کمہارنی کا اخلاق اس کے خون سے رچا بسا تھا۔

سید صاحب ایک بار ان کے ہاں سے برتن لینے آئے اور کمہارنی پر دل ہار گئے، کمہارنی نے تو کسی مرد کو کبھی غور سے نہ دیکھا تھا، اس نے برتن برآمدے کے ستون کے ساتھ رکھے اور آدھا چہرہ چھپائے دوپٹے کا پلو منہ میں دبائے سر جھکائے آگے بڑھ گئی اور برآمدے کے ستون کے ساتھ رکھی پوٹلی میں سید صاحب چند سکوں کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی رکھ آئے تھے۔

کئی دن تک سید صاحب گھر سے نہ نکلے، پھر ایک دن اپنی بوڑھی ماں کہ کہہ دیا کہ شادی کریں گے اور کمہارنی کے ساتھ ہی کریں گے، ماں جو سالوں سے سید صاحب علی احمد کی شادی کے خواب دیکھتی تھی اور علی احمد راضی نہ ہوتا تھا کیونکہ اسے ذات کی سید زادی نہیں بلکہ کردار کی سید زادی کی تلاش تھی، لڑکیاں تو سید صاحب کے خاندان میں بھی شریف اور معصوم ترتھیں مگر کمہارنی کا سحر دل پر ہی نہیں دماغ پر بھی چڑھ گیا تھا اور سر چڑھ کر بول رہا تھا، پھر یہ ہوا کہ علی احمد کی چند لوگوں پر مشتمل بارات کمہارنی کے گھر کی چوکھٹ پہ آ پہنچی۔

سید صاحب جیسے آدمی کے لئے انکار تو سوچا بھی نہیں جاتا تھا، کمہاروں کا خاندان سر اونچا کر کے چل رہا تھا کہ سید صاحب نے ان کے گھرانے کی چوکھٹ کو کیا عزت بخشی تھی، پھر کمہارنی سید صاحب کے نکاح میں آ گئی اور سید صاحب کے نکاح میں آنے کے بعد اس کے اندر کی اچھائی نکھر کر سامنے آ گئی، کیفیات کو عبادت کا نام ملا، وہ سید کے رنگ میں رنگ گئی اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ سوئی ہوئی ہوتی اور اس کے اندر سے اللہ کی آواز سانس لینے کی آواز میں سے آ رہی ہوتی ذکر کی کثرت اتنی پختہ تھی بظاہر وہ تسبیح لئے نہیں پھرتی تھی، مگر دل اس کا ہمہ وقت تسبیح کرتا رہتا تھا، کمہارنی اس خاندان میں سید زادیوں سے بھی بازی لے گئی تھی۔

کچھ سالوں کے بعد کئی منتوں کے بعد سید صاحب کے ہاں اولاد ہوئی تھی جس کا نام ماں نے رکھا تھا کبیر احمد اور کبیر احمد کو روح کی روشنی ماں اور باپ دونوں سے ورثے میں ملی تھی۔

کبیر احمد کے باپ دادا نے کوئی چلہ وظیفہ نہیں کاٹا تھا، مگر سید صاحب کے والد کے خواب میں مسائل کے حل مل جاتا تھا، ان کی کوٹھی کئی طرح کے فقیروں پیروں مریدوں سے بھری رہتی تھی، کوٹھی کیا غریب خانہ تھا، جہاں لنگر چلتا تھا، جو آتا وہ پک جاتا بانٹا جاتا، تقسیم ہو جاتا، رات تک مکان کے اندر صرف اللہ پاک کا پاک نام ہوتا اور اگلے دن کی خوراک کی فکر سے پاک سخی صاحب سکون کی نیند سو جاتے تھے۔

دوسرے دن خوراک کا انتظام ہو ہی جاتا، جتنے آتے کھا کر جاتے اور پیٹ بھر کر کھاتے خوش ہو کر جاتے تھے، سخی سائیں کے بعد سید صاحب کا بھی یہی طریقہ کار تھا اس گھرانے کی سخاوت کو کمہارنی کے حسن سلوک کی سادگی نے چار چاند لگا دیئے تھے، کمہارنی کے منہ سے سچ بے ساختہ نکل جاتا تھا، ایسے کئی راز جو سید صاحب کے سامنے کھلے وہ راز میں رہے اور جو جوہر کمہارنی نے دیکھے وہ بھی راز میں رہے، قدرت ساری اللہ پاک کی، طاقت بھی اسی کی، حکمت بھی اسی کی، چاہت بھی اسی کی، جو وہ چاہے ہو جائے، جو نہ چاہے وہ نہ ہو، کمہارنی کو کمہارنی اور سید صاحب کو سید صاحب اسی نے بنایا تھا، جب وہ چاہتا اپنے نام سے ناقص العقل بندوں کو عقل دیتا، بشارت دیتا، اشارے دیتا، طاقت دیتا اور جب چاہے جھکا دیتا، گرا دیتا، بجھا دیتا، اس کی رضا کی رحمت سے کمہارنی کے گھر کا دیہ جلتا ہی رہتا تھا اور سخی سائیں کے گھر کی سخاوت کے چرچے چار سو اور چلتے رہے فیض ملتا رہا اور فیض بٹتا رہا۔

☆☆☆

’’اتنے بڑے گھر میں آپ اکیلے رہتے ہیں؟‘‘ مس یاسمین اکتا کر بھی تھک گئی تھی کرسی کچھ آگے کھینچ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

’’آپ کی فیملی؟‘‘

’’میرا ایک بیٹا ہے جو میرے ساتھ ہوتا ہے، کچھ سالوں سے باہر ہے، آنے والا ہے اب۔‘‘

’’آپ کی بیوی، جس سے آپ کی علیحدگی ہو گئی، سنا ہے دو شادیاں کی تھیں آپ نے؟‘‘ مس یاسمین بڑی دلچسپی سے پوچھنے لگیں۔

’’میری بیوی مر گئی ہے، کئی سال پہلے جب میرا بیٹا چھ سال کا تھا۔‘‘

’’اور پہلی بیوی؟‘‘ وہ کہاں چپ رہ سکتی تھیں۔

’’سنا تھا لو میرج تھی آپ کی؟‘‘

“بہت پرانی بات ہے۔” شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ گڑے مردے اکھاڑے جائیں۔

“مگر ہے تو سچ نا۔” وہ بے وجہ ہنسی تھیں۔

عمارہ اپنے خیالوں سے نکل کر پوری توجہ سے سن رہی تھی اور امرت کے چہرے پر کچھ ناگواری تھی مگر اس نے مس یاسمین کو ٹوکا نہیں تھا، وہ چاہتی تھی کہ جو سوال وہ نہیں پوچھ پا رہی وہ وہی پوچھ لیں۔

“وہ شادی ناکام کیوں ہوئی؟”

“نوجوانی کے اکثر تجربے ناکام ہو جاتے ہیں، مگر تجربات کچھ اتنے برے بھی نہیں ہوتے، کرنے چاہئیں۔” وہ کندھے اچکاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

“مجھے میری ہی زبان میں جواب دیں پلیز مجھے عربی فارسی سمجھ میں نہیں آتی۔” وہ بھی کمال تھیں۔

“میرے خیال سے میں اردو میں ہی بات کر رہا ہوں، اردو مگر مشکل والی، میں آپ سے پوچھ رہی ہوں آپ کی پہلی شادی کیوں ناکام ہوئی کیا وجہ تھی، کیا اختلاف تھا جب آپ نے محبت سے کی تھی، سنا تھا سب کچھ چھوڑ آئے اس کے پیچھے گھر جائیداد، نام شہر۔”

“گھر جائیداد اور شہر چھوڑنے کی اصل وجہ وہ نہیں تھی، رہی بات اختلاف کی تو وہ کہاں نہیں ہوتا، اعوان میں عوام میں انسان میں، اختلاف تو ہر جگہ پر ہوتا ہے۔” وہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے مگر رخ ان ہی کی طرف تھا۔

“آپ کو نہیں لگتا کہ آپ بات ادھوری اور مشکل کرتے ہیں؟” مس یاسمین کے کہنے پر وہ مسکرائے اور عمارہ اور امرت بھی بے ساختہ مسکرائیں تھیں۔

“سچ مشکل بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھار ادھورا بھی۔”

“مطلب کہ محبت میں ناکامی ہوئی۔” مس یاسمین کے چہرے پر افسوس تھا اور امرت سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

“محبت میں نہیں، ازدواجی زندگی میں ناکامی ہوئی۔”

“علیحدگی کا سبب کون بنا، آپ یا وہ؟”

“جب دو انسان ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ پاتے تو الگ ہو جاتے ہیں، ہم نے بھی یہی کیا اور اچھا کیا، نہ وہ میری توقعات پر پورا اتری، نہ میں اس کی توقعات پر پورا اترا، خاموشی سے الگ ہو گئے۔” وہ کچھ اور بھی سننا چاہ رہی تھیں۔

“خاموشی سے میرا مطلب ہے بغیر احتجاج کیے، باقی اس خاموشی کے پیچھے اختلافات ضرور تھے۔”

“جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سارے سوالات انٹرویو کا حصہ ہی ہیں۔”

“ظاہر ہے اب صرف کہانی کہانی کی تکرار تو بور کر دیتی ہے کچھ تو ٹیسٹ بھی ہو۔” مس یاسمین مسکرائیں۔

“لوگوں کی زندگیوں کے تلخ حقائق کیا ٹیسٹ دیتے ہیں۔”

“ہم ہمیشہ لوگوں کی نجی زندگیوں میں ہی کیوں دلچسپی رکھتے ہیں۔” عمارہ تلخ ہوئی تھی۔

“ہم یہ سوال نہیں دیں گے سوالنامے میں۔” اس نے فیصلہ سنایا۔

“مجھے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔” ان کا چہرہ بجھ سا گیا۔

“اس انٹرویو کے بعد ہونے والی باتوں کو سننے کے لئے شاید میں نہ رہوں، میں نے کہا تھا کہ میری زندگی کا یہ آخری انٹرویو ہو گا، جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیں۔”

“جو پوچھنا نہیں چاہیے وہ کیسے پوچھیں۔” امرت اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

“جو پوچھنا نہیں چاہیے، وہ نہ پوچھو، مگر سمجھ جاؤ۔”

“اوکے سر! آپ سے پھر انٹرویو کے چھپنے کے بعد ملاقات ہو گی۔”

“تب تک شاید میں نہ رہوں۔”

“اللہ نہ کرے۔” امرت کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

“ابھی تو آپ کو بہت جینا ہے، کہانیاں لکھنی ہیں، نئے سرے سے سفر شروع کرنا ہے، ابھی تو آپ نے بہت اڑنا ہے۔” وہ مسکرائی ان کی طرف امید بھرے انداز میں دیکھ کر۔

“کہانی کو جاری رکھنے کے لئے ہمارا ہونا لازم نہیں کہانی مختلف ہاتھوں تک منتقل ہوتی ہے، وعدہ کرو میری کہانیوں کو اب تم لکھو گی، میں تمہیں اجازت دیتا ہوں ایک درخواست کے ساتھ کہ اس کے اچھے اختتام کرنا۔”

“اتنا بھروسہ، پہلی ملاقات میں آپ اپنا سرمایہ مجھے کیسے دے سکتے ہیں۔”

“کچھ کام پہلی ملاقات میں کرنے والے ہوتے ہیں، ہم ان کو اگلی ملاقات پر ٹال کر وقت ضائع کر دیتے ہیں اور اب ضائع کرنے کے لئے شاید میرے پاس وقت نہیں ہے۔”

“اگلی ملاقات کے بہانے ختم کر رہے ہیں آپ۔”

“نہیں بہانہ تو خیر ہے، تم اگلی بار آنا تو انٹرویو کرنے مت آنا صرف ملنے آنا، تب میں تمہیں اپنی ساری کہانیاں سناؤں گا، مگر یاد رہے اس ماہ کے اختتام سے پہلے، کیونکہ اگلے دس دن مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ گزارنے ہیں وہ بڑا جل ککڑا ہے کسی کی موجودگی برداشت نہیں کرے گا، میرے قائم مقام شہزادے سے بھی جلتا ہے۔” وہ آنکھ مار کر مسکراہٹ دبا کر بولے۔

“علی گوہر کا کچھ پتہ چلے تو بتایئے گا۔” عمارہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

“تم اس کے لئے پریشان ہوتی ہو۔” وہ فکر مند ہو گئے لمحے میں۔

“اس کے ماں باپ اس کے لئے پریشان ہوتے ہیں۔”

“اب آئے تو رسیوں سے باندھ لینا اسے، جانے نہ دینا۔”

“اب آئے تو رسیاں کھول دوں گی۔” وہ بڑبڑائی۔

“اگر ہم انتظار کریں تو اگلا بندہ کبھی نہ کبھی لوٹ ہی آتا ہے، مگر انتظار تکلیف دہ ہوتا ہے اس لئے میں تمہیں کہتا ہوں کہ انتظار مت کرنا مگر وہ آئے گا سہی، یہ یقین ضرور رکھنا، یقین ایک اچھی چیز ہوتا ہے، یہ ہمیں جینے کا حوصلہ دیتا ہے، مجھے لگتا ہے تم فکر مند بہت ہوتی ہو، فکر مند ہونا چھوڑ دو۔” امرت بغور حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی، کسی آشنائی اور اپنائیت سے وہ اس سے مخاطب

تھے، عمارہ کچھ کہہ نہ سکی مگر اس کے چہرے پر الجھن ضرور تھی۔

"علی گوہر آوارہ ضرور ہے مگر ہے بڑا اچھا، بس فکریں اور انتظار دیتا ہے، میں بھی ابھی تک انتظار کرتا ہوں اس کا، پلٹ کر نہیں آتا، مگر آئے گا ضرور۔"

"اللہ کرے جلدی آئے، میرے جانے سے پہلے پہلے۔"

"خود انتظار سے روکتے ہیں اور انتظار کرتے بھی ہیں۔" عمارہ پھیکے سے مسکرائی تھی، وہ بھی۔

"مس یاسمین آپ بھی اچھی خاتون ہیں۔" وہ ان کی طرف پلٹے۔

"بہت شکریہ۔" وہ جیسے یہی سننا چاہ رہی تھیں۔

"اور امرت میں تمہارا انتظار کروں گا، اس لئے تم ضرور آنا۔" ان کو اندازہ تھا کہ وہ ان کے کچھ کہنے کی منتظر ہے۔

"آپ انتظار نہ کریئے گا، آپ صرف یقین رکھیے گا، میں آؤں گی۔"

"میں یقین رکھتا ہوں، تم آؤ گی۔" وہ دل سے مسکرائے۔

"تمہیں میں اپنی ڈائری دوں گا۔" جھک کر سرگوشی کی، وہ بچوں کی طرح اسے خوش کر رہے تھے۔

"اور اپنی کہانی بھی سناؤں گا۔"

مس یاسمین اور عمارہ دروازے تک جا کھڑی ہوئیں اور وہ بیچ میں رکی رہی۔

"میں بھی آپ کو اپنی کہانی سناؤں گی۔" وہ بھی انہیں خوش کر رہی تھی۔

"میں تمہاری کہانی سنوں گا، اس طرح ہم اچھے دوست بن جائیں گے، میں ھالار کو بتاؤں گا، وہ جلے گا تم سے۔"

"ھالار!" وہ کچھ چونکی تھی۔

"ہاں ھالار میرا بیٹا۔"

"اوہ......اچھا......نام سنا سنا سا لگ رہا ہے۔"

"وہ آئے گا تو مل لینا۔"

"ضرور، جاتے ہوئے اللہ حافظ، اپنا خیال رکھیۓ گا۔"

"اب تو میں خوب خیال رکھنے لگا ہوں یار، داڑھی بھی منڈھوالی، دیکھو، نوجوانوں کی طرح پھر رہا ہوں۔"

"کوئی مرنے کی تیاری ایسے کرتا ہے بھلا، یہ سب علی گوہر کی فرمائش پر کیا ہے۔" وہ دروازے تک آئے، وہ مسکرائی۔

"تم لوگوں کی گاڑی کہاں ہے؟"

"بورڈ والے اتنے اچھے کہاں کہ ورکرز کو کنوینس بھی دیں۔"

"بورڈ والوں کی خبر تو لیں گے اگر زندگی رہی۔"

"کتنے بے یقین ہیں زندگی کے بارے میں، حالانکہ کہتے ہیں کہ یقین ایک اچھی چیز ہے۔" وہ لاجواب سے ہو گئے امرت کی بات پر۔

"اسی لئے تو یہ یقین ہے کہ سفر کٹنے والا ہے۔" اگلے ہی پل دروازے سے باہر آ کے بولے۔

"میں تم لوگوں کو دفتر چھوڑ آؤں۔" انہوں نے گلی کی نکڑ تک جھانکا کوئی نہ تھا۔

"رہنے دیں آپ اکیلے ایک، ہم دو یعنی گیارہ، تین یعنی تیرہ کے برابر، خود چلے جائیں گے جیسے آئے تھے، مین روڈ نزدیک ہے گاڑی مل جائے گی۔" امرت اللہ حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی، وہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے تینوں کو جاتا دیکھتے رہے۔

"میں اکیلا ایک، تم لوگ دو یعنی گیارہ تین کا مطلب تیرہ۔" وہ مسکرائے دہراتے ہوئے امرت نے دو مرتبہ مڑ کر دیکھا تھا۔

"مڑ کر نہ دیکھا کرو پتھر نہ ہو جاؤ۔" وہ کہنا چاہتے تھے مگر اس کا یوں دیکھنا اچھا بھی لگا، اب وہ نظر سے اوجھل ہو گئیں تو وہ پلٹے۔

"میں اکیلا ایک، دو یعنی کہ گیارہ، تین کا مطلب تیرہ۔" وہ دہراتے رہے۔

☆☆☆

رات نے اپنے پر پھیلائے ہوئے تھے، ہر سو اندھیرا تھا، جب وہ گھر سے بہت دور ریت کے ٹیلے پر بیٹھا ہوا مستقبل کے خواب ترتیب دے رہا تھا جبھی کہیں سے دور ستار کے تار چھیڑنے کی آواز تھی اور سر ہوا میں گھل رہا تھا، روحانی راگ چھڑا تھا اور فضا پر سکون تھی، درگاہ پر ہر جمعے رات کو قوالی اور صوفیانہ کلام گایا جاتا تھا۔

ایسا سرور ایسا سرور کہ سکون ہی آ جائے، جسے نیند نہ آئے وہ سو جائے، جو نیند میں غرق ہو وہ بیدار ہو جائے، سب چپ ہو کر راگ سنتے رہیں اور قرار آ جائے، یونہی نہیں کہا گیا موسیقی روح کی غذا ہے اور موسیقی وہ جو روح کی تاریں چھڑ دے جو موسیقی عموماً گاڑیوں گھروں چوراہوں پہ بجتی ہے، اکثر اوقات وہ موسیقی کے نام پر ہنگامہ ہوتا ہے، مگر موسیقی ایسی جو سر کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی گڑ جیسی میٹھی اور سکون جیسی اطمینان والی ہو تو موسیقی واقعی روح کی غذا ہی بن جاتی ہے، وہ چوبیس سالہ نوجوان آج رات پچیسویں سال میں داخل ہو رہا تھا، ماں نے خوشی کی دیگ چڑھائی گڑ والے چاول بانٹے تھے اور اس کے گھر لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی، جب کہ دنیا جہاں سے بے پرواہ لاھوت عالم سے بیزار ریت کے ٹیلوں پر گشت کر رہا تھا؛ وہ جی بھر کہ بیزار آ گیا تھا یہاں سے، وہ ایک نئی دنیا چاہتا تھا، اس نے اپنے چاچے کی ڈائری پڑھی تھی جبھی اسے محسوس ہوا کہ اس کے احساسات بھی تو وہی ہیں۔

ماحول کی سختی، اصولوں کی پاسداری، زبردستی کے رشتے، وڈیرانہ رکھ رکھاؤ، بادشاہ و رعایا جیسا تعلق، حالانکہ ان کے خاندانی خون میں عاجزی رچ کر بھری تھی، اس نے سنا تھا اس کا پردادا بہت عظیم تھا، صوفی تھا سخی تھا، عاجز تھا، گھر میں آنے والے لوگوں کے ہاتھ خود دھلواتا، کھانا پیش کرتا، دن میں مزدوری کرتا اپنی ہی زمینوں کی اور رات میں جاگ جاگ کر ذکر کرتا رہتا خدا پاک بزرگ بدتر کا، نیک پرہیزگار اس شخصیت سے کئی اچھی باتیں واقعات منصوب تھے، اسی کی درگاہ پر اس کی قبر کے سرہانے آج بھی ہر رات ورد ہوتا تھا اور ماحول پاک ہو جاتا۔

مگراس کا دادا کچھ الگ تھا، وہی شاہانہ مزاج غرور اور تکبر، زمین جائیداد کا نشہ بے جا اصولوں کی پاسداری اور روایتوں کو نسل در نسل منتقل کرنے میں جتا ہوا اور لاھوت کا باپ عبدالحئیٰ بھی ایسا تھا بہت سخت مگر ہاں بہت عبادت گزار بھی، جانے کیوں عبادت ریاضت نے ان کے مزاجوں کو نرم کیوں نہ کیا تھا اور ایک اس کا چچا تھا، عجیب تھا، کچھ کچھ اپنے دادا پر گیا تھا، عاجزی تھی، سادگی تھی، لہجہ نرم تھا، مگر ضدی تھا، باغی تھا، اختلافات بہت کرتا تھا اور جب اس کی نہ چلی تو ٹھوکر مار کر چلا گیا۔

''لوگ کہتے ہیں عبدالحادی نے اپنے نصیب کو ٹھوکر ماری تھی، لوگ تو کچھ بھی کہہ دیتے ہیں۔'' لاھوت نے سر جھٹکا تھا، اسے بہت جلد محسوس ہوا کہ اس کی یہاں کوئی جگہ نہیں، وہ اختلافات کم کرتا تھا اس کے پاس دلائل کم ہوتے تھے وہ اپنے چاچے کی طرح حاضر جواب نہیں تھا۔

مگر وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا، اپنے چاچے کی ڈائری کتابیں خط پڑھ پڑھ کر اس کا دماغ کچھ اور بھی خراب ہوا وہ دن بدن بدلتا جا رہا تھا، وہ اس ماحول سے دور ہٹ رہا تھا، اس نے زمین پر جانا چھوڑ دیا تھا، درگاہ پر جانا کم کر دیا تھا، لوگوں سے ملنا جلنا پہلے ہی کم تھا، اس نے چاچے کی طرح اعلان بغاوت نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ اس جتنا باہمت نڈر اور بے پرواہ چاہ کر بھی نہیں ہو سکتا تھا، یہ صلاحیتیں پیدا کرنے سے نہیں پیدائشی طور پہ ہوتی ہیں۔

مگر ایک حقیقت تھی کہ وہ چاچے کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا تھا، وہ منزل کیا تھی کہاں پر جا کر رکتی تھی، رستہ کون سا تھا اسے کچھ نہیں پتہ تھا، بس اسے یہاں سے کسی طور نکلنا تھا، اگر وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، یہ اس کی ایک طرح سے خوش فہمی تھی غلط فہمی بھی تھی اور ناتجربہ کاری بھی، کسی نے کیا خوب کہہ دیا تھا، وہ پھر بھی سر جھٹک کر مسکرایا، وہ مسکراتا تو بڑا پیارا لگتا تھا، مگر یہ اسے کسی نے کبھی بتایا نہیں تھا۔

☆☆☆

کمرے سے باہر کچھ لوگوں کی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں، اس نے بے چینی سے پہلو بدلا، آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ بائیں طرف والی جیب پہ مضبوطی سے جما ہوا تھا، جہاں پر دل تھا اور دل جس میں کئی راز دفن ہوتے ہیں، ایک راز دل کے اوپر تھا تو اک اندر، اندر والے راز کی فکر نہ تھی، جو راز باہر نکل جائے ڈر تو اس کا لگا رہتا ہے، نیند میں ہاتھ وہیں دھرا تھا، دروازہ چرچراہٹ کی زوردار آواز سے کھلا ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی کھلیں، آدھی پھر پوری، وہ پوری آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تو کچھ تسلی ہوئی، نواز حسین کھانے کی ٹرے لے کر اندر آ رہا تھا۔

''کیا حال ہے بھاؤ۔'' ہشاش بشاش لہجے والا نوجوان کون کہے گا اتنے پریشان کن ماحول میں ہی رہتا ہے۔

آوازیں کچھ گھٹ گئیں مگر جھنجھناہٹ اور تلخ لہجے ابھی تک گونج رہے تھے، اسے اندر آتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ ہیں کون بھائی صاحب؟''

''یہی سوال بھیا میں نے تجھ سے بھی کرنا ہے، پر تو دیکھا دیکھا سا لگتا ہے، کہیں...... یاد نہیں، مگر دیکھا تو تھا۔'' وہ ٹرے لے کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور ٹرے رکھنے کے لئے چارپائی کے ساتھ ایک اسٹول لگا دیا ساتھ میں پانی کی بوتل اور اسٹیل کا نیا نکور گلاس رکھ دیا۔

''تم کھانا کھاؤ یا میں کھلا دوں اپنے ہاتھوں سے۔'' نواز حسین کسی بچے سے مخاطب ہو رہا تھا، اتنا پیار، اتنا لاڈ بھرا انداز، وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں کھا لوں گا ادا، ذرا قلی کر لوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھا تھا، گلاس میں پانی ڈالا اور دروازے کی چوکھٹ سے باہر جھانک کر دیکھا، نواز کی بھابھی اور بھائی ابھی تک کسی بجٹ بازی میں لگے ہوئے تھے مگر آواز کچھ دھیمی اور تلخ تھی۔

''پتہ نہیں کس کو لے آیا پھر، آئے دن کوئی نہ کوئی اس گھر میں پناہ لینے آ جاتا ہے، گھر نہیں ہے ایدھی سینٹر بنا رکھا ہے بھئی جب اپنے ہی کھانے کو کچھ نہ ہو تو مہمان خانہ کہاں سے چلے گا۔'' نواز کی بھابھی نے اسے دیکھ لیا اور اپنے تئیں بڑے مناسب الفاظ میں اظہار احتجاج کیا تھا ورنہ وہ کھڑے کھڑے اسے نکال بھی سکتی اور اپنی غضب ناک زبان میں اسے بے زبان بھی کر سکتی تھی، یہ تو اس کا چھوٹا سا اظہار ناگواری تھا۔

''روز کوئی نمونہ لے آتا ہے، اسے کہہ دو تم کہ جب اپنا الگ گھر بنائے تو سارے نمونے عجوبے وہیں جمع کر لے۔'' وہ ابھی تک بڑبڑا رہی تھی، وہ قلی کر کے منہ صاف کر کے بے دلی سے اندر آ کر چارپائی کے کونے پر بیٹھ گیا تھا۔

''مجھے گھر جانا ہے، آپ کا بہت شکریہ بھائی آپ نے مجھے سڑک سے اٹھا کر ہسپتال ڈالا اور ہسپتال سے گھر لے آئے، میں بہت دیر سو بھی چکا، اب اجازت چاہوں گا۔'' وہ نرمی سے کہتے ہوئے اٹھا۔

''نہ...... بھا...... نہ...... سوال ہی پیدا نا ہے...... نہیں...... کہ تو یہاں سے کھانا کھائے بغیر جائے، دیکھ تو دل پر نہ لے میرے گھر کا ماحول ایسا ہی ہے جو بھی یہاں آتا ہے جی بھر کر بیزار ہو کر جاتا ہے۔''

''وہ بیچاری بھی بیزاری ہو کر گئی تھی، تو بھی بظاہر ہو کر جائے گا دل میرا برا ہوتا ہے، بیٹھ جا، کھانا کھا لے پھر میں خود تجھے اپنے ٹانگے پر چھوڑ آؤں گا تم سے میرا وعدہ ہے یار۔'' نواز نے اٹھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور بہت محبت کے ساتھ کہا، وہ اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر نا چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔

''میرے دلبر یار بیٹھ کھا۔'' وہ جی بھر کر خوش ہوا۔

''پہلے یہاں کون آیا تھا؟'' اس نے روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا۔

''جھلی سی لڑکی تھی، بہن تھی میری، کبیر بھائی کی خواہش تھی کہ میرے ساتھ رہے میرے گھر پہ۔''

''کبیر بھا...... کبیر احمد نواب شاہ سے جو آیا تھا۔''

''ہاں تم اسے جانتے ہو، اس سے پہلے وہ دادو میں رہتا تھا، پیدائش ہالا کی تھی ایک عمر سیون

میں رہا تھا البتہ دو سال پہلے نواب شاہ سے آیا تھا، میں پہلی بار اس سے قلندر سائیں کے مزار پر ملا تھا، پھر بھٹائی کے اور آخری بار سائیں عبدالرحیم گروڑی کے مزار پر ملے تھے، جب وہ ان کے ساتھ تھی۔‘‘

’’اس کا نام جانتے ہو بھاؤ۔‘‘ علی گوہر کے حلق سے نوالہ اتر گیا، پیٹ بھر رہا تھا مگر دل خالی تھا، بھوکا، بے تاب۔

’’بہت سارے نام لئے تھے اس کے، عائشہ ساتھ چلو، زینب چادر سنبھال لو، جویریہ عقل سے کام لو، کلثوم صبر کرو وغیرہ، ایسے بات کرتے تھے کبیر بھا۔‘‘

’’تو امر کلہ یہاں رہی تھی، کتنا عرصہ؟‘‘ وہ تحمل سے کھا رہا تھا۔

’’ایک آدھ ہفتہ، پھر خدا جانے کہاں گئی کبیر بھائی تو طیبہ چلے گئے، پہنچ بھی گئے خیر سے۔‘‘

’’پروفیسر غفور کو جانتے ہو؟‘‘ نواز نے نفی میں سر ہلایا۔

’’ان کے گھر ٹھہری تھی۔‘‘

’’اب کہاں ہے؟ مجھے اس سے معافی مانگنی ہے۔‘‘

’’میرے گھر میں اس کے ساتھ بہت برا سلوک ہوا تھا، کہیں چلی گئی ہے، پتہ نہیں کہاں، خدا ہی جانتا ہے۔‘‘ کہتے ہوئے دل کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی ڈوب گیا تھا۔

’’ڈھونڈتے پھر رہے ہو اسے؟‘‘ نواز نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور جھانکتا رہ گیا۔

’’وہ نہیں ملی۔‘‘ علی گوہر نے آخری نوالہ چھوڑ دیا تھا، پھر بھی کچھ حلق میں پھنسا تھا بری طرح سے، آنسوؤں کا گولہ، تھا تو آنکھوں میں بہتا وہیں سے تھا اور پھنستا حلق میں تھا، عجیب سلسلہ تھا۔

’’وہ نہیں ملی تو ہمت ہار لی، کمال ہے سڑک نہ دیکھی نہ رستہ اوندھے منہ گرے تھے، شکر ہے کہ میں آ گیا شکر ہے کہ اللہ نے مجھے بھیجا۔‘‘ دوسرا جملہ بڑا صحیح ادا کیا تھا نواز نے۔

’’وہ بھی کسی کو ڈھونڈ رہی ہوگی، مشکل نام والے کو۔‘‘

’’مشکل نام والا کون؟‘‘ وہ چونکا بے ساختہ اور اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

’’کوئی تھا مشکل نام والا، جس نے اسے دھوکا دیا، جو سمجھتا ہے اس نے مشکل نام والے کو دھوکا دیا تھا، نام نہیں سن سکا، شاید اس نے آہستہ لیا ہو یا پھر میری توجہ ہٹ گئی ہو، کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔‘‘

’’نواز بھاؤ، ایک کام کرو، شہر سے کچھ دور کچی آبادی کی طرف سنسان علاقے میں ایک پرانا کھنڈر سا گھر ہے، گھر کی طرف جاتا ہوا رستہ میں بتا دوں گا۔‘‘ وہ اٹھا تھا۔

’’کون رہتا ہے وہاں؟‘‘

’’فنکار رہتا ہے، عبدالحادی نام ہے اس کا، دل کا بادشاہ ہے محبت میں جکڑ لیتا ہے، حالانکہ بات تو رسیوں میں جکڑنے کی کرتا ہے، رسیاں تو کھل بھی جاتی ہیں، مگر محبت ہمیشہ کی قید ہے۔‘‘

’’یہ وہی ہے جسے مرنے کا شوق تھا۔‘‘ نواز حسین کو یاد آ گیا۔

’’کبیر بھائی نے اسے کہا تھا وہ آٹھ ماہ کچھ دن زندہ رہے گا، آٹھواں ماہ کل تمام ہوا آج پہلی ہے۔‘‘ نواز حسین کا لہجہ پر افسوس تھا۔

وہ دونوں گھر سے نکل کر باہر آ گئے تھے اور تانگے میں بیٹھ گیا، علی گوہر کے سر کی چوٹ سے درد اٹھ رہا تھا جسے وہ بہت دیر سے نظر انداز کر رہا تھا تانگے میں بیٹھتے ہوئے چھت سے ٹکر ہوئی تو درد تیز ہوا اس کے دماغ میں سرسراہٹ دوڑ گئی، وہ سر سنبھال کر بیٹھا اور سیٹ کی ہتھی تھام لی۔

نواز حسین نے گھوڑے کی لگام کھینچی تو گھوڑا ہنہنا اٹھا، ان کے پاس کم وقت ہے ان کی بہت لوگوں کو ضرورت تھی، علی گوہر کا لہجہ سیت تھا، آواز جیسے کسی گہری کھائی سے آئی تھی، نواز حسین نے اک نظر مڑ کر دیکھا تو علی گوہر حیران تھا نواز حسین رو رہا تھا۔

’’تم ان کے لئے رو رہے ہو؟ تم تو ان کو جانتے تک نہیں ہو۔‘‘

’’مجھے پتہ ہے میں کیوں رو رہا ہوں، تمہیں نہیں بتا سکتا، قسم کھائی ہوئی ہے، دس دن تک تو بالکل نہیں۔‘‘

’’دس دن کے بعد کیا ہے نواز؟‘‘ اسے پھر درد بھول گیا۔

’’جس دن اس کا جنازہ ہوگا۔‘‘ نواز کی آواز گیلی تھی۔

’’کس کا؟‘‘ علی گوہر کو یہ سمجھ نہ آیا کہ وہ فنکار کے لئے کیوں روتا ہے، رونا تو اسے چاہیے تھا درحقیقت۔

’’جو مرے گا، جنازہ اسی کا اٹھے گا، میں اسی کے لئے رو رہا ہوں علی گوہر بھائی۔‘‘ نواز نے بے ساختہ نام لیا۔

’’میں نے تمہیں کس وقت اپنا نام بتایا تھا؟‘‘ وہ حیران تھا۔

’’مجھے یاد آ گیا میں نے تمہیں تصویر میں دیکھا تھا، کبیر بھائی نے کہا یہ علی گوہر ہے۔‘‘

’’ایسے نہیں کہا کہ نام ہے اس کا علی گوہر اور کام ہے اس کا لور لور پھرنا۔‘‘ علی گوہر گیلی آنکھوں سے مسکرا دیا تھا۔

’’یہ نہیں کہا تھا۔‘‘ نواز حسین بھی مسکرایا تھا، ساتھ ہی آنسو لڑھک کر گر گئے، آنکھوں سے۔

’’تم کیوں روتے ہو نواز حسین؟‘‘

’’جب تم روؤ گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کیوں رویا تھا۔‘‘

’’مجھے تو اپنا بھی پتہ نہیں لگتا نواز حسین کہ میں کیوں رویا ہوں اور تم اپنی بات کرتے ہو۔‘‘ نواز حسین نے نم آنکھوں سے گھوڑے پر چابک ماری۔

’’تو پھر مت پوچھا کر پیار سے کہ میں کیوں روتا ہوں اور نہ سوچا کر کہ تم کیوں روتے ہو۔‘‘

’’یہ سمجھ لو کہ جو آتے ہوئے رویا تھا، وہ جاتے ہوئے رلاتا ہے کوئی جا رہا ہے آج یا کل یا پھر ایک ہفتے بعد، اسے تو جانا ہے، میں تو اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے رویا ہوں کہ مجھے جانے والے سے محبت ہے، میں پھر اسے نہیں دیکھ سکوں گا، مجھے اس کی کمی محسوس ہوگی، تو بھی اسی لئے روتا ہے بھیا، ہر کوئی اپنے دکھ میں روتا ہے ہر کسی کو یہاں اپنا دکھ رلاتا ہے، انسان کسی مطلب سے پیدا ہوتا ہے مگر پھر انسان صرف مطلب پرست ہو جاتا ہے۔‘‘ نواز حسین کیسی گہری باتیں کر رہا تھا، علی گوہر کو چپ لگی تھی۔

☆☆☆

موسم کافی خوش گوار تھا شام کے سات بج رہے تھے وہ مغرب کی نماز سے فری ہو کر بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی ہاتھ میں ایک بسکٹ کا پیکٹ تھا نیند سے اٹھتے ہی اسے زبردست قسم کی بھوک لگی تھی، انہوں نے چند منٹ پہلے کمرے میں جھانکا تو اسے نماز میں مشغول دیکھا گھر آنے کے بعد ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی، کیونکہ وہ جب گھر آئی تو وہ وقار کے کمرے میں تھیں، اس نے غنیمت جانی اور کمرے میں آ گئی اور چینج کیے بغیر ٹیبلٹ لے کر درد کی سو گئی رات سے سوچتے سوچتے سر درد کر رہا تھا۔

اور ابھی جب وہ نہا کر نماز کی ادائیگی کے بعد سر درد تو یاد بھی نہ تھا، اس نے ریلنگ پہ ہاتھ جما کر نیچے جھانکا، روڈ پہ چلتی گاڑیاں رواں دواں ٹریفک، لوگ دکانیں شور مگر کچھ ہلکا کیونکہ مین سڑک کچھ آگے تھی جہاں تک اس کی نظر جا رہی تھی، اس نے دور دور تک بغور دیکھا۔

‘‘امرت ایسے نہ کرو ڈر لگتا ہے گر جاؤ گی۔’’ انہوں نے پیچھے سے آ کر اس کا کندھا ہلایا، امرت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ آئی، وہ جب چھوٹی تھی تو یونہی نیچے جھانکنے پر اسے چکر آتے تھے ایک بار وہ نیچے ڈھلک ہی گئی تھی جب اس نے اور وقار نے اسے فوراً کھینچ لیا تھا ورنہ وہ تو جاتی، مگر کیسے جاتی ابھی اس کا رہنا ضروری تھا، تقدیر لکھنے والے نے اس کے ہاتھ میں عمر کی لکیر اتنی مختصر تھوڑا ہی لکھی تھی، اس نے اپنا ہاتھ آگے کر کے عمر کی لکیر ان کے سامنے کی۔

‘‘تم بھی...... یہ لو چائے۔’’ وہ سر جھٹک کر مسکرا دیں۔

‘‘اسی کی ضرورت تھی۔’’ وہ کونے میں پڑی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

‘‘آپ بیٹھیں۔’’ انہیں کھڑا دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

‘‘تو پھر تم کہاں بیٹھو گی؟’’

‘‘اس پر۔’’ اس نے ایک اسٹول کھینچ لیا۔

‘‘امرت یہ گندہ ہے مت بیٹھو اس پہ۔’’

‘‘کچھ نہیں ہوتا امی اس پہ جو پینٹ لگا تھا وہ سوکھ چکا ہے۔’’ وہ بے فکری سے چائے کا کپ چھوٹی سی ٹرے میں لے کر گود میں بیٹھ گئی اور بسکٹ کا پیکٹ کھول لیا، پورا کا پورا بسکٹ چائے میں ڈبوتی اور کھانے لگی۔

‘‘میں جب بھی بسکٹ ڈبوتی ہوں گر جاتا ہے، تمہارا کیسے بچ نکلتا ہے۔’’

‘‘سندھی ڈبو کر کھاتے ہیں زیادہ تر ان کا نہیں گرتا، میں سندھی ہوں نا امی۔’’ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

‘‘میرا باپ سندھی تھا نا، اس حساب سے میری سندھی بری ہے۔’’

‘‘کچھ زیادہ یاد نہیں آ رہا تمہیں اپنا باپ آج کل۔’’ ان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

(بھولا کب تھا) وہ کہنا چاہتی تھی پر کہہ نہ سکی۔

‘‘وہ اتنا اچھا نہیں ہے امرت جتنا اچھا تمہارا تصور ہے، وہ خود غرض تھا اسے بس اپنی پرواہ تھی، وہ ضدی تھا، اس نے تمہیں رکھنا نہیں چاہا۔’’ وہ بول رہی تھیں اور امرت کے چہرے پہ ہمیشہ کی طرح دھند چھا گئی۔

‘‘وہ تم سے محبت نہیں کرتے تھے۔’’ امرت کے چہرے پر اوس پڑ گئی آنکھیں بھینچ کر کپ ہونٹوں سے الگ کیا۔

‘‘ان کے ہاں تمہاری کوئی گنجائش نہ تھی نہ ضرورت تھی۔’’ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں زیادہ بولنے سے روک دیا۔

‘‘کیا آپ کو تسلی ہو گی جب آپ میرے منہ سے سنیں گی کہ میں نفرت کرتی تھی اپنے باپ سے، یا نفرت کرتی ہوں یا پھر ہمیشہ ہی کروں گی۔’’

‘‘کیا یہ سچ ہے امرت۔’’ لہجہ عجیب سا تھا۔

‘‘بات سچ اور جھوٹ کا نہیں ہے، بات نفرت اور محبت کی ہے۔’’ چائے کے چند گھونٹ پڑے ہی رہے کپ رکھ دیا بسکٹ کے ادھ کھلے پیکٹ سے کئی بسکٹ جھانک رہے تھے اس نے دو ہی لئے تھے۔

‘‘پتہ نہیں تم خود کو دھوکا دے رہی ہو امرت یا مجھے۔’’ وہ اداس ہو گئیں۔

‘‘امی کوئی باپ اگر اپنی بیٹی سے محبت نہیں کرتا، نفرت کرتا ہے اگر ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی باپ کو اپنے بچے سے کسی قسم کا انس نہ ہو، اسے اپنے بچے کی ضرورت نہ ہو تو آپ بتائیں کیا اس اولاد کے دل میں ایسے باپ کے لئے محبت ہو سکتی ہے؟’’ آنکھوں میں نمی تھی اور لہجے میں۔

‘‘ہونی تو نہیں چاہیے امرت۔’’ وہ بس پھیکا سا مسکرا کر رہ گئی۔

‘‘مجھے اپنے باپ کے حوالے سے کوئی احساس نہیں جاگتا، نہ محبت نہ ہی نفرت کا۔’’

‘‘پھر بھی تم اس کی تلاش میں پھرتی رہتی ہو؟’’

‘‘آپ سے یہ کس نے کہا امی کہ میں ان کی تلاش میں رہتی ہوں۔’’

‘‘تم نے مجھے بچی سمجھا ہے احمق سمجھا ہے یا پاگل، کیا کہنے سمجھنے کی صلاحیت تم میں ہی ہے۔’’ وہ بگڑیں۔

‘‘مس یاسمین بھی یہی کہتی ہیں مجھے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو بھی یہ غلط فہمی ہے۔’’ وہ کس دل سے مسکرائی تھیں۔

‘‘تمہیں مجھ سے بہت شکایتیں ہیں امرت جانتی ہوں میں، شاید تم مجھ سے کبھی مطمئن نہ رہ سکو، تمہیں مجھ پر اعتبار بھی نہیں، مجھ پر کسی نے کبھی بھروسہ نہیں کیا امرت۔’’

‘‘یوں نہ کہیں امی اعتبار نہ ہو تو، انکل وقار تو آپ سے بے حد محبت کرتے ہیں یا کرتے تھے۔’’

‘‘مجھے پتہ ہے تمہارے دل میں اس شخص کی بھی عزت ہے مگر میری نہیں ہے۔’’

‘‘کاش کہ کبھی آپ مجھ سے خوش ہو سکیں۔’’ وہ اس بار مسکرا نہ سکی نہ ہی وہ مسکرائیں۔

‘‘یہ کبھی کسی نے کہا تھا کیا؟’’ وہ ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی، وہ خاموشی سے اٹھیں۔

‘‘رات کے لئے دال چاول بنا لوں یا کچھ اور؟’’ دال چاولوں کے علاوہ جیسے کوئی اہم بات نہ رہی تھی۔

‘‘آپ کی مرضی ہے، جو بھی پکا لیں۔’’ وہ اسٹول سے اتر گئی۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"اوہ ہاں، حنان کا فون آیا تھا۔" اہم بات یاد آ گئی۔

"اچھا...... کیا کہہ رہا تھا وہ؟" وہ پہلے کی طرح اب چڑی نہ تھی۔

"شادی کی بات کر رہا تھا، کہہ رہا تھا فیملی کو لے آؤں۔"

"تو آپ کہہ دیتیں لے آؤ۔" وہ بڑی بے فکری سے کہہ گئی۔

"اتنی جلدی امرت بیٹا، میں نے تو وقت مانگ لیا۔"

"وقت نہ مانگیں، وقت دے دیں، کہیں اسے آج رات ہی لے آئے۔"

"آج اتنی رات گئے۔" وہ جی بھر کر حیران تھیں۔

"کہاں اتنی رات، ابھی تو آٹھ بھی نہیں بجے امی یہیں اسی شہر میں تو ہے چلو تھوڑا دور سہی مگر گھنٹے میں پہنچ جائیں گے اگر تھوڑی دیر میں نکلیں تو۔" وہ کمرے میں اندر آ گئی کہتے ہوئے اور اپنا سیل فون اٹھایا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتیں وہاں سے فون ریسیو ہو گیا اور امرت نے سلام میں پہل کی۔

"السلام علیکم؟ کیسے ہو حنان؟" ایسا خوش گوار لہجہ، جس کا نام تک سننے سے وہ چڑنے لگی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں، امی نے بتایا تم آنٹی وغیرہ کو یہاں لا رہے تھے۔"

"لا تو رہا تھا سب لوگ تیار تھے آپ کی امی نے منع کر دیا۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"کوئی بات نہیں، وہ اصل میں میرا ویٹ کر رہی ہوں گی، تم ابھی لے آؤ کوئی ایشو نہیں۔"

"ابھی......؟ واقعی؟" وہ بھی جی بھر کر حیران تھا۔

"ہاں ابھی، کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں رات بہت ہو گئی ہے۔"

"آٹھ بجنے والے ہیں حنان یہ اتنی رات ہے کیا، خیر تمہاری مرضی مگر پھر میری مصروفیت کو کوئی الزام نہ دینا۔"

"ہم شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آ رہے ہیں تمہیں پتہ ہے نا؟" وہ یقین دہانی کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے مل بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔"

"اچھا......" لفظ اچھا کو کھینچ کر ادا کیا گیا تھا۔

"ہاں۔" وہ بھی اسی کی طرح بولی۔

"ٹھیک ہے میں پھر لے آتا ہوں کوئی مسئلہ نہیں۔" فون بند ہو گیا۔

"وہ لوگ آ رہے ہیں، کچھ نہیں پکانا باہر سے منگا لیں کھانا، میں وقار انکل سے مل لو، ان کو معلوم ہونا چاہیے، آخر کو وہ ہمارے گھر کے بڑے ہیں۔" وہ تیزی سے کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

"امرت آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔" وہ کچھ بھی نہ سمجھتے باہر آ گئیں۔

"آپ کی خواہش پوری ہو رہی ہے امی۔" وہ کمرے میں جاتے رکی۔

"تم آرام سے وقت لے لو بیٹا، کوئی بھاگا نہیں جا رہا۔"

"پہلے تمہیں وقت چاہیے تھا اور اب اچانک ہی، کیا ہو گیا۔"

"اب میں وقت سے ڈرتی ہوں، جو نا ہاں میں بدلی ہے اس سے پہلے وہ ہاں پھر نا میں

بدلے آپ اسے کوئی عملی جامہ پہنا دیں، میں تیار ہوں۔" اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"اب تو تب کچھ آپ کی توقع کے مطابق ہو رہا ہے تب بھی آپ کو اعتراض ہے۔"

"اگر میری توقع کے مطابق ہوتا تو...... تو کیا ہوتا۔" وہ عجیب سوال چھوڑ کر جواب کی توقع کیے بغیر کمرے میں چلی گئی، وقار انکل کتاب پڑھ رہے تھے کوئی، اسے دیکھ کر کھل اٹھے۔

"امرت آئی ہے، آؤ بچے، آؤ بیٹھو میرے پاس۔" یہ وہی شفقت تھی جس کی اسے کبھی ضرورت تھی، تب نہ ملی اور اب، بس وقت وقت کی بات ہے، یہ وقت کی بات بھی عجیب ہے سمجھ سے ہی باہر۔

☆☆☆

"کیسی عجیب بات ہے لوگ آخری وقت میں عبادت گزار بن جاتے ہیں گوشہ نشین ہو جاتے ہیں کتنی عجیب بات ہے کہ ہالار کا باپ اس عمر میں عمر کے آخری اسٹیج پر داڑھی منڈھوا کر گلی گلی لور لور پھر رہا ہے، یہ کیا مشکل ہے عبدالحادی، یہ کیسا سیاپا ہے، فنکار تو تو باؤلا ہو رہا ہے۔" کلین شیو ساٹھ سے اوپر سالا نوجوان آئینے کے سامنے کھڑا خود پر نفرین بھیج رہا تھا۔

"بہتر ہے کہ مجھے رسیوں میں جکڑ لو، باندھ لو علی گوہر کہاں ہو۔" وہ بے بسی سے چہرہ چھپا کر بیٹھ گیا، فنکار جیسے بچہ بن گیا تھا تبھی دروازہ بجا تھا اور خود ہی کھل گیا، کیونکہ کھلا تھا۔

"علی گوہر، تو آ گیا۔" اس کے دل نے کہا تھا، علی گوہر راستے میں تھا، وہ تیزی سے اندر آئی تھی۔

"یہاں سب کچھ ٹھیک ہے؟" وہ امرت تھی دروازے سے باہر کھڑی تھی۔

"آ جاؤ۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ کسی اور کا انتظار کر رہے تھے؟" وہ دروازے سے اندر آ گئی تھی اور کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کافی صاف ستھرا کمرہ لگ رہا تھا پہلے کی نسبت، ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھی، فنکار ابھی نہا کر آیا تھا فریش لگ رہا تھا بلیو ٹی شرٹ اور سفید ٹراؤزر میں ملبوس پیروں میں فینسی چپل پہنے نوجوان ہی لگ رہے تھے۔

"آپ تو بڑے خوبصورت لگ رہے ہیں آج۔" وہ بڑے خوش گوار سے لہجے میں بولی۔

"طنز کر رہی ہو لڑکی مجھ پر۔" وہ سنجیدہ تھے۔

"ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی آپ کی تعریف کر رہی ہے اور آپ اسے طنز کہہ رہے ہیں کتنے عجیب آدمی ہیں آپ بھی ہیں نا۔"

"ہاں عجیب ہی نہیں، غریب بھی ہوں، فقیر بھی ہوں اور پاگل بھی، بڈھا ہو گیا ہوں اب تعریف سننے کا شوق نہیں رہا، سٹھیا گیا ہوں، داڑھی منڈھوا کر پھر رہا ہوں، مروں گا تو کیڑے کھائیں گے، سانپ سینے پر لوٹیں گے چیخوں گا چلاؤں گا، تم آنا میری قبر پر، فاتحہ پڑھ کر جانا ہو سکتا ہے عذاب کم ہو۔" لہجہ تلخ تھا۔

"کتنے ناشکرے ہیں آپ، اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے اور کتنے بدگمان ہیں آپ اپنے رب کی رحمتوں سے، کوئی یہ نہیں کہتا کہ سینے پہ سانپ لوٹیں گے، کیڑے کاٹیں گے، عذاب ہو گا، ہمیشہ

بخشش مانگی جاتی ہے گمان بہتر رکھا جاتا ہے، ایک گمان کا ہی تو رشتہ ہے اپنے رب سے، اگر وہی کمزور ہو تو کیا بچ جائے گا پھر۔" وہ اسے ڈپٹ رہی تھی سمجھا رہی تھی، بتا رہی تھی، اس کے لہجے میں کیا نہیں تھا، نمی تھی، اپنائیت تھی، نرمی تھی، شکایت تھی غصہ تھا دبا سا۔

"رب کہتا ہے میں تمہارے گمان میں رہتا ہوں، جیسا گمان رکھو گے، ویسا پاؤ گے۔" وہ نزدیک آ کر بیٹھ گئی کچھ فاصلے پر، بس اپنی اپنی سی لگی۔

"گمان غلط ہونے لگا ہے امرت، میں شاید غلط سمت چلتا رہا، منزل بدل گئی یا رستہ، نہیں پتہ، بے مکان خانہ بدوشوں کی طرح دل بھٹک رہا ہے، نہیں پتہ کہ خدا سے کبھی کوئی گہرا رشتہ تھا بھی یا نہیں، ڈول گیا ہوں، بکھر گیا ہے میرا یقین، مجھے بتاؤ میں کہاں کھڑا ہوں، کیا صراط مستقیم پر جہاں سے گزرنا دشوار ہوتا ہے، گر گیا ہوں بھٹک گیا ہوں، وہ نہیں رہا جو تھا، وہ ہو گیا ہوں جو نہیں رہا تھا۔" وہ مکمل طور پر بے بس نظر آ رہے تھے۔

"صراۃ المستقیم کی منزل واقعی دشوار ہوتی ہے، مگر ہم جیسے ناچیز لوگوں کو اگر وہاں سے گزارا جائے گا تو ہمارے اندر خدا نے کوئی طاقت کوئی پاور انرجی تو رکھی ہو گی نا، یہ کیوں سوچتے ہیں کہ بھٹک گئے ہیں، یہ سوچیئے کہ منزل کی جس تلاش نے بیگانہ کر رکھا ہے وہ تلاش آپ کو رستہ دکھا سکتی ہے، اگر رستہ دکھا سکتی ہے تو منزل پر بھی تو لے جا سکتی ہے نا، یہ نا سوچیئے وقت کم ہے یہ سوچیئے کہ تھوڑا سا بھی وقت تو ہے نا، کچھ لوگوں کا وقت تو تھک جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے اور ان کو پتا ہی نہیں چلتا مگر میں نہیں سمجھتی کہ آپ کا وقت ختم ہوا ہے۔" وہ ان کی بے چین آنکھوں میں جھانک رہی تھی، پھر اتنا غور سے جھانکنے لگی کہ اسے اپنا عکس دکھائی دینے لگا تھا۔

"تم ایک دعا کرو امرت، کہ مجھے اتنا وقت مل جائے کہ، کہ میرے چہرے پر بال آ جائیں، میں عبادت گزار بن جاؤں اور پتہ ہے اس کے لئے کچھ دن تھوڑے ہیں، بہت تھوڑے۔" انہوں نے آنکھیں فرش پر جما دیں تھیں، وہ اس سے جانے کیوں نظر ملا نہیں پا رہے تھے۔

وہ اٹھی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دیوار پر لگا کیلنڈر پھاڑ دیا، گھڑی سے سیل نکال کر پھینک دیا اور گھڑی اتار کر رکھ دی اسے اور کوئی کمیونیکیشن کا ذریعہ نہیں ملا یہاں ہاں ایک پی ٹی سی ایل فون ضرور تھا۔

"امرت سنو، میری بات سنو، اسے مت توڑو، اس پر میرے ہالار کا فون آتا ہے، میرے ہالی کا، اسے مت خراب کر و بیٹے یہ میری زندگی کی امید ہے۔" وہ کمرے سے باہر آئے اور اسے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھتا دیکھ کر چلائے۔

اس فون کی گھنٹی بجتی ہے تو ذنکار جی اٹھتا ہے، کیونکہ فون ہالار کا ہوتا ہے نا، ہالار کا نام لے کر چہرے پر کیسے خوشی کے رنگ بکھرتے تھے، رنگ بھی عجیب ہیں، وہ فوراً پیچھے ہٹی۔

"ہالار کون ہے؟"

"میرا بچہ، میرا یار، میرا شہزادہ، میری جان، بیٹا ہے میرا۔" وہ چہک اٹھے، مہک اٹھے، کھل اٹھے۔

"بہت خوش نصیب ہے پھر تو، اگر آپ کا شہزادہ ہے سب سے بڑی بات کہ آپ کا بیٹا ہے۔"

اس کا چہرہ کیوں بجھا تھا وہ جان نہ پائے۔

"تم بھی تو کسی کی شہزادی ہو کسی کی بیٹی ہو، پتہ ہے باپ بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں سے پیار کرتے ہیں۔"

"اور مائیں بیٹوں سے، میری ماں بھی مجھے بہت چاہتی تھی، آنکھوں کا تارا، دل کا چین اور نجانے کیا کیا کہتی رہتی، میں نہ تو کسی کی آنکھوں کا چین ہوں نہ سکون۔"

"تمہارا باپ تم سے محبت نہیں کرتا ہے، کیا وہ تمہارے ساتھ اس طرح کے لاڈ نہیں کرتا۔"

"میرا باپ مجھ سے نفرت کرتا تھا، اس نے مجھے کبھی گود میں نہیں اٹھایا، کبھی میرا سر نہیں چوما پیار نہیں کیا، میرے لاڈ نہیں اٹھائے، اس لئے مجھے نہیں پتہ کہ باپ کیا ہوتا ہے اور اس کا پیار کیسا ہوتا ہے۔"

"کیسا بدنصیب باپ ہے تمہارا، جو ایسی شہزادی سے نفرت کرتا ہے۔"

"بدنصیب تو پھر شہزادی بھی ہوئی نا سر۔"

"شہزادی کبھی بدنصیب نہیں ہوئی امرت۔"

"شہزادیاں ہی تو بدنصیب ہوتی ہیں، آپ کو کیا پتہ، آپ شہزادی ہوتے تو معلوم ہوتا، آپ تو شہزادے ہیں۔" نمی آنکھوں کے اندر دھکیل کر زبردستی کی مسکراہٹ اچھی تھی۔

"اصل میں مسکراہٹ کبھی بری ہو نہیں سکتی۔"

"مجھے اپنی کہانی سناؤ گی امرت۔"

"ساری زندگی کہانیوں کے پیچھے بھاگتے رہے۔" وہ ہنسی۔

"جھوٹی ہنسی مصنوعی ہنسی، عجیب ہنسی، شور کرنے لگی خاموشی میں، ترنم بکھیرتی۔"

"تم کبھی گنگناتی ہو؟" وہ چونکے۔

"پرانی عادت تھی اب نہیں رہی۔" ہنسی رک گئی۔

"تمہاری آواز بہت اچھی ہے، ماں پر گئی ہے۔" وہ ہال میں رکھی کرسی کی ہتھی پر بیٹھ گئے، بلکہ ٹک گئے۔

"نہیں باپ پر گئی ہے۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔

"اور کیا عادتیں باپ پر گئیں؟"

"آنکھیں اور سستی اور ضد اور ہٹ دھرمی اور پاگل پن اور بدلحاظی، بغاوت، نروٹھا پن، یہ میری ماں کہتی ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"مجھ میں بھی یہ خصوصیات ہیں۔" وہ بھی مسکرائے۔

"یہ خصوصیات نہیں خامیاں ہیں آنکھوں کو چھوڑ کر۔" مسکراہٹ برقرار تھی۔

"ہو سکتا ہے، پر تم ذہین بھی ہو، عقلمند ہو، بہادر ہو، جلد باز بھی ہو مگر پختہ ارادے کی مالک ہو، چیزوں کو بدلنے کا تمہیں بخار ہے، جو سوچتی ہو وہ کر لیتی ہو اور جسے کرنے کا سوچتی ہو وہ سوچی ہی رہتی ہو۔"

"نجومی بننے کی کوشش، اچھی کوشش ہے۔" وہ کھڑی رہی۔

“نہیں یہ ساری خامیاں مجھ میں ہیں، اس لئے میں جج کر گیا، ہم اپنے جیسوں کو سمجھ لیتے ہیں۔”

“یہ کس حد تک خوبیاں ہیں، صرف سستی کو ہٹا دیں۔”

“ہاں کہہ سکتے ہیں۔” وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

“میری کوئی بیٹی ہوتی تو ایسی ہی ہوتی، جیسی تم ہو، تمہارا تعلق بھی کسی سید گھرانے سے ہے؟”

“ٹھیک سمجھے آپ، سید سندھی گھرانے سے، مگر میری سندھی کمزور ہے۔”

“کوئی بات نہیں میں تمہیں سندھی سکھا دوں گا، مگر وقت بہت کم ہے میرے پاس گنتی کے چار جملے، آپ کون ہیں کیا نام ہے، کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، شناخت سے آگے بات نہیں بڑھ پائے گی۔”

“شناخت کی ہی تو بات ہے، ورنہ بات آگے بڑھ ہی جاتی ہے۔” وہ سنجیدہ ہوئی تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

“مجھے پتہ ہے تم کم مطمئن ہوتی ہو مگر بتاتا ہوں۔”

“ماں عبدالحادی (میں عبدالحادی)۔”

“ذات سید۔”

“بس بس اس سے آگے سندھی جانتی ہوں اچھی جانتی ہوں کوئی بھی زبان سکھانے کا بہت برا طریقہ ہے، رہنے دیں۔”

“ٹھیک ہے تمہاری مرضی، تمہاری کلاس لوں گا تو ہی مطمئن ہوں گا، مگر اس سے پہلے مجھے چائے پینی ہو گی، جو تم بنا دو تو اور اچھی بات ہے۔”

“چائے بری بناتی ہوں، مگر بنا لیتی ہوں، پی لیجئے گا اور نقص نہیں نکالنا۔” وہ تنبیہ کرتی ہوئی کچن میں آئی۔

“ارے یہ کیا اس میں تو پتی نہیں ہے چینی بھی ختم ہے۔” اس نے سارے کیبنٹ چیک کئے، آٹا ایک دن کا بمشکل ہو گا، سبزی سڑی پڑی ہے۔

“آخر آپ ایک عدد چھوٹا سا فریج کیوں نہیں خرید لیتے۔”

“میرا رزق ختم ہو رہا ہے، دیکھا تم نے، میرے رہنے کے دن بہت کم رہ گئے ہیں، آج تاریخ کیا ہے؟، بتاؤ نا، میں نے آج ڈیٹ کیوں نہیں دیکھی۔” وہ تیزی سے باہر آئے۔

“میں کہتا ہوں تم نے میرا کیلنڈر کیوں پھاڑ دیا، تمہیں کیا حق تھا میری گھڑی خراب کرنے کا۔” وہ بری طرح بگڑے۔

“میں کیسے وقت دیکھوں گا۔” وہ پریشان ہوئے، وہ چپ چاپ دروازے کے بیچ کھڑی تھی۔

“تمہیں کیا حق تھا۔” جملہ دل پر لگا جیسے تیر، چبھ گیا۔

جیسے کانٹا، دل کٹ گیا جیسے تلوار، پیوست ہو گیا جیسے بندوق کی گولی، مگر گولی کی طرح چیر کر نکل گیا، وہ چپ رہی، اتنا کچھ ہو گیا۔

“تم مجھے پرانے زمانے میں لے آئی ہو جہاں تارے دیکھ کر سمت کا تعین کیا جاتا ہے اور سائے دیکھ کر وقت کا، تم کیوں مجھے بے بس کر رہی ہو۔” وہ چیخے۔

“کیوں کر رہی ہو ایسا۔” چیختے رہ گئے، وقت دیکھ دیکھ کر روتے رہیں، خدا سے شکوہ کرتے رہیں۔

“یہ کیا طریقہ ہے، جو ٹھیک تھا وہی کیا۔” وہ بھی انہی کی طرح بلند آواز میں تلخ لہجے میں بولی۔

“وقت کم ہے تو بیٹھیے، کیجئے عبادتیں، کریں اچھے کام خوش رہیں، کیوں خود کو پھانسی کے تختے پر لٹکا رکھا ہے، حد ہو گئی۔” وہ جھلائی۔

بیگ سے ٹیبلٹ نکالی، پانی کی بوتل اور ان کی طرف بڑھائی۔

“زہر ہے۔” وہ اس کے یوں چیخنے پر سہم گئے تھے۔

“زہر کا توڑ ہے۔” اس نے گولی نکال کر ان کی ہتھیلی سیدھی کر کے اس پر رکھی اور پانی کی بوتل کا ڈھکن کھول کر ہاتھ میں تھمائی۔

فرماں بردار بچوں کی طرح چپ کر کے کھالی اور پانی سارا پی لیا، بوتل ڈھلک کر گر گئی، امرت نے جھک کر اٹھالی۔

“کیا اس سے مجھے نیند آ رہی ہے، دماغ ماؤف سا ہو رہا تھا، ہاں مگر ایک دو گھنٹے، پھر چست ہو جائیں گے، ایکٹو ہو جائیں گے۔” وہ مسکرا کر بولی۔

“لیٹ جایئے۔”

“تم میرے پاس بیٹھی رہو گی؟” وہ لیٹ گئے۔

“ہاں جب آپ اٹھیں گے دو ڈھائی گھنٹے بعد تو مجھے یہیں پائیں گے۔”

“میری ڈائری لے جاؤ گی، مجھے پتہ ہے، مگر ابھی پڑھنا مت، میں نے بھی ہالار کی ڈائری چرائی مگر پڑھے بس دو پیج، تم بھی دو پڑھنا، اس سے آگے نہیں۔” آنکھیں بند ہونے لگیں نیند کا غلبہ ذہن پر چھا رہا تھا، وہ چاہتے تو چھ گھنٹے سو سکتے تھے اس کے زیر اثر، مگر اسے پتہ تھا گہری نیند کا جیسے ہی غلبہ ٹوٹے گا وہ بے چین ہو کر زبردستی اٹھیں گے ان کے بے چین طبیعت کا خاصہ تھا۔

“ڈائری صندوق میں رکھے کپڑوں کے بیچ ہے۔” آخری جملہ پھر وہ نیند میں ڈوب گئے، اس نے صندوق کھول کر ڈائری نکالی اور ورق پلٹنے لگی۔

“صرف دو پیج۔”

“آج میں نے کہانی لکھنا شروع کی ہے اور میرے بھائی نے مجھے جھوٹا قرار دے دیا، کل وہ میرا اسکیچ پکڑے گا تو کافر کہے گا۔” اس نے پیج پلٹا۔

“میرا شک ٹھیک نکلا، اس نے میرا بنایا ہوا اسکیچ دیکھ لیا ہے، وہ کاغذ لے کر ابا کے سامنے گیا ہے، اس نے مجھے کافر کہا ہے، بتوں کا پجاری کہا ہے۔”

“اس سے پہلے میں صرف باغی، بدتمیز، بدلحاظ اور احمق تھا ان سب کی نظر میں، پھر میں جھوٹ گھڑنے والا بن گیا اور اب میں کافر ہوں، عنقریب یہ مجھے اس گھر سے نکلوانے میں کامیاب

ہو جائے گا جب اسے پتہ چلے گا کہ میں کسی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کروں گا، میں یہ سب کروں گا اور میرے ساتھ یہ سب ہو گا، میں ذہنی طور پر ایک بڑے ہنگامے کے لئے تیار ہوں۔" ڈائری کے پہلے پیج پر لکھا تھا۔

"یہ میری زندگی کی دوسری ڈائری ہے، پہلی ڈائری کہاں ہے؟" وہ پوچھنا چاہتی تھی پر وہ سو گئے تھے گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے فون زور سے بجا تھا وہ تیزی سے باہر لپکی تا کہ مسلسل بجتی بیل سے ان کی نیند نہ خراب ہو۔

"ہیلو السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام، آپ کون؟ شاید میں نے غلط نمبر ملایا ہے۔" ھالار الجھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ھالار؟" اس نے اندازہ لگایا۔

"جی ہاں......آپ کون ہیں۔"

یہ سوال کتنا مشکل ہو جاتا ہے بازاوقات، آپ کون ہیں، آپ کون ہیں، یہاں کیا کر رہی ہیں، ھالار نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"آپ کے والد صاحب سو رہے ہیں، ان کی طبیعت ذرا ناساز تھی، مگر بہتر ہیں اب۔" وہ یہ نہ بتا سکی کہ میں کون ہوں۔

"آپ کون ہیں؟" لہجہ چبھتا ہوا۔

"میں ان کو آپ کا پیغام دے دوں گی، مگر دو گھنٹے تک فون نہ کیجئے گا کہ نیند خراب ہو گی، وہ نہیں سوئے بہت دن سے شاید، ٹھیک سے نہیں سو پائے۔"

"او کے میں آ رہا ہوں، ائیر پورٹ پر ہوں، ان کو بتا دیجئے گا، یہاں سے نکل رہا ہوں، پہنچ جاؤں گا رات تک، مگر آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"(وہی رٹ) یاد رہے دو گھنٹے تک کوئی فون نہیں۔" اس نے فون رکھ دیا یہ کہہ کر اور بیگ اٹھایا باہر نکل آئی، اس کا اندازہ تھا کہ وہ گھنٹے تک پلٹ آئے گی، اسے مارکیٹ سے کچھ چیزیں لینی تھیں، اس نے ٹیکسی پکڑی جو اسے بیس منٹ میں قریبی مارکیٹ تک پہنچا سکتی تھی، اس نے پین اور پیڈ نکال کر ایک ہفتے کے راشن کی لسٹ لکھی۔

اس سے زیادہ لسٹ بنانا اس کے بس سے باہر تھا، اس کا اکاؤنٹ ختم ہو رہا تھا، سیلری میں کچھ دن باقی تھے، اس سے آگے کی لسٹ تقدیر کے کاغذ پر درج تھی، اس نے باہر نگاہ کی دوپہر پوری طرح سے چمک رہی تھی، سورج اپنی آب و تاب پر تھا۔

☆☆☆

"اچھے ابا کہتے ہیں کہ کسی کا رزق جس جگہ جتنا لکھا ہوتا ہے وہ اس جگہ وہیں تک نکلتا ہے، آپ سنیں گے یا ملامت کریں گے کہ میں جاتے جاتے رزق کو الزام دے کر جا رہی ہوں، مگر درحقیقت میرا یہاں سے جانا ازحد ضروری ہے، آپ کو چھوڑ رہی ہوں، مانا کہ سنگدل ہوں، مگر ایک تلاش مجھے یہاں چین سے رہنے نہیں دے گی، ہو سکتا ہے میں کچھ عرصے بعد تھک ہار کر آپ ہی کے پاس لوٹ آؤں، ہو سکتا ہے کہ آؤں تو رک جاؤں، مگر ابھی مجھے کہیں سراغ ڈھونڈنا ہے اپنا، اپنی ذات کا، اپنی شناخت اور اپنے نصیب کا، علی گوہر کے اندر میرے لئے جو تجسس ہے وہ تجسس اسے لئے لئے پھرتا ہے، محبت کا یہ کون سا اسٹیج ہے کون سا رنگ ہے نہیں جانتی، علی گوہر کی آنکھوں میں اترتی نمی آنسوؤں کی شکل میں بھی دیکھی ہے، اسے کہیے گا میں نے اس کے اندر اسے بھی دیکھا اور ھالار کو بھی دیکھا، اسے کہیے گا امرکلہ بھی روئی ہے، پھوٹ پھوٹ کر روئی ہے، ہو سکتا ہے آنے والے وقتوں میں امرکلہ بھی اسے ڈھونڈ لے تلاش کرے اور روئے، ہو سکتا ہے وہ گلی کے کسی نکڑ پر کھڑا ہو اور چھپ جائے اور میں روتی رہ جاؤں۔"

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

"مجھے پتہ ہے تلاش کتنی بھیانک چیز ہوتی ہے جو بھیانک مراحل سے گزرتی ہے، میں خود ایک تلاش میں پھر رہی ہوں، علی گوہر کو کہیے کہ مجھے صرف ایک بار اپنی منزل کا ایک سرا ہاتھ جائے تو میں اسے آواز دوں گی، وہ میرا ہمدرد ہے، وہ میرا دوست ہے اور علی گوہر کو میری ذات سے جو بے کار کا تجسس ہے اس کا ہر جواب اسے ملے گا، کچھ جوابات وقت دے گا کچھ میں دوں گا، اسے کہیے گا وہ مجھے یاد ہے، وہ بھی مجھے اپنی دعا میں ساتھ رکھے، اس کے لئے اور آپ کے لئے نیک دعائیں اور دعاؤں کی درخواست، میں کہیں سیٹل ہو جاؤں ابا جی تو آپ کو بلاؤں گی اپنے پاس، یا خود آ جاؤں گی، اپنا خیال رکھیے گا اور اپنی غیر مسلم بیٹی کو معاف کر دیجئے گا، آپ کی بیٹی امرکلہ۔"

خط پڑھ کر پروفیسر کے اندر ٹھہراؤ سا آ گیا، وہ چھٹی لے کر کئی منٹ تک بیٹھا رہا، ساکت و جامد، پھر اٹھا اور باہر نکل گیا، انہیں پتہ تھا کہ یہ چھٹی کسی کو پہچانی ہے اور مزے کی بات کہ انہیں رستے ہی میں علی گوہر مل گیا، زخمی سا سرخ کوٹ میں اسی حالت میں، انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا تھا۔

"تانگہ روک دو نواز بھائی سامنے پروفیسر غفور کھڑے ہیں۔" نواز نے گھوڑے کی لگام کھینچی گھوڑا ہنہنایا پھر رکا، پروفیسر غفور بڑبڑاتے ہوئے علی گوہر کی طرف آئے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا، خاموشی سے اس کی طرف چھٹی بڑھائی اور اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کر کے کھسک گئے، وہ نا سمجھی سے چھٹی کوٹ میں ڈال کر بیٹھ گیا، دل کے آگے کی جیب اور اہمیت کی حامل ہو گئی تھی۔

"تم اسے پروفیسر غفور کہتے ہو، ان کو اکثر آڑوؤں کے ٹھیلے کے پاس دیکھا تھا۔" نواز نے تانگہ چلاتے ہوئے کہا۔

"ان کو پوری دنیا پروفیسر غفور کے نام سے جانتی ہیں اور میرے خیال سے ایک دنیا نے ان کو آڑوؤں کے ٹھیلے کے سامنے دیکھا تھا۔" پہلی بار علی گوہر آج کے دن میں ہنسا تھا، نواز حسین بھی ہنس پڑا، ماحول کی گرمی کچھ کم ہونے لگی دھوپ سارے میں پھیل رہی تھی۔

READING http://readingcorner.com

"اب فنکار کی طرف چلو۔" اس نے کہتے ہوئے چٹھی جیب سے نکالی اور پڑھنے لگا، جیسے جیسے تانگہ ہچکولے کھاتا، ویسے ویسے اس کا دل ہچکولوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔

دکھ، احساس، انکشاف مایوسی اور امید، کیفیات آپس میں ٹکرانے لگیں۔

☆☆☆

شام کی ٹھنڈی ہلکی ہلکی ہوا بدلتا ہوا موسم روشنی تاریکی میں بدلنے لگی، لوگوں کے گھروں کے اندر باہر روشنیاں جلنے لگیں اور فنکار کے گھر کے لاؤنج میں ایک بلب جلنے لگا جو دور دور تھوڑی سی روشنی بانٹ رہا تھا مگر روشنی بہرحال ناکافی تھی اتنے بڑے سے گھر کے لئے، اسے خیال آیا مزید روشنیوں کا ہونا کتنا ضروری ہے، اس نے ایک سرچ لائٹ جلا کر نیچے تاک پر رکھ دی، وقت کا ٹھیک اندازہ نہ تھا یہی مغرب کا وقت ہوگا، اس نے وضو کیا، نماز ادا کی اور جاء نماز تہہ کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہی تھے کہ کھلے دروازے سے گھوڑے کی آوازیں آنے لگیں اور کسی کی باتوں کی، کوئی نیچے اترا اندر آ رہا تھا، اس نے بڑھ کر دیکھا تو چوکھٹ پر کوئی اور نہیں اس کا اپنا قائم مقام شہزادہ علی گوہر تھا، جو آگے بڑھ کر والہانہ لپٹ گیا۔

گھوڑا گاڑی صحن میں کھڑی تھی، گھوڑی بچی کچی جھاڑیوں کے پتے کھانے لگا، قریب آتے نواز حسین نے سر تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا تو علی گوہر نے الگ ہو کر ایک ہاتھ تھام لیا تھام کر آنکھوں سے لگا لیا اور آنکھوں سے لگا کر دل پر رکھ لیا۔

"یہاں ایک امانت ہے جو آپ کو دینی ہے۔" علی گوہر کی نم آنکھیں خشک ہو چکی تھیں، چہرہ تھکا تھا لہجہ بوجھل تھا، جیسے سو کر کوئی اٹھتا ہے جیسے رو کر چپ ہوتا ہے، جیسے نیا نیا بیمار صحت یابی کی طرف پہلا قدم دھرتا ہے فنکار اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا، ابھی جی بھر کر دیکھا نہیں تھا کہ دروازہ ہٹا، امرت راشن کا ایک تھیلا لئے اندر آئی۔

"تم علی گوہر؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

وہ خود اس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم یہاں مگر انصیانی طور پر امرت کے رکشے کے پیچھے جو رکشہ آ رہا تھا اس میں عمارہ موجود تھی جو تیزی سے اندر آئی تھی۔

"تمہیں ذرا احساس نہیں ہے گھر میں کسی کا، کہاں کہاں مارے پھر رہے ہو، ایک ماں ہے اور بوڑھا باپ جو روتے رہتے ہیں۔" وہ آتے ہی برس پڑی اور چونکی جب اس کے سر پر پٹی دیکھی۔

"یہ کیا ہوا ہے، کہاں سے چوٹ کھا کر آئے ہو پھر، مت سدھرنا کبھی چہرے پر کرو چیں، کبھی سر پر چوٹ۔" غصہ حد سے سوا تھا۔

وہ کیا کہتا کہ کہاں سے چوٹ لگوا کر آ رہا ہے، کچھ کہتا کہ کھلا دروازہ پھر کس کو ویلکم کر رہا تھا، حالار اپنا سوٹ کیس گھسیٹے اندر آ رہا تھا، سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، خود حالار بھی، اب کون وہاں ایسا تھا جو کہ حیران نہیں تھا۔

(جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں :۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan
Like us on Facebook
fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety1

کہیں جو ہم سے اٹکے

عابی ناز

"نہیں ...... یں ...... یں ...... یں ...... یں ...... یں۔" ہماری بے ساختہ چھت پھاڑ قسم کی چیخ بلند ہوئی ہے قارئین آپ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں ہماری دلدوز چیخوں کے اثرات سے محفوظ فرما لیجئے پلیز کیونکہ ہم ابھی چند منٹ مزید یہ ہی مشغلہ جاری رکھنے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔

"نہیں ...... یں ...... یں ...... یں نہیں یہ ہو گا، نہیں یہ ہو گا، نہیں یہ ہو گا نہیں نہیں نہیں نہیں۔"

ایک واشنگ پاؤڈر کی مشہوری تو دیکھی ہو گی آپ نے جس میں کہتے ہیں بلکہ گاتے ہیں۔

"نہیں بچے گا نہیں بچے گا نہیں بچے گا نہیں نہیں نہیں نہیں۔" ہم بھی بس ذرا اسی دھن میں اپنے انکار کو شدومد کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

کیوں بھلا؟ یہ انکار کس لئے آخر؟ ٹھہریئے بتاتی ہوں ذرا اپنی خوبصورت جھیل جیسی آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو صاف کر لوں

ناولٹ

(جیلس نہیں ہونا پلیز اس کام کے لئے ہماری باقی چار عدد گروپ ممبرز ہی کافی ہیں پھر بھی اگر کوئی جیلس ہو تو وہ یہ یاد رکھے کہ جلنے والے کا منہ کالا ہوتا ہے اور ہم کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ ہمارے اتنے پیارے اور سوہنے موہنے سے چاہنے والوں کا "منہ مبارک" کالا ہو بس اسی لئے آپ کو جیلس ہونے سے روک رہے ہیں ورنہ ہمارا کیا جاتا ہے؟)

لو جی ہم نے اپنی آنکھوں کے خوبصورت موتیوں کو اپنی کمبو نما (بڑی سی) چادر کے پلو میں جذب کر لیا ہے، اب آپ یہ خبر ذرا تحمل سے سنیئے گا حضرات کہیں ہماری طرح آپ کی بھی چیخیں نہ نکل جائیں، خبر یہ ہے کہ اب سے کچھ دیر پہلے ہماری اماں جان دانیال فاران یعنی ہمارے منگیتر شریف (جو کہ بالکل بھی شریف نہیں ہیں) کا فون سن کر اندر آئی تھیں اور بڑے صاف ستھرے

اور دوٹوک الفاظ میں یہ آرڈر لگا گئی ہیں کہ آج سے ہمارا اور آپ کا (ہاں جی آپ سے مراد ''حنا'' اور قارئین حضرات ہی ہیں) ساتھ اور رابطہ ختم، یعنی یہ داستان ورودادوالا چھٹی نامہ بند، بس اسی بات پہ ہم نے ''نہیں...... یں...... یں ...... یں۔'' کی صدا بلند کرتے ہوئے ''شدومد'' سے انکار کیا ہے۔

''ہم نے ٹھیک کیا ناں قارئین؟''

''مجھے لگتا ہے ہو نہ ہو یہ شوشہ دانیال نے ہی چھوڑا ہے یقیناً اس نے ہماری پچھلی شکایات سے بھری تحریر پڑھ لی ہے جس میں ہمیں آپ کی طرف سے خوب ہمدردیاں ملی تھیں کہ ''گول گپے'' اور خانہ داری بلکہ ''کھانا داری'' سکھانے کے چکروں میں ان ظالموں نے ہمیں کیسے گھن چکر بنا ڈالا تھا، لیکن آپ فکر نہ کریں جناب ہم بھی عابدہ پروین عرف ہٹلر ہیں، ڈرنے والے نہیں خواہ مدمقابل ہمارا منگیتر ہی کیوں نہ ہو، ہم ابھی دانیال کو فون کر کے اطلاع کیے دیتے ہیں کہ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہونے والا، ہمارا اور آپ کا ساتھ اب کبھی چھوٹنے والا نہیں جیسے ہماری گروپ فرینڈز کی دوستی اٹوٹ ہے اسی طرح آپ کا اور ہمارا ساتھ اور رشتہ بھی اٹوٹ ہو چکا ہے، بس (گل ختم) یعنی بات ختم۔''

جب سے اماں ہمیں یہ حکم صادر فرما کر گئی تھیں ہم نے رو رو کر اپنی پکوڑے جیسی ناک کو رگڑ رگڑ کر لال ٹماٹر بنا ڈالا تھا مگر اب نہیں۔

''اے سنگ دل سماج اب یہ ستم ہم قطعاً نہیں سہیں گے، ہمیں ہمارے ''حنا'' اور عزیز از جان قارئین سے کوئی الگ نہیں کر سکتا۔'' ہم دکھی آتما بنے بلند آواز میں چیخ چیخ کر یہ سب اس لئے دہرا رہے ہیں تاکہ دانیال کے علاوہ اماں جان بھی (جو کہ اس وقت ہمارے کمرے سے باہر چولہے کے پاس کھڑی ہمیں کوس رہی ہیں) سن لیں، وہ ہمیں کوس اس لئے رہی ہیں کیونکہ آرڈر جاری کرنے کے فوراً بعد انہوں نے ہمیں روتے بسورتے منہ کے ساتھ کاغذ قلم پکڑتے دیکھ لیا تھا اب وہ ہمیں لکھتا دیکھ رہی ہیں اور ہماری بلند و بانگ بڑبڑاہٹ بھی سن رہی ہیں سو...... پتہ نہیں قارئین ہمیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ جب سے ہماری منگنی ہوئی ہے سارا زمانہ ہمارا ویری ہو گیا ہے خاص طور پر اماں اور ہماری چاروں گروپ فرینڈز تو ہاتھ دھو کر بلکہ نہا دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئی ہیں، اپنا تو وہ حال ہو گیا ہے کہ۔

جن پہ .... تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔

بھئی مجھے یہ مصرعہ پورا یاد نہیں آ رہا فی الوقت (رو رو کر دماغ جو ماؤف ہو رہا ہے) تو آپ لوگ خود ہی خالی جگہ پر کر لینا مناسب لفظ لگا کر، تھوڑی پریکٹس بھی ہو جائے گی آپ کی اردو ایگزیم کے لئے، خیر ہم بات یہ کر رہے تھے کہ ہماری اماں اور دوستوں کو نجانے کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہر جگہ ہر وقت ہمارا احساس کم کرتی ہیں اور دانیال صاحب کا زیادہ۔

''عابدہ کھانا پکانا سیکھ لو یار کیوں دانیال کو بھوکوں مروانے کا ارادہ ہے؟''

''اے اپنا پھٹا سپیکر ذرا دھیمے والیوم میں چلانے کی عادت ڈال لو اب دانیال تمہاری چیخی آواز کہاں سہہ سکے گا؟''

''بے وقت گدھوں کی طرح دانت مت دکھایا کرو کیا سوچے گا دانیال؟''

''ارے دانیال کو سگھڑ اور سلیقہ مند بیوی چاہیے ہو گی دوسرے مردوں کی طرح مگر تو تو اپنے پھوہڑ پن سے میری ناک کٹوائے ہی کٹوائے۔'' یہ ہیں حضرات ان ہزاروں میں سے چند ایک جملے جو میری اماں اور دوستیں ماتھا پیٹ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں:۔
- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
We Are Anti Waiting WebSite
واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook
fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety1

کر وقتاً فوقتاً ارشاد فرماتی رہتی ہیں، وہی دوستیں جو ہم پر جان چھڑکتی تھیں اب بات بے بات نوک ٹوک کرتی رہتی ہیں اور اماں......؟ ہائے کچھ نہ پوچھو ہماری پیاری اماں کا تو، وہی اماں جو چھٹیوں میں ہاسٹل سے گھر آنے پر ہمارے منہ میں گھی شکر کے نوالے دیتی نہ تھکتی تھیں اور ہمارا پاؤں تک بستر سے اترنے نہ دیتی تھی کہ جی ”بیٹی بے چاری“ تھکی ہاری گھر آئی ہے سارا سال پڑھ پڑھ کر تھک جاتی ہے اسے مکمل آرام کرنے دو“ اب اسی ”تھکی ہاری“ ”بے چاری“ سی بیٹی کو کولہو کے بیل کی طرح جوتا ہوتا ہے اور ان کی تسلی پھر نہیں ہوتی، بہرحال اپنے سابقہ تجربات، حالات واقعات اور حادثات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے اپنے آپ کو بہت بدل لیا ہے، ہم انجلینا جولی سے ”ماسی سکینہ“ کے حلیے میں ڈھل گئے ہیں تاکہ میری پیاری ’مکھیاں‘ اور ”بے بو“ (اوہو) میرا مطلب ”بے بے“ مطمئن ہو سکیں کہ ہم انہیں دانیال فاران اور سسرال والوں سے کوئی طعنہ نہیں دلوائیں گے مگر مجال ہے جو انہیں ہماری حالت زار پر ترس آیا ہو۔

☆☆☆

پورے دو ماہ ہو چکے ہیں قارئین ہمارا تھرڈ سمسٹر ختم ہوئے اور گھر پہنچتے ہی اماں اور گھر والوں نے جو ہمیں تختہ مشق بنایا ہے تو ہمارا سانس تک نہیں نکلنے دیا، (ہائے ربا اب تو ہماری کمر بھی تختہ ہی ہو چکی ہے) مگر ان لوگوں کی باتیں ”ایسے نہ چلو، یوں نہ بیٹھو، ہنسنا چھوڑ دو، قلانچیں نہ بھرا کرو، ایڈوانچرز ختم کر دو، آواز دھیمی رکھو وغیرہ وغیرہ غرض کیڑے ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے، (حالانکہ ہم نے کیڑے مار موثر دوا بھی ڈالی تھی پر......) اوئے ایڈوانچر کا نام آیا تو ہمارے خالی سے دماغ میں بلب جل اٹھا ہمارا پچھلا ایڈوانچر گھوم گیا ہے ذہن میں، ابھی شیئر کرتی ہوں آپ کے ساتھ مگر پہلے اپنا رونا تو رو لوں (آپ کے سامنے)۔

لیجئے اب تفصیلاً آپ بیتی سنیئے، جیسے ہی ہم خدا خدا کر کے تھرڈ سمسٹر اینڈ کرتے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر گھر پہنچے تو ہمیں گھر پہ نرم دل اور نرم مزاج سی اماں نہیں بلکہ ہلاکو خان یا چنگیز خان کی شاگرد کڑک اور ظالم سی اماں نے ویلکم کیا، ایک تو اپنی عزیز دوستوں سے پورے تین ماہ کی جدائی کا قلق تھا اوپر سے رہی سہی کسر اماں کے درشت آرڈر نے پوری کر دی، جی ہاں جناب وہ گول گپوں والے حادثے کی مکمل جانکاری حاصل کرنے کے بعد اماں نے دوسرے ہی دن ہمیں کان سے پکڑ کر کچن میں گھسیڑ دیا اور ہم ”بے چارے“ بنا چوں چراں کیے خاموشی سے جون کی گرمی اور تپتی دوپہروں میں چولہے پہ سکنے کے لئے تیار ہو گئے، پندرہ دن ہاں جی عوام الناس پورے پندرہ دن ہم نے بھڑ بھڑ کرتے چولہے پہ بہتے پسینے سمیت سینکڑوں کے حساب سے روٹیاں سینکیں تو کبھی چاول پکائے، دالیں گوشت سبزیاں غرض ایسا کون سا آئٹم ہے جس پر ہم نے طبع آزمائی نہ کی ہو بلکہ ”قسمت آزمائی“ نہ کی ہو، اب تو وہ ڈشز جن کا ہمیں نام تک معلوم نہ تھا ان میں ہم طاق اور جفت بھی ہو چکے ہیں، میرا مطلب ماہر ہو چکے ہیں، حرا نعیم جی اب اگر آپ کہیں تو ہم آپ کو ساری ڈشز بمعہ تراکیب لکھ کر بھیج دیں تاکہ آئندہ آپ کو ہم سے شکوہ نہ رہے، دانیال، اماں اور دوستوں کے شکوے تو ہم مٹا نہ سکے مگر اپنے قارئین کی شکایات ہم ضرور ختم کریں گے، جلیبیاں رس گلے، کیک، سٹرابری، ونیلا اور چاکلیٹ ہر قسم کی سویٹ ڈشز اور ہاٹ سپائسی اینڈ کرنچی ہر قسم کی اسنیکس آئٹم اور اس کے علاوہ

دالوں سبزیوں اور گوشت کی ڈشز اور سالن ہم ٹرائی کر چکے ہیں، جی جی قارئین اپنی پیاری بہن سندس جبیں صاحبہ کا پاستا اور میکرونی کیسے بھول سکتے ہیں ہم؟ وہ بھی بنایا، جس کا ذکر وہ اکثر اپنی کہانی میں کرتی ہیں غرض ان پورے پندرہ دنوں میں کھانے کے تینوں اوقات یعنی صبح دوپہر شام ہم نے ایک نت نئی ڈش آزمائی اور بنائی ہے، یہ الگ بات کہ اس دوران رسوئی میں برتنوں اور ڈبوں کی جگہ زبیدہ آپا، نور افشاں اور سعید بھائی کی کوکنگ بکس کا پلندہ اور ہم ٹی وی اور مصالحہ چینل پر نوٹ کروائی جانے والی ریسی پیز ”حنا ڈائجسٹ کے دستر خوان“ والے صفحات کے بڑے بڑے ڈھیر زیادہ نظر آتے رہے، اماں کے حکم اور دانیال اور دوستوں کی باتوں کو ہم نے کڑھتے ہوئے ہی سہی مگر چیلنج کے طور پر لیا اور بالآخر ون بھی کیا، بھئی عابدہ پروین کسی کام میں ہاتھ پیر ”ننگ“ کے کودے اور اسے بخیریت انجام نہ دے ہو سکتا ہے بھلا؟ (آہم آہم، اب ذرا ہمارے فرضی کالر دیکھیں اتنے اونچے کھڑے ہو گئے ہیں کہ ہمیں دائیں بائیں کی کوئی چیز سر اونچا کرنے پر بھی دکھائی نہیں دے رہی)

اینی ویز ہماری یہ کچن کشتی اور دھینگا مشتی نجانے مزید کب تک جاری رہتی کہ جون کے آخر پہ اللہ تعالیٰ نے ہماری حالت پر رحم کھایا اور رمضان المبارک کا مہینہ آن پہنچا، جس کے آغاز پہ اماں نے ہماری دہک دہک کر لال اور پھر بالآخر کالی ”بمب“ ہو جانے والی رنگت، گھاس جیسے اڑے ہوئے بال اور سر سے پیر تک نچڑتی قمیض اور اس پر ہماری بذات خود نچڑی ہوئی شکل دیکھ کر ترس کھاتے ہوئے ہم سے یہ ذمہ داری واپس لے لی (اوہ خدایا تیرا شکر ہے)۔

”ہک ہاں جان چھوٹی خدا خدا کر کے۔“ ایک نہایت ہی طویل بلکہ طویل ترین سانس بھر کر ہم پسینہ پونچھتے ہوئے ابھی بستر پر گرے ہی تھے کہ اماں پھر سے چلی آئیں۔

”میری لاڈلی، میری چندا میری گڑیا اور پتہ نہیں کیا کیا۔“ اماں اب ہمارے واری صدقے جا رہی تھیں اور ہم اپنی پہلی والی نرم دل سی اماں کو پا کر چھوئی موئی کی طرح چرمر ہوتے ان کے لاڈ پر نہال ان کی گود میں سما رہے تھے۔

”رسوئی کا کام تو سیکھ لیا میری لاڈو نے اب ذرا گھرداری بھی سیکھ لے۔“ اماں کی بات کا بقیہ حصہ سماعت فرمانے پر ہم جو ان کی بغل میں منہ گھسیڑے دبکے ہوئے تھے جھٹکا کھا کر الگ ہوئے۔

”اماں؟“ انداز ایسا تھا گویا اماں کی دماغی حالت چیک کرنا چاہ رہی ہوں (خدانخواستہ)۔

”جی میری گڑیا۔“ اماں کا انداز بھی ہنوز تھا۔

”تو کیا اب تک ہم ”باہرداری“ سیکھ رہے تھے۔“ انتہائی صدمے کے زیر اثر منہ لٹکا کر استفسار کیا گیا۔

”نہیں میری لالو (اماں کا ہمارے لئے مخصوص لفظ) اب تک تو تم ”کھانا داری“ سیکھ رہی تھیں۔“ اماں نے بڑے تاک کر میرا ہی لفظ میرے ہی انداز میں دوہرا مارا، تو ہم کلس کلس ہو گئے، لیکن سامنے چونکہ ”اماں جان“ تھیں چنانچہ صبر کے گھونٹ غٹاغٹ پیتے ہوئے پھر بولے۔

”تو گھرداری اور کسے کہتے ہیں اماں؟“ (بھولپن کی انتہا تھی یار)۔

”تجھے معلوم نہیں میری بچی تو کوئی بات نہیں ہم ہیں ناں؟ ہم بتائیں گے تجھے کہ گھرداری کیا ہوتی ہے؟“ اماں نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ ہمیں پچکارا تو ہم دہل سے گئے، اماں کی آنکھوں

کی چمک جتنی بڑھتی جا رہی تھی ہماری نازک سی پسلیوں کے پیچھے چھپا چڑیا جیسا ننھا دل اتنی ہی شدتوں سے دھڑ دھڑاتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''نہیں یہ ہوگا نہیں یہ ہوگا نہیں یہ ہوگا نہیں نہیں نہیں نہیں ایسا کوئی بھی کام کبھی بھی ہم سے ہوگا نہیں نہیں نہیں نہیں۔'' پھر وہی واشنگ پاؤڈر کی مشہور (آج کل یہ مشغلہ ہمارا فیورٹ ہے قارئین سو پلیز ڈونٹ مائنڈ)

ہم صحن کے بیچوں بیچ ٹانگیں پسارے بیٹھے ''جلی'' والے انداز میں ایک ہی ورد کیے جا رہے تھے، گود میں دھرا گز بھر کا ''جھاڑو'' ہمارے زور و شور سے دائیں بائیں گردن گھمانے پر کبھی دائیں جھول رہا تھا تو کبھی بائیں، جبھی اچانک تھپاک اور پھر پٹاخ پٹاخ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

یہ آوازیں کسی انسٹرومنٹ یا پٹاخوں کی نہیں جناب بلکہ ہماری گردن اور پھر کمر پر بالترتیب پڑنے والی اماں کی ''چپڑ'' اور پھر نئی نویلی جوتی کی تھیں، ہم اچھل کر کمر سہلاتے اپنی جگہ سے چار فٹ دور ہوئے، اگلے کچھ پل میں ہم ''شریف زادوں'' کی طرح جھک جھک کر پورے گھر میں جھاڑو لگاتے پائے گئے جبکہ اماں کی با آواز ''لن ترانیاں'' بھی ساتھ ساتھ کانوں میں انڈیل رہے تھے۔

اماں ہمارے سر پر چڑھی ہم سے گھر کے تمام کونے کھدرے تک صاف کروا رہی تھیں اور ہم ''صافی'' سیرپ پینے پر بننے والی شکلوں جیسے منہ کے زاویے بناتے من ہی من سوچ رہے تھے کہ ''ہمارا گھر آج سے پہلے کبھی ہمیں اتنا بڑا کیوں نہیں لگا جتنا اس وقت......'' ہم سے رہا نہ گیا تو آخر کار جھاڑو جھٹک کر جھنجلاتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

''اماں ہمارے گھر کے افراد کتنے ہیں؟''

اماں جان جو کہ پورے دل اور جذب کے ساتھ ہمیں کوسنے میں منہمک تھیں ہمارے سوال پر چونک کر ہمیں دیکھنے لگیں، (ظاہر ہے سوال ہی ایسا بھونڈا تھا)۔

''ذرا میرے ساتھ مل کر گنیے ناں۔'' میں نے باقاعدہ انگلیوں کے پوروں پر گنتے ہوئے اماں کو بھی اس ایکٹیویٹی میں کھینچا تو وہ سب چھوڑ چھاڑ بڑی توجہ سے ہمارے سنگ ہوئیں۔

''ہم دو بہنیں ایک بھائی اور دو اماں ابا، نہیں میرا مطلب ایک ایک اماں ابا۔'' اماں کی گھوری پر ہم نے فٹ تصحیح کی۔

''یعنی کل ملا کر پانچ افراد، تو اس کے لئے دو کنال پر محیط گھر بنانے کی کیا ضرورت تھی اماں؟ آپ کو پتہ ہے زمین کی کتنی قلت ہو رہی ہے، آبادی جس تناسب سے بڑھ رہی ہے اس حساب سے آئندہ چند سالوں میں افراد زیادہ اور جگہ کم ہو جائے گی، ان سالوں میں شرح اموات شرح پیدائش سے کہیں کم ہے، تو اگر ہماری طرح لوگ اتنے اتنے بڑے گھر بناتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب غریب لوگوں کو کھڑے ہونے کے لئے بھی زمین میسر نہ ہو گی۔'' ہم جنرل نالج مطالعہ پاکستان اور پولیٹیکل سٹڈی تینوں مضامین کو ملا کر ایک اچھا خاصا لیکچر ایک ہی سانس میں جھاڑتے ہوئے اماں کو امپریس کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا مدعا سمجھانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے۔

''لیکن اماں بے چاری کو کہاں سمجھ میں آتا ہے اتنی جلدی۔'' یہی سوچ کر ہم دوبارہ اپنی لمبی تقریر پر لوٹے مگر یہ کیا؟! ابھی ہم نے بولنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ اماں جان کا بھاری بھر کم ہاتھ ایک بار پھر ہماری کمر پر دھپ سے آن پڑا، جس کا

مطلب یہ تھا کہ وہ ہمارا اصل مدعا سمجھ چکی تھیں۔

☆☆☆

شاید ان کا آخری ہو یہ ستم
سوچ کر یہ ہر ستم ہم سہہ گئے
دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے
ہم وفا کرکے بھی تنہا رہ گئے
دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے

گانے والی کے ساتھ ہمارے موٹے موٹے آنسو بھی دھڑا دھڑ بہہ رہے تھے، قریبی چارپائی پر بیٹھی فاخرہ (چھوٹی بہن) ہمیں پوری پوری تسلیوں اور تشفیوں سے نواز رہی تھی پر کہاں جی آنسو تھے کہ اور بھی روانی سے بہے گویا۔

درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کوئی ہمیں اس طرح روتے دیکھ لیتے تو یہی سوچتا (جو اس وقت آپ سوچ رہے ہیں) کہ ہم اتنے کام چور ہیں ذرا سے کام سے گھبرا گئے؟ لیکن کیا بتائیں قارئین۔

''ہم نازک ہی اس قدر ہیں کہ ذرا سا کام کرنا پڑ جائے تو ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔'' (آہم آہم) یہ تشریح ہماری زبان میں ہوئی جبکہ ہماری اماں کا ہمارے اس رونے کے بارے میں شاہی فرمان یہ ہے کہ ''کاہل ہی اس قدر ہے کہ ذرا سا کام کرنا پڑ جائے تو موت پڑ جاتی ہے اسے۔''

''اب بس بھی کریں آپی پچھلے آدھے گھنٹے سے رو رو کر تھکی نہیں آپ؟ اور کتنی دیر مزید رونے کا ارادہ ہے؟'' فاخرہ تھک کر پوچھ رہی تھی۔

''آدھ گھنٹہ مزید۔'' ہم نے بہتے آنسوؤں کے دوران ہچکی لے کر کہا تو اس کی موٹی موٹی سی آنکھیں اور بھی پھیل گئیں، (ہماری آنکھیں جتنی ننھی منی اور چھوٹی چھوٹی سی ہیں اس کی آنکھیں اتنی ہی بڑی بڑی اور نشیلی ہیں وہ شکل و صورت میں اماں پہ گئی ہے تو ہم ابا پہ)۔

''ہائیں؟ کیوں اپنی جان کی دشمن ہو رہی ہیں آپی؟'' ظاہری بات ہے اس نے پوچھنا تو تھا اور یہی تو ہم چاہتے تھے کہ کوئی ہم سے پوچھے اور ہم جلے دل کے پھپھولے پھوڑ سکیں اور یہ موقع اس نے ہمیں دے دیا، بس پھر کیا تھا قارئین ہم پھٹ ہی تو پڑے۔

''کیونکہ باقی سب ہماری جان کے دشمن ہو گئے ہیں تم نے دیکھا نہیں اماں کیسے ہماری سوتیلی اماں کے روپ میں ڈھل گئی ہیں جب سے منگنی کروالی ہے ہم نے تو گویا اپنی جان پھنسا لی ہے کوئی احساس نہیں رہا کسی کو ہمارا، وہ کلموہیاں بلکہ چوہیاں بھی دوست سے دشمن بن چکی ہیں اور ادھر اماں چنگیز خان کے سارے ریکارڈز توڑنے پر مصر ہیں، آخر کوئی ہمیں بتائے تو سہی ہمارا قصور کیا ہے؟'' نجانے کتنے عرصے سے اندر ہی اندر پکتا لاوا آتش فشاں تو بننا ہی تھا۔

''ارے آپی ایسی کوئی بات نہیں یہ تو سب آپ کی پریکٹس کروا رہے ہیں تاکہ شادی کے بعد......''

''بھاڑ میں گئی شادی، سسرال اور دانیال (دعا کریں اب دانیال یہ سٹوری بھی نہ پڑھ لے ورنہ ہماری رائٹر گیتی لازمی خطرے میں ہوگی) مجھے نہیں کرنی ہے کوئی شادی وادی، نہیں جانا ہے سسرال اور نہ ہی کوئی منگنی رکھنی ہے۔'' فاخرہ کی بات اچک کر ہم کاٹ کھانے کو دوڑے۔

''اجی ہم نے تو اپنی منگنی شدہ کلاس فیلوز ہم عمر لڑکیاں اور پھر اپنی گروپ فرینڈز کے عیش دیکھ کر بڑے چاؤ چاؤ میں منگنی کروائی تھی کہ کیسے یہ لوگ منگنی کروا کر کھل سی جاتی ہیں، تو رہی الگ ہوتے ہیں ان کے، ہر عید شب برات پہ سسرال

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

بلکہ ہمیں وہی اپنی پہلی والی آزادی، من مرضی، سہولیات اور لاڈ و ناز سے پر زندگی واپس چاہیے جب اپنا یہی پتھر کی سل جیسا اٹل فیصلہ ہم نے شام کو اماں ابا کے گوش گزار کیا تو اماں کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا یا شاید ہمارے الفاظ پر اسی لئے دہرا کر پوچھا۔

’’کیا کہا تو نے؟‘‘

’’وہی کہا جو آپ نے سنا آپ دانیال اور اس کی فیملی کو صاف انکار کر دیجئے۔‘‘ ہم نے اپنی سرخ پھولی ہوئی ناک رگڑی۔

’’کیوں بیٹا کیا بات ہو گئی؟‘‘ اس سے پہلے کہ اماں ہاتھ میں پکڑا بیلن گھما کر ہماری عقل ٹھکانے پر لاتی ابا حضور نے بروقت انٹری دے کر ہمیں بال بال بچا لیا۔

اور پھر جیسے ہی ابا کا بایاں بازو ہمیں بلانے اور سینے سے لگانے والے انداز میں اٹھا ہمیں تو گویا بل میں چھپنے کو جگہ مل گئی ابا کا کندھا پا کر ہم نے جو بھائیں بھائیں اور ڈھائیں ڈھائیں رونا شروع کیا تو ابا کے ساتھ ساتھ اماں بھی بوکھلا اٹھیں اور چھوٹے بہن بھائی تو سہم کر ایسے ساکت ہوئے کہ دیکھنے والے کو گمان گزرتا کوئی ’’سٹیچوز‘‘ دھرے ہیں، ہلانے پر ہلتے نہیں بلانے پر بولتے نہیں پتہ نہیں سانس بھی لے رہے تھے کہ نہیں؟ یہی سوچ کر ہم نے جلدی ہی اپنی آہوں اور ہچکیوں پر کنٹرول پانے کی سعی شروع کر دی، چند منٹ بعد ہماری سسکیاں ہولے ہولے تھمنے لگیں تو سب کی جان میں جان آئی۔

’’ارے میری جان ہوا کیا ہے، ایک بار بول تو سہی، کسی نے کچھ کہا ہے تو بتا میں ابھی اس کی ایسی کی تیسی کر دوں گا، بول میری بچی، ابا کی جان بول تو ایک بار۔‘‘ ابا کی تو جان پہ ہی بن آئی تھی اپنی لاڈلی بیٹی کو روتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی اس طرح، انہوں نے کوئی بیسیویں مرتبہ پوچھا تو ہم نے ’’سہیلیوں اور اماں‘‘ کے سارے ستم ایک ایک کر کے مرچ مصالحے اور چاٹ مصالحے ڈال ڈال کر سنائے، اس وقت ہم خود کو دنیا کی مظلوم ترین اور معصوم ترین مخلوق سمجھنے اور شو بھی کروانے کی کوشش میں معصوم سی صورت بنائے بیٹھے تھے، جبکہ ہماری باتیں سن سن کر چھوٹے بہن بھائی اپنی اپنی بغلوں میں منہ گھسائے پھرررر، پھرررر کی آوازوں سمیت اپنی ہنسی روکتے لال پیلے اور نیلے ہو رہے تھے۔

ہم تو مسکین بنے نظریں جھکائے بیٹھے تھے اس لئے یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ اماں ابا بھی ہم سے چھپ چھپ کر منہ دائیں بائیں کر کے مسکرا رہے ہیں، فاخرہ کے ساتھ دن میں ہونے والی اپنی گفتگو دہراتے ہوئے ہم نے جو نظر اٹھائی تو سب کو ہنستے دیکھ کر ہم تو صدمے سے نڈھال ہی ہو گئے۔

’’ابا جان!‘‘ ملال سا ملال تھا ہماری نینوں کی کٹوریوں میرا مطلب کٹاریوں میں ’’اس کا مطلب نصرت فتح علی خان ٹھیک ہی گاتا ہے۔‘‘ ہم نے منہ پھلا کر کہا۔

’’ہیں؟ کیا کہتا ہے بھئی نصرت فتح علی خان۔‘‘ ابا جان نے ہمارے انداز دیکھ کر فوراً ہنسی کو بریک لگائے۔

یار سے غم کہہ کر تو خوش ہو
لیکن تم یہ کیا جانو
تم دل کا رونا روتے تھے
وہ دل میں ہنستا ہو گا
اب کیا سوچیں کیا ہونا ہے
جو ہو گا اچھا ہو گا

ہم اتنے رنج میں بھی گانا بڑے جذب اور پوری طرز کے ساتھ سنانا نہ بھولے تھے، مگر وہاں

ہماری ہر بات کا الٹا ہی اثر ہو رہا تھا اس بار بھی سب کا مشترکہ قہقہہ ایسا تھا کہ ہم تپ اٹھے۔

’’ٹھیک ہے نہیں احساس کسی کو ہمارا تو ہم جا رہے ہیں ہم نے جو کہنا تھا وہ کہہ لیا اب بس۔‘‘ ہم جلے کڑھے انداز میں کہتے ہوئے بھنا کر اٹھے ہی تھے کہ ابا جان نے فٹافٹ ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں واپس اپنے بازو کے گھیرے میں بٹھایا۔

’’نہیں میرا پیارا بچہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہی ہو تم تو ہمارا جگر گوشہ ہو ہمیں تمہارا احساس نہیں ہو گا تو اور کس کا ہو گا بھلا؟‘‘ ابا نے پیار سے پچکار کر ہمیں ٹھنڈا کرنے کا کام پہلے کیا تھا اب مزید مکھن ملائی لگ رہی تھی اور ہم واقعی اندر تک تر ہو رہے تھے۔

’’دیکھو بیٹا بات اصل میں یہ ہے کہ ہم نے تمہاری پرورش بڑے ناز و نعم سے کی ہے شادی کے پانچ سال بعد بہت دعاؤں اور مرادوں سے پایا تھا تمہیں اور پھر بڑی اور پہلوٹی کی اولاد ہونے کی وجہ سے بہت ناز نخرے بھی دیکھے، یوں بھی میں ہمیشہ بیٹیوں کو زیادہ پیار دینے کا قائل رہا ہوں، تو یوں تمہاری اماں اور سہیلیوں کا خیال ہے کہ ہم نے تمہیں زیادہ بگاڑ لیا ہوا ہے لیکن میں آج بھی یہ سمجھتا اور جانتا ہوں کہ میری بیٹی نہ بھی بگڑی تھی نہ بگڑی ہے اور نہ بگڑے گی بلکہ یہ ناز و نخرے بس اس کا لاڈ اور بچپنا ہے ورنہ میری بیٹی بہت ہونہار، لائق اور سلیقہ مند ہے، مجھے پتہ ہے کہ تم شادی کے بعد سگھڑ بیوی بنو گی، لیکن بیٹا ان لوگوں کو تھوڑا ڈاؤٹ تھا تمہاری قابلیت اور سلیقہ شعاری پر اس لئے شادی سے پہلے ایک بار تم سے ہر قسم کا کام کروا کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی تمہاری اماں تو میں نے بھی یہ سوچ کر اجازت دے دی کہ تم اس بار بھی ہمیشہ کی طرح ہر ٹاسک میں اور ہر چیلنج میں کامیاب رہو گی، مگر یہ کیا میرا جانباز کھلاڑی تو ٹاسک چھوڑ کر رونے بیٹھ گیا، وہ تو میدان سے بھاگنے اور ہار جانے کی باتیں کر رہا ہے۔‘‘ ابا بڑی ملائمت سے ہمیں بھگو بھگو کر مار رہے تھے۔

’’بیٹا کیا گھر کے یہ چھوٹے چھوٹے کام اتنے ہی مشکل ہوتے ہیں کہ تم شادی سے ہی انکار کر دو؟‘‘

’’ہائے ربا ابا جان تو ہمیں شرمندہ ہی کر گئے۔‘‘

’’دیکھو بیٹا شادی ہر لڑکی کو کرنی پڑتی ہے اور گھر کے کام کاج بھی، اگر آپ ایسی باتیں کرو گی تو میں یہی سمجھوں گا ناں کہ آپ کی اماں اور دوستیں ٹھیک تھیں اور میں غلط، تو کیا آپ سب کے سامنے میری انسلٹ برداشت کر پاؤ گی؟‘‘ ابا نے کہا تو ہم نے مسکین سی شکل بنائی۔

’’وہ تو ہم سے کبھی برداشت نہیں ہو گی ابا جی پر......‘‘

’’چلو جی پھر سے پر اگ آئے ان کے؟ اینویں اپنا اتنا قیمتی وقت اور الفاظ ضائع کیے ابا جان آپ نے اس پر، حالانکہ جانتے بھی ہیں اس کو بات بے بات پر پر کرتے ہوئے پر لگا کر اڑنے کی عادت ہے اسے کہاں اثر ہوتا ہے؟ ابا جان اس کا اوپر والا پورشن خالی ہے اس لئے اسے آپ کی یا ہماری بات سمجھ میں نہیں آئے گی اسے تو بس اپنی پڑھائی اور ایڈوانچر کے سوا نہ کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سوجھتا ہے۔‘‘ دل میں حسد کے شعلے دبائے بیٹھے ندیم نے بھڑ بھڑ جلنا شروع کر دیا اور ان بھانبڑوں سے اٹھتے دھوئیں اور گرمی کو میں تو کیا آپ لوگ بھی محسوس کر رہے ہوں گے۔

’’تم کیوں جل ککڑ بن رہے ہو اور رہی تمہاری بات وہ تو کبھی نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔‘‘ میں بھی عابدہ تھی کہاں چھوڑنا تھا اسے بدلہ لئے

بغیر۔

''ایک ہی ایک رشتہ مدتوں بعد ملا ہے اسے بھی انکار کر کے ہمارے ہی سینوں پر مونگ دلنے کا ارادہ ہے کیا ساری زندگی؟'' وہ باقاعدہ لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ایک ہاتھ ٹکا کر فرط جذبات میں صوفے پر چڑھ کھڑا ہوا تو ابا نے اس کی بدتمیزی کا خصوصی نوٹس لیتے ہوئے بے تحاشا گھوریوں سے نوازنے کے بعد اسے شرافت کا لبادہ اوڑھنے کا آرڈر جاری کیا جس کے نتیجے میں وہ اگلے ہی پل بھیگی بلی بنا دبک کر بیٹھ گیا، اگر ابا جان وہاں نہ ہوتے تو میں اسی وقت اس کی اچھی خاصی کھنچائی، دھلائی، صفائی اور ٹھکائی کر ڈالتی مگر ابا کے احترام میں ہمیں خاموش رہنا پڑا۔

''شرم کیا کرو ندیم بڑی ہے وہ تم سے اور بہنوں کے ساتھ کی گئی تمہاری کوئی بھی بدتمیزی میں بخشوں گا نہیں یاد رکھنا۔'' ابا جان نے پھر اسے لتاڑا تو جہاں وہ جھاگ کی مانند بجھا اور بیٹھا اسی قدر ہماری گردن میں اکڑاؤ مزید بڑھا، یہاں تک کہ ہماری گردن اگلے پل لوہے کی سلاخ کو مات دینے لائق ہو چکی تھی۔

''صرف دو سال ہی تو بڑی ہے مجھ سے۔''

ندیم کی بڑبڑاہٹ صرف میں اور فاخرہ ہی سن سکی تھیں لیکن اس وقت جو کچھ ابا اس کو باور کروا چکے تھے اسی کو کافی سمجھتے ہوئے ہم اس کی سرگوشی کو ہرگز خاطر میں نہ لائے اور جلدی جلدی رخ موڑ کر ابا جان سے مخاطب ہوئے۔

''ٹھیک ہے ابا جان، آپ کے لئے ہم کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں، ہم ماسی بن کر گھر کا ہر کام کر لیں گے جب تک ہماری چھٹیاں ختم نہیں ہوتیں ہم گھر کا اور خانہ داری کا ہر کام ایڈوانچر اور ٹاسک سمجھ کر ہی کریں گے، آپ کا یہ جانباز کھلاڑی آپ ک سر کبھی شرم سے جھکنے نہیں دے گا ابا جان آپ نے ہمیں بیٹا بننا سکھایا تھا اب آپ کی ہی خاطر ہم بیٹی بھی بن کر دکھائیں گے ان سب (دشمنوں) کو۔'' دشمنوں کا لفظ ہم نے اپنی تقریر میں سے گول کر کے صاف من ہی من میں کہا تھا اور بطور خاص اماں حضور کو دیکھا تھا وہ چاروں لومڑیاں تو اس وقت حاضر نہیں تھیں اسی لئے ان کا حصہ اماں کے کھاتے میں ڈال دیا، ہمارا انداز اور ڈائیلاگ باری اس سمے بالکل ایسی تھی، جیسے عنقریب جنگ کے میدان میں اترنے والا کوئی کمانڈو یا افسر بے حد جذباتی ہو کر بڑھکیں اور نعرے لگاتے ہوئے یہ تک بھول جائے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔

''کہہ دیجئے انہیں ابا جان کہ کل سے یہ لوگ (یعنی اماں اور فاخرہ) گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگائیں، ہم خود ہی سنبھال لیں گے سب، ہم جانیں ہمارا گھر جانے اور گھر کے کام جانیں بس، انہیں صرف آرڈر کرنا ہو گا۔''

دیکھا میں نے پہلے نہیں کہا کہ ہماری حالت اسی افسر والی تھی جو بڑھکیں مارتے ہوئے یہ بھی نہ سوچے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے، ہم نے بھی کہاں سوچا تھا بھلا۔

''نہیں بیٹا ایسا بھی نہیں ہو گا اب، کام تو یہ بھی کریں گے سب جو ان کی ذمہ داریاں ہیں وہ ان پر ہی رہنے دو تم بس وہ کام کر دینا جو تمہاری ماں کہے گی۔'' ابا جان نے ہماری جذباتیت کو تحلیل کرنا چاہا پر ہمارے پہاڑوں جیسے مصمم ارادے کون ہلا سکتا تھا۔

''نہیں ابا جان ہم کر لیں گے سب خود ہی لیکن ہماری ایک شرط ہے۔'' ہم نے بھرپور سسپنس پھیلایا تو ہماری پہلی باتوں کے زیر اثر بت بنے بیٹھے حضرات سرتاپیر سماعت بن کر ہمہ تن گوش ہوئے۔

''ہمارے سامنے کبھی کوئی شخص سسرال شادی یا دانیال کے نام کا طعنہ نہیں رکھے گا اور اگر کسی نے ان کا ذکر کر کے ہمارے ہٹلر کو اکسایا تو ہم اسے چھوڑیں گے نہیں، ساری گیم اسی پر الٹ جائے گی دیکھنا۔'' ہماری وارننگ بڑی ٹائٹ قسم کی تھی۔

''ارے میرا بچہ، نہیں کرے گا کوئی تمہیں تنگ اور اگر کبھی کسی نے یہ حماقت کی بھی تو تم مجھے بتانا پھر صرف تم ہی نہیں میں بھی مل کر اس کی دھنائی کروں گا او کے؟'' ابا جان نے بڑے پیار اور شفقت سے ہمیں ساتھ لپٹا کر کہا تو ہمیں لگا کہ ہم نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔

''میری پیاری گڑیا، اس دنیا کی سب سے اچھی بیٹی ہو تم۔'' اب وہ ہمارا ماتھا چوم رہے تھے جبکہ باقی ہستیاں مہر بہ لب سلگ رہی تھیں۔

☆☆☆

جی تو اب بقیہ آپ بیتی سنانے سے پہلے ہم آپ کو اپنے سابقہ ایڈوانچر کا احوال سنا لیں جس کا ذکر ہم نے شروع میں کیا تھا اور ندیم نے رات والی طعنہ زنی کے دوران، تو ایڈوانچر کچھ یوں ہے کہ لاسٹ ویکیشنز میں جب ہم تین ماہ کے لئے گھر آئے تھے تو اپنے سابقہ ریکارڈ کو برقرار رکھتے ہوئے فارغ نہ بیٹھنے اور وقت کو بہترین طریقے سے استعمال کرنے کے لئے ایڈوانچر کا نسخہ ساتھ لائے تھے۔

''ہمیں جاب کرنی ہے ہمیں جاب کرنی ہے ہم اتنے ماہ فارغ رہ کر کیا کریں گے؟'' کی رٹ آتے ہی شروع کر دی گئی تو چند دن کی اٹک پھسک کے بعد بالآخر ہمیں پرمیشن مل ہی گئی۔

''آخر اس کی ہڈی کو چین کیوں نہیں ہے، کون سی بلیاں بندھی ہوئی ہیں اس کے پیروں کے ساتھ جو یہ گھر پہ ٹک نہیں سکتی۔'' ندیم اس بار بھی بہت تڑپا تھا، ہمارے ہر کام میں روڑے اٹکانا اور مخالفت کرنا اس کا فرض اولین جو ٹھہرا اور کچھ کرے نہ کرے یہ کام بہت پہنچ کر کرتا ہے وہ لیکن تب بھی اس کی ایک نہ چلی اور ہم اسے ٹھینگا دکھاتے ہوئے اخبار کے آفس جا پہنچے اور جناب صرف ہم ہی نہیں ہماری دوستیں بھی ہمارے اس طرح کی ایڈوانچر میں پیش پیش ہوتی ہیں ہمیشہ، ہمارا گروپ جب ایک ساتھ اگلے پر پل پڑتا ہے تو اسے کچھ بجھنے سمجھانے لائق نہیں چھوڑتا اور انجام کار ہماری جیت ہوتی ہے، چنانچہ اس بار بھی میں سمری اور زہبی اخبار آفس میں موجود تھیں، عاشی اور انیتا کی چونکہ شادی ہو چکی تھی تب تک اس لئے وہ دونوں اپنے ''شوہروں'' کی خدمت گزاری پر معمور ہمارا ساتھ دینے سے قاصر ہیں، چند ایک چکروں اور انٹرویو کے بعد ہمیں ایز اے رپورٹر رکھا لیا گیا، چار دن تو بڑے شوق سے ہم نے اس کام کو سنبھالا لیکن جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ کام ہمارے بس کا نہیں، وقت بے وقت کی دوڑ، کھجل خرابی اور ڈانٹ ڈپٹ سے ہم جلد ہی اکتا گئے اور سرینڈر کر دیا، پندرھویں دن کسی بات پر بہانہ بنا کر اپنے سینئر آفیسر سے منہ ماری کر کے ہم گھر پر آ بیٹھے، لیکن جاب کا بھوت ابھی سر سے اترا نہیں تھا اس لئے ایک بار پھر ''جاب کرنی ہے'' کی گردان رٹی گئی اور گھر والوں کی عدالت میں پر زور دلائل، بحث اور بالآخر فرینڈز کی سفارش سے یہ کام پھر سے بن گیا اور ہمیں اجازت مل گئی، ندیم کو بہلانا ایک نہایت ہی مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا قارئین لیکن سمری نے چٹکیوں میں ندیم کو رام کر لیا، لڑکوں کو ''چکما'' دینا اور پھسلانا سمری کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کیونکہ وہ جتنی ذہین ہے اتنی ہی خوبصورت بھی اور ہمارا ندیم بھی باقی بیوقوف لڑکوں کی طرح اول

درجے کا گھامڑ ہے بس اسی لئے کام جلدی نمٹ گیا، لیکن اس مرتبہ گھر والوں کی طرف سے کسی کمپنی یا فیکٹری میں جاب کی اجازت نہ تھی بلکہ اس اجازت کو صرف ''ٹیچنگ'' تک محدود کر دیا گیا تھا اور پچھلے ایکسپیرنس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم بھی صرف اسی کے حق میں تھے اس لئے ہم تینوں یعنی میں سمری اور زیبی نے قریبی سکول کا رخ کیا، ہماری توپوں سے ہونے والی پرزور گولہ باری اور جان بوجھ کر طاری کیے جانے والے جذبات کو بھی ڈگریوں کے ساتھ بڑی گہری نظروں سے جانچنے کے بعد ہمیں سلیکٹ کر لیا گیا، اب سکول کے ننھے منے سے بچے تھے اور ہم، سرکھپائی کا ایک نیا دور شروع ہوا تو ہم نے جانا کہ پڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے دوسرے کو پڑھانا اور خاص طور پر جب سامنے نرسری اور پلے گروپ کے چھوٹے چھوٹے روتے بسورتے بچے ہوں تو...... (آپ سمجھ ہی سکتے ہوں گے قارئین ہماری حالت) لیکن اس بار ہمیں یہ جاب چھوڑ کر اپنی بے عزتی اور آئندہ کبھی جاب نہ کرنے کی پابندی ہرگز گوارا نہ تھی سو چپ چاپ ان روتے ہوئے بچوں کی آنکھیں اور بہتی ناک رگڑ رگڑ کر صاف کرتے رہے اور اپنے اس فیصلے پر ڈٹے رہتے۔

سکول کوئی بہت ہائی فائی سٹینڈرڈ کا نہیں تھا بلکہ یہ ایک عام سا پرائیوٹ سکول تھا (جس قسم کے سکول ہمیں آج کل ہر گلی گلی اور چپے چپے پر باآسانی مل سکتے ہیں اسی قسم کا) ہم نے یہاں پر جوائن صرف اس لئے کیا تھا کیونکہ یہ ہم سب کے گھروں سے تقریباً دس منٹ کی واک پر تھا (اور پھر کسی اچھے سٹینڈرڈ سکول میں کوئی ہمیں دو ماہ کے لئے تھوڑی رکھتا) یہاں پر زیبی اور سمری مجھ سے قدرے بہتر پوزیشن میں تھیں کیونکہ ان کے حصے میں بالترتیب پانچویں اور چوتھی جماعت تھی جبکہ مجھ بیچاری کو نرسری کے بچوں کے حوالے کر دیا گیا تھا جن کی بات بات پر روتی شکلیں مجھے بھی رلا دیتی تھیں، (ہائے ری قسمت)۔

خیر اپنے آنسو اندر گراتے اور ان بچوں کے آنسو کبھی مار سے تو کبھی پیار سے صاف کرتے ایک ماہ پورا ہو گیا، ہمیں اس بات کی بھی بڑی تسلی تھی قارئین کہ صرف دو ڈھائی ماہ کی ہی تو بات ہے اسی دوران مہینے کے اختتام پر مین ہیڈ آفس کے پرنسپل یعنی اس سکول کے آنر کا چکر ہماری برانچ میں لگا تو انہوں نے ہمیں ننھے منے سٹوڈنٹس کے ساتھ الجھتے دیکھا اور سیدھا ہمارے پاس ہی چلے آئے۔

''آپ شاید نئی اپائنٹ ہوئی ہیں؟''

''یس سر!''

''ہوں، آپ سیٹسفائی ہیں یہاں؟'' انہوں نے پوچھا اور ہم ''نو سر'' کہتے ہوئے فراٹے بھرتے شروع ہو گئے، ہماری ساری بات کو انہوں نے بڑی گہری مسکراہٹ کے ساتھ سنا اور مجھے کل اپنے آفس میں ملنے کی ہدایت کرتے چلے گئے، اگلے دن ان کے آفس پہنچنے پر ہمیں پتہ چلا کہ انہوں نے میرا ٹرانسفر مین کیمپس میں کر دیا ہے۔

''لیکن سر یہاں میں کس کلاس کو پڑھاؤں گی؟'' نیا مسئلہ۔

''جس کو آپ چاہیں۔'' بڑی فراخدلانہ آفر پر ہم پھولے نہ سمائے اور نویں دسویں کے لیکچر رکھوا لئے اپنے خوشی سے روشن ہوتے چہرے کے ساتھ مسکراتے ہم یہ بالکل بھی نوٹ نہیں کر پائے کہ ہم سے زیادہ خوشی تو سر کے چہرے سے ٹپک رہی تھی، ہمیں تو صرف اسی بات کا تصور چہکا رہا تھا کہ زیبی اور سمری جو وہاں ہماری حالت دیکھ

دیکھ مسکراتی اور ہمیں جلاتی تھیں اب تو ہم ان سے بھی اچھی اور اعلیٰ پوسٹ پر تھے، لیکن یہ کیا؟ چند ہی دنوں میں ہماری چھٹی حس نے کسی گڑبڑ کا الارم دینا شروع کر دیا اس الارم کی وجہ سر انعام کا بے حد التفات اور توجہ لئے ہوئے کیئرنگ رویہ تھا جو کہ صرف اور صرف ہمارے لئے تھا، باقی ٹیچرز کی وہ ہمارے سامنے رکھ کے کھچائی کرتے لیکن ہماری باری آنے پر پگھل پگھل کر موم ہونے لگتے دوران کلاس وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے بہانے بیسیوں بار دن میں ہمیں اپنے آفس بلاتے اور ہم ہر بار جھنجھلا جاتے، کبھی تو وہ ہمارے لیٹ ہونے پر خود ہی اٹھ کر ہماری کلاس میں چلے آتے، ان کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جو نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں چبھنے لگا اور محض تین ہفتوں میں ہی ہماری قوت برداشت جواب دے گئی، پھر پھٹنا تو لازمی تھا ہمارا۔

''سر مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ اتنی سی بات کے لئے آپ نے مجھے کلاس سے بلوا لیا؟ مجھے کلاس میں چین سے ٹکنے اور پڑھانے دیا کریں پلیز اس دوران میرے نام کوئی پیغام نہ بھیجا کریں، جب میں فری ہوں گی خود ہی آ جاؤں گی۔'' بنا لحاظ تھے ہم اپنی جون میں لوٹ آئے تھے جبکہ جواباً سر کے الفاظ نے ہمارے سر پر پہاڑ توڑ ڈالے، آسمان گرا دیا، بجلیاں چمکا دیں بادل گرجا دیئے تند و تیز آندھیاں چلا دیں اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو فلموں میں اس قسم کے سین اور ڈائیلاگز پر ہوتا ہے، سر صاحب ہم سے اظہار محبت فرما رہے تھے اور یہاں ہم تھے کہ کمرے میں موجود کھڑکی جتنا منہ کھولے خود وہاں پر جیسے موجود ہی نہ تھے، آنکھیں پٹپٹا پٹپٹا کر ہم یہ جاننے کی کوشش میں مصروف تھے کہ کہیں ہم کوئی بھیانک سپنا تو نہیں دیکھ رہے جب کافی دیر بعد بھی فرق پتہ نہ چلا تو ہم نے سر سے نظر بچا کر اپنے بے جان ہوتے یخ ہاتھ کے ساتھ دوسرے ہاتھ پر چٹکی کاٹی تب ہمیں اندازہ ہوا کہ جی ہاں ایسی حقیقت ہے اور وہ موصوف جو کہ چار عدد بچوں کے باپ اور زندہ سلامت خوبصورت پڑھی لکھی بیوی کے شوہر ہیں اور اس وقت ہمارے سامنے بیٹھے ہیں وہ کس طرح مختلف مواقع پر کہی گئی ہماری باتیں اور حرکتیں ہمیں بتا بتا کر امپریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی بتا رہے ہیں کہ وہ ہمارے عشق میں کیسے پور پور بلکہ ''گوڈے گوڈے'' ڈوب چکے ہیں اور اب ہمارے بغیر ان کی زندگی ممکن ہی نہیں، جبکہ ہم ہوش میں آنے پر فی الفور اس بندے کے لئے ذہن میں ٹاپ کی بہتر تہتر گالیاں اور ایسے ملامت بھرے الفاظ سوچ رہے تھے جنہیں سن کر اس حضرت کو اپنی غلطی پر گڑھوں کے حساب شرمندگی ہوتی اور وہ معافی مانگ کر اس قصے کو یہیں دفنا دیتا، سوچنے کے بعد ہم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے تصورات کو عملی جامہ پہنایا، لیکن ہمارے سخت ترین الفاظ اور لب و لہجے کو مخالف پارٹی کسی خاطر میں ہی نہیں لائی اور خود ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے وہ محترم کہ ''مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا خدا کے لئے میں مر جاؤں گا'' ان کی ڈرامے بازی سمجھ کر ہم اکڑ کر بولے

''ہمارا صرف ایک ہفتہ ہے یہاں اس کے بعد ہم ہاسٹل واپس چلے جائیں گے اور ہاں جس طرح آپ کر رہے ہیں ناں اس سے ہم ایک ہفتے سے بھی پہلے یعنی آج اور ابھی یہ جاب چھوڑ جائیں گے۔'' ہم نے کڑوے کسیلے لہجے میں جتانے کو چبا چبا کر کہا، تو الٹی آنتیں گلے پڑیں، وہ حضرت جو پچھلے آدھے گھنٹے سے اظہار عشق

فرماتے، ترلے، منتیں اور سماجتیں کر رہے تھے اور واسطے دے دے کر ہمیں جیتنا چاہتے تھے اب کام نہ بنتا دیکھ کر اپنی آئی پر اتر آئے، (وہی آئی جو بڑی ڈاڈھی آئی ہے) وہ بولے۔

”جاؤ گی کیسے میری جان میں نے تم سے کنٹریکٹ سائن کروالیا ہے اب تم اگر ایک سال سے پہلے یہ سکول یا جاب چھوڑتی ہو تو تمہیں پچھتر ہزار روپیہ دینا پڑے گا ورنہ میں کیس کر سکتا ہوں آپ کے خلاف۔“ وہ اور بھی نجانے کیا کیا الا بلا شلا دھمکیاں دے رہا تھا جبکہ ہمارے تو کان ہی شائیں شائیں کرنے لگے کوئی ہمیں بتائے ہم نے کھپ کھپا کر تین ماہ میں پندرہ ہزار بمشکل کمائے تھے اس نگوڑے کو پچھتر ہزار کہاں سے دیتے؟ سوچتے سوچتے دماغ کی رگیں پھول گئیں اچانک جبھی ہمارے ذہن میں جھماکا ہوا کہ ہم نے تو کوئی کانٹریکٹ ہی سائن نہیں کیا بلکہ ہم نے جاب سٹارٹ کرنے سے پہلے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ ہم صرف تین ماہ کے لئے یا شاید دو ماہ کے لئے ٹیچنگ کریں گے یہی بات ہم نے بڑے پرسکون انداز میں ان سے بیان فرمائی تو وہ مسکراتے ہوئے ٹیبل کی دراز سے ایک پیپر نکال لائے، جسے دیکھ کر ہمارے طوطے اڑنا نیچرل تھا، وہ واقعی کانٹریکٹ پیپر تھا جس کے نیچے ہمارے خوبصورت سائن جگمگا رہے تھے، نجانے کب اور کیسے اس فراڈیے نے ہم سے سگنیچر کروائے تھے کہ ہمیں پتہ ہی نہ چل سکا کم از کم اتنی بڑی بیوقوفی کی تو ہرگز توقع نہ تھی ہمیں اپنے آپ سے، ہم تو خود کو بڑی توپ چیز سمجھتے تھے مگر اب......“ ہمارے پسینے چھوٹ رہے تھے اور رسوائی کا ڈر الگ سوار ہا سر پر لیکن وہ موصوف اپنی بتیسی دکھاتے ہوئے کھلی خباثت کا مظاہرہ کر کے گنگنائے ”جنگ میں اور پیار میں سب چلتا ہے یار۔“

”اس کے سوا آپ کو اپنے پاس رکھنے کا اور کوئی چارہ فی الحال نہیں تھا میرے پاس اس لئے سوری لیکن وعدہ کرتا ہوں اس ایک سال کے اندر اندر آپ کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کر لوں گا۔“ وہ کہہ رہا تھا اور ہم اپنے دماغ کے گھوڑے فل سپیڈ میں دوڑاتے ہوئے اگلی پلاننگ میں مصروف تھے، لیکن تھک ہار کر وہ مریل سے گھوڑے گھاس چرتے ہوئے واپس ہمارے پاس لوٹ آئے، اسی دن سکول سے واپسی پر ہم نے زیبی اور سمری کو سارا قصہ من وعن سنایا اور ان سے مدد کی اپیل کی اگلے دن ہم نے سکول سے چھٹی کی اور سمری کے گھر چلے آئے جہاں زیبی اور وہ ہمارے انتظار میں بیٹھی تھیں بلکہ چکرا چکرا کوئی لائحہ عمل سوچنے کی ناکام سعی کر رہی تھیں، چنانچہ وہاں پہنچتے ہی ہم نے بھی ان کے اس نیک کام میں حصہ ڈالا اور لگے پھرکی کی طرح گھومنے، ہم میں سے کسی کے بھی گھر والوں تک یہ بات پہنچتی تو سارا ملبہ ہم پر ہی گرتا اسی لئے خفیہ طریقے سے خود ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا، ہم کتنی بھی بولڈ سہی پر اپنی عزت تو بہرحال بہت پیاری تھی ہمیں، ابھی ہم کسی حل نامی شے کا سرا تک ڈھونڈ نہیں پائے تھے جب سر انعام کا نمبر ہمارے سیل پر چمکنے لگا، ہم نے موبائل آف کیا اور پھر اسے دور پھینکتے ہوئے سارا غصہ سمری اور زیبی پر اتارنے لگے، جنہیں ابھی تک کوئی ترکیب نہیں سوجھی تھی، تقریباً آدھے گھنٹے بعد عاشی اور انیتا بھی ہمارے ساتھ سر کھپائی کے عمل سے گزر رہی تھیں سمری نے انہیں بھی کال کر کے بلا لیا تھا اور سارا قصہ سن کر پہلے انہوں نے مجھے خوب خوب جھاڑا کہ آخر ہم اتنے ڈنگر کیسے ہو گئے کہ ہمیں یہ ہی یاد نہیں کہ ہم نے وہ سگنیچر کب کیوں اور کیسے کیے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا ہم نے تو اپنے ناخن چبا چبا کر اب انگلیوں کے پور بھی چبانے شروع کر دیئے تھے ٹینشن سے، تبھی انیتا نے ہمیں ایک اعلیٰ مشورے سے نوازا اور پھر باقاعدہ پلاننگ کے بعد ہم نے اگلے ہی روز اس پر عمل بھی کر ڈالا، کیونکہ مشورہ بہت بڑھیا تھا پلاننگ کے مطابق ہم نے سر کی محبت کا جواب نارمل انداز یعنی الموسٹ مثبت رویے میں دینا تھا اس لئے سکول دوبارہ جانا ہماری مجبوری بھی تھی اور پلاننگ کا حصہ بھی، سر صاحب تو ہمیں اگلے روز دوبارہ سکول میں حاضر دیکھ کر کھل اٹھے تھے گویا وہ اس قدر خوش ہوئے کہ ہمارا انکار یا اقرار سننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور اس طرح ہم اس مشقت سے بچ گئے جبکہ ادھر زیبی اور سمری سر انعام کی مسز کا نمبر کسی بھی طریقے سے حاصل کرنے کے بعد انہیں گمنام خیر خواہ کی حیثیت سے کال کر کے سر کی کارستانیاں بتا چکی تھیں انہیں یقین آیا تھا یا نہیں لیکن کم از کم شک کا بیج تو پھینک ہی دیا تھا انہوں نے اب بس انتظار کرنا باقی تھا کہ ان کا یہ کارنامہ کس قدر اثر دکھاتا ہے اور کیا رنگ لاتا ہے مگر چار دن گزر گئے یعنی ہمارا دوسرا ماہ بھی ختم ہو گیا اور اب اصولاً ہمیں یہ جاب چھوڑنی تھی لیکن ابھی تک سر کو مسز کی خاموشی اور سر کی آنکھوں کی بولیاں ہمیں یہ جاب جاری رکھنے کا عندیہ دے رہی تھیں آخر چوتھے روز اک تھک کے ہم نے پھر سمری اور زیبی کو ہلا ڈالا اور ننانوے دفعہ پوچھا ہوا سوال ”کہ تم نے ٹھیک طرح بلکہ مرچ مصالحے کے ساتھ ان کی بیگم کو ساری باتیں بتائی تھیں ناں؟ سویں بار پوچھ کر سینکڑے کی گنتی مکمل کی، وہ خود بھی پریشان تھیں کہ جو کچھ انہوں نے سر کی مسز کو بتایا اور سنایا تھا اس کے بعد کسی نہ کسی قسم کا ری ایکشن تو مسٹ تھا مگر نجانے کیوں ہمارا پلان چوپٹ ہو رہا تھا، شاید اللہ تعالیٰ ہمیں سبق سکھانا چاہ رہا تھا اور ہم سیکھ بھی چکے تھے لیکن اب کیا کرنا ہے یہ سیکھنا باقی تھا اگلی صبح سنڈے تھا یعنی آف کا دن اور ہم سکون کا سانس لے رہے تھے مگر سارا سکون اس وقت غارت گیا جب سر انعام کی کال آئی وہ فون پر ہمیں سنڈے کو بھی سکول پہنچنے کا پیغام سنا رہے تھے، ہمارے انکار پر بھڑک کر بولے۔

”تمہیں آنا ہی ہوگا بی کوز ٹیچرز کی میٹنگ ہے اینڈ اٹ از ٹو مچ امپارٹنٹ کوئی ایکسکیوز نہیں چلے گا، اوکے ہم نے ناچار اوکے کہہ تو دیا کیونکہ یہ کانٹریکٹ کی شقوں میں سے ایک شق تھی کہ پرنسپل ٹیچرز کو آف ڈے یعنی سنڈے کو بھی کام کے سلسلے میں بلا سکتا تھا، لیکن اب اس کھیل کا حتمی انجام یعنی آر یا پار سوچ رہے تھے زیبی اور سمری سے پوچھنے پہ پتہ چلا کہ انہیں وہاں نہیں بلایا گیا ادھر ہماری سکستھ سینس نے پھر الارم بجانا شروع کر دیا تھا اس لئے ہم نے انیتا عاشی اور باقی دونوں کارکنوں (زیبی اور سمری) سے ساز باز کر کے انہیں اگلے خطرناک مگر آخری اقدام سے آگاہ کیا جو کہ سراسر ہمارے اپنے ذہن کی اختراع تھی (آہم آہم) ایک اہم بات تو ہم آپ کو بتانا بھول ہی گئے قارئین کہ جس دن ہم نے چھٹی کے بعد دوبارہ سکول میں قدم رنجا فرمائے تھے اسی دن سر انعام نے ”خصوصی انعام“ کے طور پر ہمیں ٹیچر سے بڑھا کر ”وائس پرنسپل“ کے عہدے پر بٹھا دیا تھا اور ہم نے بھی بڑی خوشدلی سے یہ عہدہ قبول کیا تھا اور کیوں نہ کرتے جناب آخر کامیابی کسے اچھی نہیں لگتی اور پروموشن بھی خیر ہم سنڈے کو بالکل سادہ سے حلیے میں سکول پہنچے اور پہنچتے ہی ٹھٹکے کیونکہ ہمارے خیال میں ہم کافی لیٹ تھے تا کہ باقی تمام ٹیچرز پہنچ چکے ہوں مگر

وہاں تو کوئی نہیں تھا سوائے سر انعام کے جو سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے غالباً ہماری ہی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے، ہمارا حلق خشک اور آنکھیں تر ہونے لگیں، پکڑ دھکڑ موبائل نکال کر ہم نے فوراً زیبی اور سمری کو میسج ٹائپ کیا کہ وہ کسی بھی طرح مسز انعام کو لے کر سکول پہنچیں۔” سر ہمیں دیکھ کر آنکھوں میں خمار بھرتے ہوئے بیٹھنے کا کہہ رہے تھے اور ہمارے بیٹھتے ہی وہ ایک بار پھر نان شاپ اپنی بے قراریوں اور بے چینیوں کا اظہار کھلے عام کرنے لگے اسی دوران ہم ان کی آدھی ادھوری باتیں سنتے میسج پر میسج سینڈ کیے جا رہے تھے کہ ہمیں کسی بھی طرح اس بھنور سے نکلنا تھا جس میں ہم اپنی غلطی کی وجہ سے پھنس چکے تھے، تقریباً بیس منٹ بعد ان کا میسج ملا کہ وہ دونوں سر کے گھر پہنچ چکی ہیں، ہم میسج پڑھ کر قدرے ریلیکس ہوئے لیکن عین اسی وقت سر نے ہمارے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔

“ہم آپ سے اپنے دل کی بیتابیاں بیان کر رہے ہیں اور آپ کا دھیان موبائل پر ہے دس از ناٹ فیئر۔” وہ آنکھوں میں مچلتی محبت کے ساتھ شکوہ کر رہے تھے جو ہمیں صرف اور صرف ہوس نظر آ رہی تھی، موبائل ٹیبل پر ایک طرف دھرتے ہوئے وہ ہمارے ساتھ والی چیئر پر آ بیٹھے ہم خوفزدہ تو بہت تھے مگر سوچی سمجھی سکیم کے تحت سر کو باتوں میں الجھانا تھا اس لئے ان کی محبت پر شک ظاہر کرتے ہوئے پروف مانگا تو انہوں نے جھٹکے سے ہمارا ہاتھ تھام لیا ہم اپنی “کراٹے ماسٹری” شروع کرنا چاہتے تھے لیکن اس وقت اور اس دن بڑی شدت سے احساس ہوا کہ ہم بھی ایک لڑکی ہی ہیں اور لڑکیاں کراٹے ماسٹر اور کنگ فو ماسٹر ہو کر بھی کمزور ہی رہتی ہیں۔

“سر بڑے بڑے ڈائیلاگ مار رہے تھے اور ہم جھک مار رہے تھے۔”

“میرا مطلب ہم اس وقت صرف انہیں کسی بھی پیش قدمی اور انتہائی اقدام سے روکنے کی سعی کر رہے تھے، تقریباً مزید پندرہ منٹ گزرنے پر جبکہ سر ہمیں اپنا پاؤں ٹیبل پر رکھنے کا کہہ رہے تھے تاکہ وہ اسے چوم کر اپنی محبت کا ثبوت فراہم کریں ہم نے ایک کونے سے زیبی کو چلاکوسی شکل کے تھوڑے سے حصے کی جھلک دیکھی اور سمجھ گئے کہ وہ لوگ مسز انعام کو لے کر آ دھمکی ہیں، یہ احساس تھا یا کوئی جادو ساری توانائیاں ایک دم انگڑائی لے کر بیدار ہوئیں اور ہم بھیگی بلی سے خونخوار شیر کا روپ دھارنے لگے لیکن ابھی ایک سین اور باقی تھا، ہم نے آنکھ کے اشارے سے مسز انعام کو دیکھنے اور کچھ دکھانے کا کہا تو کھڑکی کی اوٹ سے ان کی صورت بھی جھانکنے لگی ان کا بس چلتا تو وہ لپک کر فوراً اندر آ جاتیں لیکن کسی مصلحت کو وہ بھی رک گئی تھیں۔”

“ٹھیک ہے سر میں آپ کی محبت کا یقین بھی کرتی ہوں اور آپ سے اتنی ہی محبت بھی کروں گی لیکن کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے۔” روایتی سا سوال روایتی سے انداز میں ہم نے دھیمی آواز میں پوچھا مگر سر کی آواز مارے خوشی کے اتنی بلند تو ضرور ہوئی تھی کم از کم کہ مسز انعام باآسانی سن پاتیں۔

“تم سے شادی کرنا میرا سب سے بڑا خواب اور خوش قسمتی ہے میری جان تم کہو تو ایک بار ہم آج ہی نکاح کر لیتے ہیں۔” ان کا جواب مسز انعام نے سنا اور پھر وہی ہوا جو ہم چاہتے تھے، وہ اڑتے ہوئے ان تک پہنچی اور دے دنا دن صلواتیں سنانے لگیں، ہم نے بھی ان صلواتوں میں ان کا خوب ساتھ دیا، زیبی اور سمری کیسے پیچھے رہتیں انہوں نے بھی کسر پوری

کرتے ہوئے ساری بھڑاس نکالی، سر کا سر اس اچانک افتاد اور حملے پر یقیناً چکرایا تھا اس لئے ٹھیک سے صفائی بھی نہ دے پائے اور صورتحال ہماری توقع کے مطابق ہمارے حق میں رہی لیکن یہ کیا تھوڑی دیر انہیں کوسنے کے بعد مسز انعام کی توپوں کا رخ میری طرف ہوا۔

“ضرور اس ڈائن نے بھی بھڑکایا ہو گا تمہارے جذبات کو، آ جاتی ہیں بن سنور کر مردوں کو پھنسانے، میں کہتی ہوں آج کے بعد مجھے یہ لڑکی اور اس کی شکل سکول کے اندر ہرگز نظر نہیں آنی چاہیے، ابھی کے ابھی نکال باہر کرو اس کو، یہ وائس پرنسپل تو کیا ٹیچر بھی نہیں رہے گی یہاں۔” وہ بھڑکیں۔

“مگر میڈم آپ شاید بھول رہی ہیں میرا کانٹریکٹ ہوا ہے سر کے ساتھ میں ایک سال سے پہلے کہیں نہیں جانے والی۔” میں نے جلتی پر مزید تیل پھینکا۔

“بھاڑ میں گیا تمہارا کانٹریکٹ۔” وہ چلائیں۔

“بھاڑ میں نہیں اس دراز میں ہے۔” ہم نے اشارے سے دراز بتایا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے دراز کھول کر وہ پیپر چاک کر گئیں، چرچرچر کی مدہم کی آواز کے ساتھ پیپر پھٹا اور ہم تینوں کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ گئی، ہم نے جو کروانا تھا وہ ہو چکا تھا اب سر جانتے اور ان کی مسز، ہم تو ہاتھ جھاڑتے ہوئے باہر نکل آئے تھے، وہ دن جائے اور آج کے آئے قارئین ہم نے جاب نام کے ایڈوانچر سے ایسی پکی اور سچی توبہ کی کہ دوبارہ نام نہیں لیا کبھی، ہاں باقی ایڈوانچرز کبھی کبھار چلتے رہتے ہیں، وہ تو آپ کو پتہ ہی ہو گا قارئین کہ اس طرح کے پنگے لینا کمزوری ہے ہماری اور عادت بھی اپنی ویز لوٹتے ہیں اب کہانی کے اسی حصے کی طرف جہاں سے چھوڑا تھا۔

☆☆☆

جی تو اس رات ابا جان اور باقی جملہ افراد کے سامنے بولے گئے اپنے بڑے بڑے ڈائیلاگز اور ڈیل کو بھول بھال کر ہم اگلی صبح نو بجے بڑی کاہلی اور سستی کے ساتھ لمبی لمبی جمائیاں لیتے کچن میں پہنچے جہاں پر اپنا فیورٹ ناشتہ دیکھ کر ہماری رال ٹپکنے لگی اور ساری سستی جھٹک کر ہم نے بڑی رغبت سے ناشتہ کیا، گھر کا کوئی فرد اس دوران ہمیں نظر نہیں آیا، شاید وہ سب روزہ رکھنے کے بعد دوبارہ سو چکے تھے کل سے رو رو کر ہماری طبیعت بہت خراب ہو چکی تھی اس لئے آج روزہ چھوڑنا پڑا آخیر انگلیاں چاٹ کر بھرپور مزہ لینے کے بعد ہم نے جھوٹے برتن اٹھائے اور گنگناتے ہوئے مستی کے عالم میں دوبارہ کچن کی طرف بڑھے۔

“او بے بی ڈول میں سونے دی، او بے بی ڈول میں سونے دی۔”

“چل فیر کر وصفائی ہن کونے کونے دی او کونے کونے دی۔” ندیم نجانے کس کونے سے برآمد ہوا تھا ہمارا گانا اچک کر جملہ جوڑا۔

“ایڈی ڈول توں سونے دی اور گا ڈول توں سونے دی۔” ایک اور جملہ، وہ خود تو سڑی مرچ ہے ہی لیکن اس وقت اس کا اس طرح گانا ہمیں بھی ساڑ کے رکھ گیا۔

“کیا ہوا؟ رات والی بڑھکیں بھول گئیں کیا ڈول صاحبہ؟” ہمیں مسلسل گھورتے دیکھ کر ریمائنڈ کروا گیا۔

“ہونہہ تم اپنی بولتی بند ہی رکھو تمہاری طرح بھلکو نہیں ہوں میں سب یاد ہے اور میں اس پر قائم بھی ہوں ہٹو۔” بات پوری کر کے ہم نے ایک ہاتھ بڑی پھرتی سے اس کے آگے یوں گھمایا

جیسے ابھی اٹھا کر پٹخ دوں گی اسے وہ ہٹا اور پھر بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا کیونکہ وہ عین ٹائم پر اماں اور ابا کو اپنی طرف آتا دیکھ چکا تھا، بس پھر کیا تھا قارئین ہم نے ''مانجھا'' اٹھایا اور ٹاپ کلاس سٹوڈنٹ کی جگہ ماسی سکینہ بن گئے، کمرے کے گرد کس کر دوپٹہ باندھے ہم گدھوں کی طرح جتے ہوئے تھے لیکن پھر بھی دل میں ڈھیروں اطمینان تھا کیونکہ اب ہم یہ سب اپنے سسرالیوں یا شادی وادی کی خاطر پریکٹس کے لئے نہیں بلکہ خالصتاً اپنے اماں ابا کی خاطر ان کی خوشی کے لئے کر رہے تھے اور یہی بات ہمیں شانت رکھے ہوئے تھی، آخر ہمیں ان دونوں ہستیوں سے پیار ہی اتنا ہے کہ ان کی خاطر ہم ماسی سکینہ تو کیا کچھ بھی بن جائیں اور شاید ہم ہی نہیں سبھی لڑکیوں کا یہی حال ہے، غصے سے موڑ دو تو وہ ٹوٹ جائیں گی لیکن پیار سے موڑ دو تو کسی بھی طرف مڑ جاتی ہیں، بیٹیوں میں لچک ہی بہت رکھی ہے قدرت نے۔

ہم جب بھی کام سے تھک کر نڈھال ہوتے اماں ابا کے خیال سے اپنی لو بیٹری کو ری چارج کرتے ہوئے پھر سے چارج سنبھال لیتے، تین چار دنوں میں ہی سب کچھ سیٹ ہو گیا تھا یہاں تک کہ ہم بھی، پانچویں روز اماں ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلار سے بولیں۔

''کل تیرے ابا نے مجھے کچھ پیسے دیئے تھے تاکہ تمہیں ایک نیا سیٹ لے دوں آج میرے ساتھ مارکیٹ چلنا میری بچی اور اپنی پسند کا سیٹ خریدنا، ہم تمہاری مرضی اور خوشی سے تمہارے لئے یہ گفٹ خریدنا چاہتے ہیں آخر استعمال بھی تو تم ہی نے کرنا ہے، اسے ہماری طرف سے عید کا گفٹ سمجھ لینا۔'' اف اللہ اماں یہ کیا کہہ رہی تھیں، ہم تو مارے خوشی کے پاگل ہی ہو گئے، ابا کو ابھی کل ہی تو ہم نے اپنا پرانا موبائل سیٹ دکھایا تھا کہ کیسے اس موئے سیٹ کا ایک ایک حصہ بخرا الگ الگ ہونے کو ہے، اماں ابا کتنے مہربان ہیں ناں، ہماری آنکھوں میں آنسو جھلملا اٹھے، فرط جذبات سے اماں کے گلے لگ کر ہم تیار ہو کر ابھی آئے، کہتے اپنے کمرے کی طرف بھاگے نئے مہنگے ٹچ موبائل، نوکیا، کیو موبائل سمارٹ فون سم سنگ ڈیجیٹل اور کتنے ہی موبائلوں کے نقشے ہماری نظروں میں گھوم رہے تھے، ہم تو وہی سیٹ خریدیں گے جس کی مشہوری ''فواد خان'' بڑا اکڑ کر کرتا ہے ہاں، سوچنے کے ساتھ ساتھ زیبی، سمری، عاشی اور انیتا کو باری باری کال کر کے بتانا اور شو مارنا ہم کیسے بھولتے جناب ''دیکھنا جب چھٹیوں سے واپس لوٹوں گی تو تم سب سے زیادہ اچھا، نیا اور مہنگا سیٹ ہو گا میرے پاس۔'' مجھے اچھی طرح یاد ہے سمری سے یہ جملہ کتنی اکڑ کر کہا تھا اور وہاں وہ سب ہم سے امپریس ہونے لگیں ایڈوانس میں ہی فقط آدھے گھنٹے بعد ہم اماں کے ساتھ مارکیٹ کے لئے نکل چکے تھے، اپنی چاروں دوستوں کے مشورے جو انہوں نے ہمیں سیٹ کو جانچنے پرکھنے کے لئے فراہم کیے تھے اور ان کے بتائے ہوئے تمام موبائلوں کے نیم ودنمبرز تک ہم نے بطور خاص نوٹ فرما لئے تھے اور اب سندس جبیں کی کہانی میں جیسے علینہ کے منہ سے اظہار محبت سننے پر شاہ بخت ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا پہنچا تھا ایسے ہی ہاں بالکل ایسے ہی جناب ہم بھی ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے بادلوں میں جا پہنچے، (لیکن چونکہ ابھی اپنی پسند کا سیٹ خریدنا تھا اس لئے جلد ہی بادلوں سے واپس بھی اتر آئے)۔

''چلو آؤ اندر۔'' اماں ایک دوکان میں کھڑی ہمیں اندر آنے کا کہہ رہی تھیں، ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے اماں کے اشارے پر اندر گھس

گئے۔

''بھائی صاحب ہمیں ایک اچھا سا برانڈڈ ڈنر سیٹ دکھا دیں۔'' اماں دوکاندار سے مخاطب تھیں۔

''افوہ ڈنر سیٹ بعد میں لے لینا اماں جان پہلے ہمارا سیٹ تو لے لیں۔'' ہم مچلے۔

''ہائے ہائے تو کیا میں اپنے لئے لے رہی ہوں تمہارے لئے ہی تو ہے۔'' اماں نے گھورا۔

''لیکن اماں ہم تو موبائل سیٹ کا کہہ رہے ہیں اور یہ تو برتنوں کی دوکان ہے موبائل کی مارکیٹ تو دوسری طرف ہے ناں؟'' اماں ہماری بات سمجھ گئی تھیں اس لئے غصہ دبا کر مجھے گھرکنے لگیں۔

''میں نے تم سے ڈنر سیٹ کا ہی کہا تھا موبائل سیٹ کا نہیں الو کی پٹھی۔''

''لیکن اماں آپ نے تو کہا تھا کہ عید کا گفٹ...... نیا سیٹ......؟'' آدھی ادھوری بات اماں کے تیور اور ان کے ماتھے کی چڑھتی تیوری دیکھ کر اور بھی ادھوری ہو گئی تو کیا ڈنر سیٹ عید گفٹ نہیں ہو سکتا۔

''تمہارا باقی سارا سامان مکمل ہو چکا ہے ڈنر سیٹ بھی لے چکے ہیں لیکن یہ اضافی سیٹ تمہیں عید کے گفٹ کے طور پر دینا تھا گدھی۔'' اب دوکاندار کے سامنے بھری پری مارکیٹ میں وہ ہمیں تو پیٹنے سے رہیں ہاں البتہ اپنا ماتھا ضرور پیٹ لیا تھا۔

''کیا ہی اچھا ہو اماں اگر آپ اس ڈنر سیٹ کی بجائے مجھے ایک نیا موبائل سیٹ خرید دیں مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔'' ہم پھر بھی باز نہیں آئے اور کہہ ہی دیا، دوکاندار اور وہاں موجود افراد ہماری بات سن کر خواہ مخواہ ہی دانت دکھانے لگے، اب تو اماں کا پارہ سوا نیزے پر پہنچنا لازمی تھا، ان کے سامنے تو انہوں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا مگر واپسی پر سارے راستے اور پھر گھر پہنچ کر سب کے سامنے ہماری وہ کلاس لگی جو ہم نے آج سے پہلے کبھی اٹینڈ نہ کی تھی۔

ایک تو موبائل نہ ملنے کا قلق اوپر سے اماں جان کو کوسنے اور دوستوں میں بے عزتی کا خیال الگ، بتاؤ ہم سا بے چارہ اور مظلوم بھی کوئی ہو گا بھلا اس دنیا میں؟

☆☆☆

''آئندہ مجھے فون مت کیجئے گا آپ۔'' دانیال کا فون تھا ہمیں اپنا سارا غصہ اتارنے کا نادر موقع ملا تھا ضائع کیسے اور کیوں کرتے؟

''لیکن کیوں ہوا کیا ہے؟'' وہ پریشان ہوا اور یہی تو ہم بھی چاہتے تھے۔

''کچھ نہیں ہوا بس مرضی ہماری اور اب مجھے کال نہ آئے آپ کی کائنڈلی ادر وائز۔''

''ادر وائیز، واٹ...... کیا کرو گی آپ میں کروں گا فون پھر کروں گا بار بار کروں گا۔'' وہ ہمیں طیش دلا رہا تھا اور ہم نے واقعی پھنکارتے ہوئے فون بند کر دیا۔

''کرتے رہو اب۔'' فون دراز میں ڈال کر ہم نے پھر لنگوٹا کس لیا، پندرواں روزہ ہو چکا تھا اور ہم جو لاشعوری طور اور کچھ کچھ شعوری طور پر بھی اپنے سسرالیوں کی طرف سے اپنی پہلی عیدی کے آنے کے منتظر تھے خاصے مایوس ہو چکے تھے ہماری مایوسی ہماری کڑھن میں اس وقت بدلی جب اماں حضور اور فاخرہ نے بیسویں روزے دانیال کی عید لے کر کراچی جانے کا اعلان کیا۔

''ارے ہم پہلے کیوں جائیں؟ وہ لوگ تو ہماری عیدی لائے نہیں آپ کو کیوں اتنی فکر چڑھی ہوئی ہے اور فاخرہ کیوں جائے گی ساتھ؟ آپ اکیلی ہی ٹھیک ہیں ناں اب کیا سارا ٹبر ایک

بندے کی عیدی لے کر جائے گا، میں اکیلی کیسے رہوں گی یہاں؟'' ہزاروں سوال تھے اور ایک واویلا جو ہم نے پورا دن گھر میں مچائے رکھا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے، یہ کوئی ہمارا کالج، کلاس یا فرینڈز گروپ تھوڑی تھیں جہاں ہمیں یا ہماری بات کو کوئی اہمیت دی جاتی، ہم نے فاخرہ کی کتنی منتیں کر چھوڑی تھیں کہ کم از کم وہ تو ہمارا احساس کرلے مگر نہ جی اسے تو کراچی گھومنے اور وہاں کے سمندروں کی ہوائیں کھانے کا شوق چرایا ہوا تھا، ادھر ندیم نے الگ ساتھ جانے کا ڈنکا پیٹنا شروع کیا ہوا تھا کیونکہ اس کی بھی کالج سے چھٹیاں چل رہی تھیں لیکن ہونا وہی تھا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ اماں اور ابا کو منظور ہوتا چنانچہ اکیسویں روزے کو ابا فاخرہ اور اماں کی دو سیٹیں بک کروانے کے بعد انہیں روانہ بھی کر آئے اور گھر پہ ہم دونوں یعنی میں اور ندیم منہ لٹکائے بیٹھے رہ گئے، اب ابا تو صبح سویرے کام پر چلے جاتے تھے اور پیچھے سانپ اور نیولہ ایک ہی بل میں قید لڑ لڑ کر مرنے کے لئے رہ جاتے، ہم دونوں میں سے سانپ کون تھا اور نیولہ کون یہ تو خبر نہیں ہو سکی البتہ ہر لڑائی کے بعد ہم ایک سوال دہرانا اپنا فرض سمجھتے کہ آخر اماں ہم دونوں کو ایک ساتھ یہاں چھوڑ کر جانے والی غلطی کر کیسے گئیں؟ آج چار دن ہو چکے تھے اور ہم گھن چکر بنے اماں اور فاخرہ کے حصے کی ذمہ داریوں کا بھی بھاری بھرکم بوجھ لادے ہوئے تھے، پچھلے دنوں جب ہم نے اکڑ کر ابا سے کہا تھا کہ ہم اکیلے ہی سب کچھ کرلیں گے ان کی مدد نہیں درکار ہمیں اس کے بعد بھی ان دونوں مہربانوں نے گھر کا اور اپنے حصے کا کام نہیں چھوڑا تھا لیکن اب معاملہ ہی اور تھا، رہی سہی کسر ندیم صاحب پوری کر رہے تھے، آپ نے حنا ڈائجسٹ میں اپنی بہت سی پسندیدہ مصنفاؤں کے ساتھ ایک ایک دن گزارا ہے ناں قارئین آج ذرا ہماری ان دنوں کی روٹین بھی ملاحظہ فرمائیں اور سنیں کہ ہم نے ان دنوں صبح سے شام، شام سے رات اور رات سے پھر اگلی صبح کیسے کی؟

''ارے منہ تو مت پھلایئے حضرات مانا کہ ہم کوئی بہت بڑے اور مشہور رائٹر نہیں ہیں ابھی اور شاید آپ کے پسندیدہ بھی نہ ہوں لیکن جناب وقت بدلتے دیر نہیں لگتی، دیکھنا کل کو آپ لوگ اسی مصنفہ سے بات کرنے کو ترسو گے۔'' (زیادہ اوور ری ایکٹ تو نہیں ہو گیا ناں؟) اینی ہاؤ دیکھیں ہمارے اکیسویں روزے سے لے کر ستائیسویں روزے تک کے دن رات کی روٹین، جی تو ہماری صبح کا آغاز رات کے ڈھائی بجے کے الارم سے ہوتا، الارم کی پہلی بیل پر ہی پٹ سے آنکھیں کھول کر ہم فوراً بیڈ سے اتر آتے، منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر نیند کو بھگاتے اور پھر فریج سے رات کو گوندھ کر رکھا جانے والا آٹا نکال کر کچن میں گھس جاتے، جب ہم کچن سے باہر آتے اور سحری تیار ہے کی صدا لگاتے تو بیچارے کچن کی حالت انتہائی قابل رحم ہو رہی ہوتی، اب تین بجے سے تین پچیس تک کا ٹائم ہمارا ندیم کو گھونسے، لاتیں اور چپیڑیں مار مار کر اٹھانے میں گزرنا ہوتا تھا، لیکن وہ یا تو ایسا بدمست ہی سوتا تھا یا پھر ہمیں پٹانے کو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے پڑا رہتا خیر جو بھی تھا اس کی اس حرکت کا بھرپور فائدہ ہمیں یہ تھا کہ اسے مار مار کر اپنے بدلے کی آگ کو خوب ٹھنڈا کرلیا جاتا ابا اور میں اسی دوران سحری کرتے اور ساتھ ہی ساتھ ندیم کو جگانے کے کڑے مرحلے سے بھی گزرتے، روزہ بند ہونے میں پانچ منٹ رہتے تب وہ محترم بند آنکھوں اور کھلے منہ کے ساتھ اپنی کرسی پر آ کر

ڈھے جاتے، گرتے پڑتے دو چار نوالے کھاتے اور پھر اذان ہوتے ہی جہاں بیٹھے تھے وہیں اوندھے ہو جاتے، ابا مسجد کے لئے نکلتے تو ہم بھی نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے، نماز ختم ہونے تک ہماری حالت بھی ندیم سے مختلف نہ ہوتی، اب دوبارہ آنکھ آٹھ بجے ابا جان کے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھانے پر ہی کھلتی اور ان کے ڈیوٹی پر چلے جانے کے بعد ہم پھر سے دروازہ لاک کر کے سونے لیٹ جاتے، نو بجے پھر ٹینشن سے بیدار ہوتے اور خود کو اماں کی طرح کوستے ہوئے ذمہ دار ہونے کی تلقین کرتے (اماں کی غیر موجودگی میں ان کی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ سب کرتے تھے جناب تاکہ ان کے یہاں نہ ہونے سے ہم بگڑ نہ جائیں) اب ہمارا دھیان کچن یا گھر کی طرف نہیں بلکہ اخبار والے کی طرف جاتا کہ آخر وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ اس کا انتظار کرتے کرتے ہم بالآخر جھاڑو پکڑتے اور ابھی بمشکل کمرے تک ہی پہنچتے کہ ''اخبار والا'' دروازہ دھڑ دھڑا کر آواز لگاتا، ندیم کا اٹھنا ناممکن تھا چنانچہ خود ہی اخبار لیتے اور ایک ہاتھ میں اخبار پکڑے دوسرے ہاتھ سے جھاڑو لگانا شروع کرتے، توجہ اور آنکھیں پوری طرح اخبار میں کھبی ہوتیں اس لئے صفائی ہوئی کہ نہیں کوئی شخص فرق نہیں کر پاتا، اخبار مکمل ہو جاتی مگر اس ایک کمرے کی صفائی ابھی تک نامکمل ہی ہوتی، خبروں کی دنیا سے لوٹنے کے بعد ہم ہوش کی دنیا میں قدم رکھتے اور لگتے پھرکیاں گھمانے لیکن اس سے پہلے کہ ہم وہ کمرہ پورا صاف کرتے دودھ والا آن ٹپکتا، دودھ لے کر چولہے پر چڑھاتے ہوئے ہم یہ بات بالکل فراموش کر بیٹھتے کہ پیچھے صفائی ابھی ادھوری ہے اور چند منٹ بعد جب یہ خیال آتا تو ہم بس ابھی آئے سوچ کر تھوڑی سی صفائی نمٹانے کا سوچتے پھر سے کمرے میں چلے آتے اور پھر وہاں ندیم کو خواب خرگوش میں دیکھ کر ہاتھوں کے ساتھ ساتھ ہماری زبان بھی تیز تیز حرکت کرنے لگتی، وہاں بھی گولے بارود کی کوئی قلت نہ تھی چنانچہ برابری پر محاذ چھڑ جاتا، ہم کمرے کو کم اور ایک دوسرے کو زیادہ صاف کرتے تقریباً آدھے گھنٹے بعد کچھ جلنے کی بو پورے گھر میں رقص کرتی تو ہمیں یاد آتا کہ دودھ تو چولہے پر ابلنا دھرا تھا۔

''اف میرے اللہ۔'' کچن سمیت دودھ اور کیتلی کی حالت دیکھ کر ہمیں بھل بھل رونا آتا، ایسے میں ندیم کے جلے جلے پر نمک چھڑکتے ہم اسے اور وہ ہمیں اس سب کا ذمہ دار اور مورد الزام ٹھہراتا اور جنگ ایک بار پھر جاری ہو جاتی، مزید ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ گھر سے باہر ہوتا اور پیچھے ہم اتنے بڑے گھر کی اتنی بری صورتحال دیکھنے اور سدھارنے کو اکیلے رہ جاتے، ایک کمرہ تو صاف کر ہی چکے تھے ہم اب دوسرے یعنی کارپٹ والے کمرے کی باری آتی، بھاری بھرکم قالین تھوڑا سا صاف کرتے کرتے ہی ہمارے بازو شل ہونے لگتے تو ہم وہیں چھوڑ کر خود کچن سمیٹنے چل پڑتے، وہاں چیزیں سنبھالتے اور پٹختے ہوئے ہماری بڑبڑاہٹ مسلسل جاری و ساری رہتی، ایسے میں کسی سہیلی کا فون آ جاتا تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا، احساس تو اس وقت ہوتا جب کوئی زور زور سے دروازہ پیٹتا، دروازہ کھولنے پر کبھی کوئی پڑوسن کچھ مانگتے ہوئے پائی جاتی تو کبھی کوئی مہمان بلکہ بن بلایا مہمان آ دھمکتا، گھر کی بکھری پڑی چیزیں اور چیخ چیخ کر رحم کی اپیل کرتی حالت کو ہم اپنی شرمندگی سے یوں ڈھکتے اصل میں آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری اسی لئے گھر ابھی تک یوں ہی بکھرا پڑا ہے، ایک

انتہائی معقول بہانہ فل معصوم اور مسکین سی شکل کے ساتھ پیش کیا جاتا، اگر کوئی سیدھی سادھی پڑوسن کچھ مانگتی تو ہم بھی سڑتے ہوئے اسے اتنا ہی سیدھا سادھا ٹکڑا توڑ جواب پکڑا دیتے (کیسی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں اماں نے آس پاس کے لوگوں کی، چلے آتے ہیں منہ اور کٹوری ایک ساتھ اٹھا کر کبھی گھی، شکر، نمک تو کبھی سالن، برف اور تھوڑا سارا ادھار لینے) کچھ عورتیں ان میں سے ایسی بھی تھیں جو آتے ہی ”ہائے میری بچی دیکھو کیسے دبلی ہو چکی ہے پڑھ پڑھ کے اتنی سی شکل نکل آئی ہے، ارے تم کچھ کھایا پیا کرو بیٹا کیا صغریٰ (اماں) کچھ دیتیں نہیں تمہیں بنا ونا کے کھانے کے لئے الگ سے؟“ جیسے جملے بولنے لگتیں اور کچھ تو چھوٹتے ہی باقاعدہ ہمارا منہ ماتھا چوم کر بلائیں لیتی کہ ”ماشاءاللہ تم تو بڑی پیاری ہو گئی ہو اللہ نظر نہ لگائے، اب کیا کہیں قارئین ایسی عورتوں کو ہم انکار کر سکتے تھے بھلا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ان کی کٹوریوں میں گنجائش سے زیادہ بھر بھر کر دیتے، بہرحال یہ پڑوسی اور مہمان کل ملا کر ہمارا تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ اور ضائع کروا جاتے، اسی دوران ظہر کی اذان ہوتی اور ہم گھر اور صفائی کو اسی طرح چھوڑ کر سجدہ ریز ہو جاتے، نماز کے بعد صفائی کا بقیہ شروع ہوتا اور بالآخر عصر تک ہم یہ میدان مار ہی لیتے، عصر کی نماز کے بعد ندیم کی آمد ہوتی اور ہم ”کیا پکانا ہے آج“ کی تختی لٹکائے اس کے اردگرد منڈلانے لگتے، پچھلی لڑائی اور ناراضگی لمحوں میں بھول جاتے اور اگر یاد ہوتی تو بھی منہ پھلا کر ہی سہی لیکن پوچھنا تو آخر تھا ہی وہ ہمیں افطاری کا سارا سامان مہیا کرتا جاتا اور ہم افطاری کی تیاری کے لئے تیاری پکڑتے، کچھ سامان بازار سے آتا اور کچھ کچن میں بنتا اس طرح مغرب تک ہماری تیاری میرا مطلب افطاری کمپلیٹ اور فائنل ہوتی، ابا جان آتے تو ہم ایک ساتھ افطاری کر کے فارغ ہو جاتے اس کے بعد وہ لوگ تلاوت کرتے اور ہم شریفوں کی طرح کچن سمیٹ کر صبح کے لئے آٹا گوندھتے اور پچھلی صبح بروقت پہنچ جانے پر بچ رہنے والے ادھ جلے دودھ میں دہی ڈال کر جاگ لگاتے اور پھر خود بھی تلاوت اور نماز وتراویح کا اہتمام کرتے، تب تک ہمارے بدن کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ ”دن بھر کام“ کر کر کے چکنا چور ہو رہا ہوتا اور یوں رات کے دس گیارہ بجے ہم کسی ڈائجسٹ ناول یا بک سمیت بستر پر ڈھیر ہوتے، تو قارئین دیکھا آپ نے اتنی ”بزی اینڈ ٹف“ روٹین میں اگر ہم دانیال پر بھڑک کر اپنا غصہ اور ابھی تک عیدی نہ آنے کی ناراضگی رکھتے ہیں تو حق بجانب ہیں ناں؟

☆☆☆

”اے منڈے نہیں ڈر دے، شور شرابہ کر دے، کدی تو جاندے ڈسکو کدی پی کے دارولڑ دے، کہ مر جانے منڈیاں دے، ادھی رات سپیکر بجھدے کہ مر جانے منڈیاں دے......اویاہ...... اویاہ۔“ ہم پوری پھرتی کے ساتھ جھاڑو گھما گھما کر جھٹ پٹ برآمدہ اور صحن دھونے میں مصروف تھے ساتھ ہی ہمارا پھٹے سپیکر والا ساؤنڈ سسٹم بھی فل والیوم میں بج رہا تھا، (ارے بھئی اپنے زہریلے گلے والا ساؤنڈ سسٹم کہہ رہے ہیں جس سے گھر کے در و دیوار لرز رہے تھے) پرسوں سے اماں اور فاخرہ واپس پہنچ چکی تھیں اور آتے ہی اماں نے اپنی جلی کٹی اور لن ترانیوں سے ہمارے سست ہاتھوں میں جان بھر دی تھی، وہی صفائی جو دن بھر میں نمٹائے نہ نمٹتی بھی اب صبح ہی صبح مکمل ہو رہی تھی۔

پان ویلے نہیں ڈر دے
تے ناپ کے نچیوں پر دے
ٹک ٹک ٹک ٹردے
تے کھڑ کھڑ کھڑ سہدے

گانے کا الٹا سیدھا ستیاناس مارتے ہوئے ہمارے ہاتھوں اور منہ کو ایک ساتھ بریک لگے۔

”یہ کیا؟ ہم دانیال کی محبت میں اتنے باؤلے ہوئے ہیں کیا کہ ”چٹے دن“ میں بھی وہ ہمیں اپنے سامنے کھڑا دکھائی دے رہا تھا؟ ہم نے اپنا سر اور ان کا تصور دونوں کو ایک ساتھ جھٹکا اور پہلے سے بھی زیادہ توانائی کے ساتھ جھاڑو گھمایا تو وہ دانیال کے تصور سے بری طرح ٹکرایا، ہمارا جھاڑو اس تصوراتی دانیال کے چمکدار بوٹوں اور سیاہ پینٹ کو لتھڑ چکا تھا ”ہائے اور ربا“ ہمارے حلق سے چیخ کی صورت الفاظ نکلے۔

”حد ہو گئی ہے بھئی ایسے استقبال کرتے ہیں اتنی دور سے آنے والے مہمانوں کا؟“ وہ بھنوئیں سکوڑے پوچھ رہا تھا اور ہم دیدے پھاڑے دیکھ رہے تھے، کیا وہ سچ مچ دانیال ہی تھا جو آج انتیسویں روزے کو یہاں پہنچ گیا تھا؟ ہم گمان و یقین میں غوطے کھا رہے تھے جب آنٹی، عمارہ اور اقصیٰ کو بھی پیچھے سے ہیلو ہائے کرتے دیکھا، ہم نجانے کب تک یونہی بت بنے کھڑے رہتے کہ اماں نے ایک ہاتھ سے ہمیں پرے دھکیل کر راستہ صاف کیا۔

”ارے کیا ایسے ہی کھڑی دیکھتی رہو گی اندر تو آنے دو انہیں۔“ نظر بچا کر ہمیں گھورا گیا اماں کے دھکے نے ہمیں حقیقت حال میں پٹخا تو ہم انہیں سلام جڑتے کچن میں گھسنے لگے، صفائی کا کام اب فاخرہ کے سپرد تھا اور کچن اماں نے ہمیں سونپا، (چلو اتنا بھروسہ تو ہو ہی چکا تھا ہماری کوکنگ پر انہیں)۔

”ہم آپ کی عیدی لے کر آئے ہیں جناب اور آپ ہیں کہ بات تک نہیں کر رہی سیدھے منہ، میں نے کتنے ہی فون کر ڈالے مگر کبھی اٹھانے کی زحمت ہی نہیں اور اب بھی آتے ہی ایسا شاندار استقبال کرنے کے کچن کارنر میں چھپ کر بیٹھ گئی ہیں۔“ تقریباً بیس منٹ بعد دانیال کچن کے دروازے میں کھڑا بڑی دلیری سے پوچھ رہا تھا میری اماں کو وہ یقیناً اپنی اماں اور بہنوں کے ساتھ گیسٹ روم میں چھوڑ آیا تھا۔

”کچھ زیادہ ہی جلدی خیال نہیں آ گیا آپ کو ہماری ”عیدی“ کا؟“ وار کرنا عادت ہے اپنی کیا کریں اسی لئے، تب بھی بے ساختہ منہ سے ایسا جملہ ہی پھسلا۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ وہ ہونٹ سکوڑے سیٹی بجاتا اندر آ گیا۔

”عیدی تب دی جاتی ہے جناب جب عید ہو اور ہماری عید تو تب ہوتی ناں جب آپ کی دید ہوتی اسی لئے گھر والوں سے ضد لگائے بیٹھا تھا کہ مجھے بھی ساتھ لے کر چلیں گے تو ہی عیدی جائے گی اور بالآخر ہم نے انہیں منا ہی لیا۔“ وہ اپنا کارنامہ بتا رہا تھا، جبکہ ہم اس کے پہلے جملے پر ہی اڑ گئے تھے، چائے کے لوازمات (جو کہ ڈھیروں اشیاء پر مشتمل تھے) ٹرالی میں سیٹ کرتے ہوئے ہم نے بات بدلنے کو پوچھا۔

”تو پھر کہاں ہے ہماری عیدی؟“ انداز فل مصروفیت بھرا تھا۔

دانیال نے جواب دینے کی بجائے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ہم کرنٹ کھا کر رخ اس کی طرف پھیر گئے، آنکھیں فل سائز میں کھل گئی تھیں اور دل دھڑکنے کی جگہ پھڑکنے لگا تھا۔

”تمہیں دیکھ کر میری عید ہوئی ہے تو مجھے

دیکھ کر تمہاری عیدی بھی ہو جانی چاہیے تھی اصولاً لیکن اگر پھر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی تو بندہ حاضر ہے سرکار۔“ وہ سر خم کر کے بولا۔

”بندے کا ہم کیا اچار ڈالیں گے؟“ ہم اپنی کیفیت چھپانے کو ناک چڑھا کر بولے انداز سراسر دل جلانے والا تھا مگر وہ مسکرا دیا۔

”اجی آپ کے ہتھے جو چڑھے ہیں تو اب اچار ڈالیں یا مربع آپ کی مرضی ہے ناں۔“ وہ معصومیت سے بولا تو ہم نے گھور کر کہا۔

”یہ تو بعد میں ہی فائنل ہو گا کہ آپ کا کیا بننا ہے فی الحال تو چائے نوش فرمایئے چل کر۔“ چائے کے دوران ہمیں تمام افراد کے سامنے ہماری عیدی دکھائی گئی جو کہ بے حد شاندار اور ہماری توقعات سے بڑھ کر ہی تھی، چھوٹی سی چھوٹی چیز تک بہت خوبصورتی سے پیک کر کے لائی گئی تھی اور ہمارے استعمال کی اکثر چیزیں اس میں موجود تھیں۔

”چیزیں پسند آئیں۔“ عمارہ چہک کر پوچھ رہی تھی۔

”ہاں بہت ہی اچھی ہے۔“ ہم نے بھی سادگی اور دل سے تعریف کی اور چیزیں اٹھائے اپنے کمرے میں آ گئے (جو کہ اماں کا ہی حکم تھا)۔

”ابھی تک ناراضگی ختم نہیں ہوئی۔“ دوپہر کے کھانے کے بعد موقع پا کر دانیال ایک بار پھر ہمارے سر پر سوار تھا۔

”آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں ناراض ہوں۔“ میں نے جان چھڑانے کو کہا مبادا اماں آ جائیں اور ہماری کوئی ”بچی کھچی“ کلاس ان حضرات کے سامنے ہی شروع کر دی جائے۔

”تم کیا سمجھتی ہو مجھے کچھ خبر نہیں تمہاری؟“ سینے پر ہاتھ باندھے وہ جتا رہا تھا۔

”چلو ابھی میرے ساتھ مارکیٹ چلو میں تمہیں اپنی مرضی کا ایک شاندار سا گفٹ بطور عیدی دینا چاہتا ہوں۔“ ہمارا جواب نہ پا کر اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔

”اف توبہ ہم نہیں جائیں گے کہیں اماں تو ہماری جان نکال دیں گی۔“ بے ساختہ کہہ کر ہم نے زبان دانتوں تلے دبائی (تب جا کر اس ”نگوڑی زبان“ کو چین آیا ورنہ تو نجانے اور بھی کیا کیا راز کھول دیتی)۔

دانیال ہمارے ہٹلر کو گھر میں پہلے ماسی سکینہ اور اب دبو سکینہ کے روپ میں دیکھتے ہوئے کھل کر مسکرایا، تو ہم اور بھی جھینپ گئے۔

”کالج میں ہر وقت تیز تلوار اور کیل کانٹے سے لیس رہنے والے ہٹلر کو گھر میں اس انداز میں دیکھنا یقیناً مزہ دے رہا تھا اسے۔“

”زیادہ دانت دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ہم اماں سے ڈرتے تھے اُن سے تو نہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ سیریس ہوا۔

”ویسے یار کالج میں تمہیں ہٹلر کے روپ میں دیکھا تو دل لٹا بیٹھا اب گھر میں اس حال میں دیکھ رہا ہوں تو جان ہی دے دوں گا شاید تم دونوں طرح ہی قاتل ہو۔“ دل پر ہاتھ رکھے ڈائیلاگ بازی کا دورہ پڑ چکا تھا اسے اور ہم اس کی باتوں پر سرخ ٹماٹر ہو رہے تھے۔

”ویسے ایک لڑکی کو ایسا ہی ہونا چاہیے، گھر سے باہر اجنبیوں کے لئے سخت اور گھر کے اندر اپنوں کے لئے مکھن کی طرح نرم ملائم۔“ بس بس بس ہم نے ہاتھ اٹھا کر فل سٹاپ لگایا ورنہ خوہ تو پتہ نہیں کب تک بولتا۔

”ہم جا رہے ہیں۔“ کہتے ہوئے ہم سر پٹ دوڑنا چاہتے تھے مگر اس نے روک لیا۔

”ایک منٹ یہیں رکو، میں ابھی آیا۔“ وہ پلک جھپکتے غائب ہوا اور پھر اسی سپیڈ سے حاضر بھی۔

”چلو۔“ آرڈر۔

”کہاں؟“ منہ کھلا۔

”مارکیٹ۔“ جواب۔

”پر......“

”ارے بھیا ان کے پر...... ایسے ہی نکلتے رہیں گے، آپ مائنڈ مت کرنا اور اب اس سے پہلے کہ گھر والوں کا ارادہ بدلے اور کوئی ایک آدھ کباب میں ہڈی بننے کو ساتھ ہو لے جلدی چلیں۔“ فاخرہ بھی بیگ تھامے پہنچی، عمارہ اور اقصیٰ تھکاوٹ کے مارے سونے جا چکی تھیں جبکہ دانیال کی ماما جان اور ہماری اماں جان ایک ساتھ کمرے میں گھسی ہوئی تھیں ندیم کمپیوٹر آن کیے جما ہوا تھا اور ابا گھر سے باہر ان دونوں نے اجازت لے کر ہمیں اپنے ساتھ اسی حلیے میں گھسیٹا اور ہم بے بسی سے گھسٹتے گئے، سب سے پہلے تو دانیال نے مارکیٹ سے ہمیں ایک اعلیٰ عمدہ نفیس اور مہنگا سیٹ دلوایا، (ارے بھئی وہ اماں والا ڈنر سیٹ نہیں بلکہ اصلی والا خوبصورت موبائل سیٹ، وہ بھی فواد کی مشہوری والا) اس کے بعد جیولری شاپ پر لے گیا مگر ہم نے مزید کچھ بھی خریدنے سے انکار کر دیا پہلے ہی وہ اتنا مہنگا سیٹ خرید چکا تھا (ویسے بھی جس کی مجھے اشد ضرورت تھی وہ تو مجھے مل چکا تھا اب خواہ مخواہ پیسے ضائع کرنے کا فائدہ؟)

”وہ سیٹ تمہاری خوشی کے لئے تھا اور یہ میری خوشی کے لئے۔“ اس نے نازک سا وائٹ

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیئے

ابن انشاء
اردو کی آخری کتاب .... ☆
خمار گندم .... ☆
دنیا گول ہے .... ☆
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☆
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☆
چلتے ہو تو چین کو چلیے .... ☆
نگری نگری پھرا مسافر .... ☆
خط انشا جی کے .... ☆
بستی کے اک کوچے میں .... ☆
چاند نگر .... ☆
دل وحشی .... ☆
آپ سے کیا پردہ .... ☆

ڈاکٹر مولوی عبدالحق
قواعد اردو .... ☆
انتخاب کلام میر .... ☆

ڈاکٹر سید عبداللہ
طیف نثر .... ☆
طیف غزل .... ☆
طیف اقبال .... ☆

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور
فون نمبرز 7321690-7310797

نگوں والا بریسلٹ خرید کر ہمارے ہاتھ میں پہنایا اچھا بابا سوری کلائی میں پہنایا (اب ٹھیک ہے) پھر واپسی پر وہ ہم دونوں بہنوں کو ایک مشہور آئس پارلر سے آئس کریم کھلاتے ہوئے گھر لے آیا تو ہم نے ذہن میں کلبلاتا سوال بالآخر پوچھ ہی لیا کہ اسے کیسے پتہ چلا آخر ہماری موبائل والی اشد ضرورت کا؟''

''ارے ہم نے بتایا تھا، آپ کے ساتھ بیتنے والا وہ اماں والا سارا واقعہ۔'' جواباً دانیال کی بجائے فاخرہ نے کالر کھڑے کیے تو ہم پھر سے تلملا اٹھے (یعنی ہماری بے عزتی کی کہانیاں وہ اسے سناتی رہتی ہے) اب ہمارا سنی دیول والا گھونسہ پیچھے پیچھے تھا اور فاخرہ کی نازک سی کمر آگے آگے، تو قارئین اس طرح ہماری چھوٹی عید یعنی عیدالفطر تو بہت ہی سہانی اور مزے کی گزری اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں پہلی بار اپنے منگنی شدہ ہونے پر بے تحاشا فخر اور ناز ہوا، لیکن اب تو عید گزرے ڈیڑھ ماہ ہو چکا ہے دانیال اور اس کی فیملی عید کے تیسرے روز ہی واپس چلے گئے ہم اداس تو ہوئے تھے مگر آہستہ آہستہ گھرداری میں بزی ہو کر پھر سے سنبھل گئے، اب تو ایک دو ہفتے میں ہماری چھٹیاں بھی ختم ہونے والی ہیں، پھر وہی کالج ہوگا، وہی ہاسٹل وہی گروپ اور وہی ہم، (ہاں جی ہاں دانیال بھی وہی ہوگا جناب) لیکن اب اماں نے یہ جو نیا آرڈر لگایا ہے ناں، ہمارے اور آپ کے سلسلے کو ختم کرنے کا یہ ہم کسی طور ماننے والے نہیں ہم دانیال سے کہہ کر اماں کو منوا ہی لیں گے، دیکھنا۔

اور قارئین بات سنیں ہمیں آپ سے ایک مشورہ لینا ہے بات یہ ہے کہ چھوٹی عید پر تو دانیال نے ہمیں موبائل گفٹ کیا جو کہ ہماری ضرورت کی چیز تھی لیکن اب بڑی عید پر تو ہمیں قربانی کے لئے ایک عدد بکرے کی ضرورت ہے تو کیا اس عید گفٹ میں ہم ان سے بکرا مانگ لیں؟ ظاہر ہے بھئی گفٹ تو ایسا ہی ہونا چاہیے جو اگلے بندے کے کام آسکے اور اس عید میں بکرے سے زیادہ اور کون سی چیز کام آسکتی ہے بھلا؟ اس لئے ہم نے سوچا ہے کہ دانیال کہیں گے کہ وہ ہمیں کراچی سے ایک عدد خوبصورت کھال والا دم دار اور قربانی کے لائق بکرا گفٹ ریپر میں پیک کرکے بھیج دے بس، جسے ہم پوری محبت توجہ اور پیار کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے چارہ کھلا سکیں پانی پلا سکیں اور اس کی خدمت کرکے ثواب دارین حاصل کرسکیں ہاں البتہ اس کی گندگی صاف کرنے کا کام ندیم کے ذمے ہوگا، آخر نیکیوں میں اس کا بھی تو حصہ ہونا چاہیے ناں، دیکھ لیں اس کے اتنا لڑنے کے باوجود بھی ہمیں اس کو نیک بنانے اور اس کی نیکیوں میں اضافہ کرنے کا کتنا نیک خیال ہے اور ایک وہ ہے کہ سمجھتا ہی نہیں (بچو اس بار اگر یہ کہانی ندیم تک پہنچ گئی تو ہماری خیر نہیں وہ ہمارا سلسلہ تو کیا ہمیں ہی ختم کر ڈالے گا) چلیں اب ہمیں دانیال کو فون کرنا ہے اور بقرعید سے پہلے پہلے کسی طرح یہ روداد بھی آپ تک پہنچانی ہے تاکہ آپ ہمیں اپنے مفید مشوروں سے نواز سکیں کہ اس بار ہم عید پر دانیال سے گفٹ کیا لیں (میرا تو خیال ہے بکرا ہی ٹھیک رہے گا) بہرحال آپ کے مشوروں کو خصوصی اہمیت دی جائے گی اس لئے بتائیے گا ضرور، منتظر رہوں گی، اب اپنی اس دوست نما رائٹر کو اجازت دیں، اللہ نگہبان۔

☆☆☆

انما الاعمال بالنیات

دعا فاطمہ

برسات کا رومانوی موسم جہاں دھوپ چھاؤں کی حسین امتزاج لئے آتا ہے وہیں مذہبی تہواروں کی آمد حبس زدہ چہروں پر مسرت کا روزن وا کر دیتے ہیں، کبھی میٹھی عید اور کبھی نمکین، تہواروں اور مہمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، تہوار کچھ پلوں کے مہمان ہوتے ہیں اور کچھ مہمان صرف تہواروں ے پلوں میں ہی وارد ہوتے ہیں، بہار و خزاں میں کھلتے پھولوں، بند کلیوں اور گرتے پتوں کی مانند ہمارے گرد مختلف تنوع کے لوگ رہتے ہیں جو ہر تہوار کو حسب حال مناتے ہیں، چھپا چھپی کے اس تہواروں کے کھیل میں ہر گھروندے میں گوندھی جذبوں اور محبتوں کی اپنی ہی جاذبیت ہے مگر وائے افسوس کہ اعتدال خال خال ہی دکھائی دیتا ہے، اپنے ساتھ بہت سی برکتوں اور فضیلتوں کو سمیٹ کر مہمان رمضان تو رخصت ہوا مگر ایک اور مہمان آنے کی نوید بھی دے گیا جسے ہم سب نے حسب توفیق عزت، محبت اور تواضع سے نوازنا ہے، آپ ٹھیک سمجھے! ہم بقر عید سے پیوستہ قربانی کے جانوروں کی گھر آمد کا تذکرہ کر رہے ہیں، نہیں بھئی یہ حکایت نہیں ہے بلکہ ہم اور آپ مل کر ایک دو گھروں میں تانکا جھانکی کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں بقر عید کے مہمان خاص یعنی ''بکرا صاحب'' کی تواضع کس جانفشانی سے کی جا رہی ہے۔

لیجئے ہم پہنچے ہیں صادق سٹریٹ، اندرون لاہور کی تنگ و تاریک گلی، اس گلی میں چار گھرانے ہیں اور چاروں کا تعلق متوسط طبقہ سے ہے، گلی میں آیا اور گلی میں کھایا کے مصداق سب اہل محلّہ کی روزی لگی بندھی ہے، سیدھے ہاتھ پہلا گھر ہے نواب سلیم کا، چونکہ نواب ہیں اور خیالوں میں بسر زیادہ ہوتی ہ تو قربانی نہیں کرتے، دوسرا گھر ہے مرزا اکبر مرحوم کا، جن کی زوجہ اکیلی رہتی ہیں، بچے سارے شادی شدہ ہیں اور ملک سے باہر فرنگیوں کی خدمت بجا لا رہے ہیں، سنت پوری کرنا لازمی ہے اس لئے مسز اکبر گائے میں حصہ ڈالتی ہیں اور سارا حصہ مدرسے کی نذر کر دیتی ہیں (واللہ علم بالصواب) بائیں ہاتھ پہلا گھر ہے شبن میاں کا جنہیں کبھی شبیر رسول کہا جاتا تھا، ان کی اور سمیعہ بیگم کی شادی ایسے تھی گویا باجی نے بچہ پالا، سمیعہ بیگم یتیم و مسکین بھانجی تھی گلزار بی بی کی۔

شبیر رسول عرف شبن میاں گلزار بی بی کا اکلوتا چشم و چراغ تھا، گلزار بی بی نے دور کی سوچی، نہ جہیز کا خرچہ ہوا اور نہ بری کی پریشانی، سمیعہ بیگم اور شبیر رسول کا بیاہ کر دیا، ہر چند کہ شبن میاں اپنی بیوی سمیعہ سے آٹھ برس چھوٹے تھے مگر اونچے لمبے قد و کاٹھ کے مالک شبیر میاں اور سرو قد کھلتی رنگت کی مالک سمیعہ کی جوڑی خوب بنی، سمیعہ شروع سے ہی پھپھی کی نقال رہی، انہی کی طرح شبیر رسول کو شبن میاں پکارتی رہی، انہی کی طرح شبن کو کبھی ماں کی کمی نہ محسوس ہونے دی، اللہ نے نفیسہ اور فرقان سے نوازا تو ان کے ساتھ شبن میاں کے لتے لئے جاتے کہ بیوی کا مقام اپنی جگہ اور پھپھی کی وصیت اپنی جگہ۔

☆☆☆

دروازے کے باہر کافی شور آ رہا ہے ویسے تو یہ روزمرہ کا معمول ہے لیکن آج لگتا ہے کہ سمیعہ بیگم کی ''گل افشانیاں'' عروج پر ہیں، دروازہ کھلتے ہی آپ کو وسیع صحن نظر آئے گا جس کے چہار اطراف بالترتیب دائیں سے بائیں آم، جامن، کچنار اور امرود کے درخت ہیں جبکہ درختوں کے درمیان بنی کیاریوں میں پھول دار پودے لگے ہیں، اینٹوں کے اس صحن کے سامنے ہی ایک چھوٹا سا برآمدہ اور دو بیڈ روم دکھائی دے رہے ہیں جبکہ داخلی دروازے کی بائیں طرف کچن ہے، ہمارا ذاتی خیال ہے کہ آوازیں کچن سے آ رہی ہیں، قیاس آرائیوں میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ جا کر موقع واردات کا معائنہ کیا جائے۔

''اے شبن میاں! کیا باؤلے ہو گئے ہو، سات سو روپے کلو بادام اور ستر روپے کلو دودھ صبح سے گھوٹ رہے ہو، کیا کرنا ہے اس بادام ملے دودھ کا؟'' سمیعہ بیگم صبح سے میاں کو کچن میں گھسا دیکھ جھانکے بنا نہ رہ سکیں اور وہاں انہیں ہاون دستے سے بادام پیٹتے اور پھر ان پسے باداموں کو کرچھے کی مدد سے ابلتے دودھ میں ملاتے دیکھ ششدر رہ گئیں۔

''تو اپنا کام کر۔'' شبن میاں نے اپنے ہاتھ بنیان سے صاف کیے، تہمد کو دوسرے ہاتھ سے اڑسا اور بقایا رگڑے باداموں کو بھی ابلتے دودھ کے کڑاہے میں ڈال دیا، اب ان کا رخ زمین پر ایک طرف پڑی گھاس کی طرف تھا، سمیعہ بیگم کا تجسس سوا نیزے پر تھا، قریب پڑا موڑھا انہوں نے آگے بڑھایا اور اس پر بیٹھ گئیں۔

''کوئی چائنیز سوپ بنا رہے ہو کیا؟'' شبن میاں نے بیگم کے اندازے نظر انداز کرتے ہوئے تازہ کٹی ہری گھاس دودھ بادام کے آمیزے میں ڈال دی، سمیعہ بیگم کی تو مانو چیخیں نکل گئیں۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کوئی وظیفہ بتا دیا ہے کسی نے؟ اپنے کھانے پینے کو دودھ بادام نہیں اور یہ چلے ہیں ضائع کرنے، کوئی نئی ترکیب سیکھی ہو کھانے کی تو بندہ تھوڑی بنا لے، سن رہے ہو شبن میاں یا بہرے ہو گئے ہو؟ یہ کیا بلا بنا رہے ہو اور کس نمانے کے لئے؟''

''تمہیں تو وہم ہو گیا ہے کہ میں پیسے ضائع کرتا ہوں، کم عقل عورت، یہ مجرب مقوی غذا میں اپنے راجہ کے لئے بنا رہا ہوں۔'' شبن میاں نے گھوٹنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے انکشاف کیا، کتنے ہی لمحے سمیعہ بیگم بول نہ سکیں اور جب بولیں تو ساری گلی میں ان کی آواز گونجی (کان تو ہمارے بھی لرز اٹھے)۔

''راجہ...... وہ اپنا راجہ، تمہارا مطلب ہے وہ بکرا؟''

''بکرا تو نہ کہو اسے، دیکھو تو کیسا کڑیل جوان ہے۔'' سمیعہ بیگم نے شاک کی کیفیت میں گردن گھما کر صحن کے پار استادہ جامن کے درخت سے بندھے پہاڑی بکرے کو دیکھا جو میاں شبن بیگم کی خواہش اور جمع پونجی کے سہارے لائے تھے، کیا حسین کالا اور سفید امتزاج تھا بکرے کی کھال کا، تراشیدہ سینگ، لمبی سڈول ٹانگیں اور موتیوں جیسے دانت، اب کہ تو سمیعہ بیگم جو چیخی تو دھرتی لرز اٹھی، درختوں پر بیٹھے سب پرندے اس آفت ناگہانی سے وقتی فرار کے لئے اڑ گئے جبکہ ان دونوں کے بچے فرقان اور نفیسہ کچن میں بھاگے چلے آئے اور یک زبان بولے۔

''کیا ہوا امی؟''

''ہونا کیا ہے، یہ تمہارا باپ تمہارے حصہ کے دانے بکرے کے منہ میں ڈال رہا ہے۔''

''وہ انار دانہ...... وہ تو میں نے سکھانے کی خاطر صحن میں رکھا تھا۔'' نفیسہ پر بھول پن ختم تھا۔

''دفع دور بیوقوف اولاد، محاورہ بولا تھا میں نے، تمہیں پتہ ہے کہ تمہارا ابا کیا کر رہا ہے؟''

''جی امی! وہ کھانا پکا رہے ہیں۔'' نفیسہ نے اپنے بوٹے قد کے ساتھ کڑاہے میں جھانکنے

کی ناکام کوشش کی جبکہ شبن میاں ان سب کی موجودگی اور گفتگو سے بے نیاز آمیزے میں چینی ڈال رہے تھے، سمیعہ بیگم گھٹنوں کے درد کی پرواہ کیے بغیر شبن میاں کی طرف لپکی مگر ان کی رفتار شبن میاں سے کہیں کم تھی۔

''اور روکو کوئی اس عاقبت نااندیش آدمی کو۔''

''کس آدمی کو روکیں امی، یہاں تو ابا کے علاوہ کوئی آدمی نہیں۔''

''اپنے ابے کو روکو بے عقلوں۔''

''کیوں اماں؟ کھانا پکا رہے ہیں تو پکانے دیں۔'' فرقان کو اپنے مشورے پر دو ہنٹر انعام کے طور پر ملے۔

''دونوں چپ کر کے میری بات سنو، یہ تمہارا ابا گھاس، بادام اور دودھ کا شیرہ پتہ ہے کس کے لئے ابال رہا ہے؟''

''میرے لئے ہی ہوگا امی، ابا کل کہہ رہے تھے کہ گھاس کھانے سے نظر تیز ہوتی ہے۔'' فرقان نے جواب تو دیا مگر سمیعہ بیگم کی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''آپ ہی بتائیں امی۔''

''راجہ کے لئے۔'' سمیعہ بیگم کی آواز گویا صور تھی دونوں بچوں کے لئے، نفیسہ بھی کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''میں نے ابا سے عید کے کپڑوں کے لئے پیسے مانگے تو بولے کہ کام نہیں لگ رہا۔'' شبن میاں قریب پڑی پیڑھی پر بیٹھ گئے، اپنے ناک پر ٹکی عینک سیدھی کی اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری مرحوم دادی کہا کرتی تھیں کہ قربانی کے جانور کو اچھا کھلانا ثواب کا کام ہے۔''

''چاہے ہم بھوکوں مریں۔''

''تم سے ہزار درجہ یہ بکرا اچھا ہے۔''

''کیوں ابا جی، یہ کیا کرتا ہے جو امی نہیں کر سکتیں۔'' نفیسہ حیرت سے شبن کی طرف دیکھنے لگیں، سمیعہ بیگم نے اس نامعقول باپ بچوں کے کوئز پر سر تھام لیا کہ ان کی ذات رگیدی جارہی تھی۔

''نفیسہ! یہ بول نہیں سکتا۔'' فرقان نے رائے زنی کی۔

''ارے بھئی، صبح سے اب تک تم نے سوائے اس کی مسکراتی ہنسی کے کوئی اور آواز سنی ہے، نہیں ناں اور تمہاری ماں کی آواز کانوں کو چیرتی ہوئی گلی پار جارہی ہے، (ویسے اس بات سے تو ہم بھی اتفاق کرتے ہیں)۔'' شبن میاں کی خوبصورت مثال پر سمیعہ بیگم اور بچوں کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''یہ ہوتی ہے شرافت و نجابت کی نشانی۔''

''اور وہ تم نے اسے ٹانگوں کے نیچے کیا باندھ رکھا ہے؟''

''پیمپر پہنایا ہے بیگم، بڑے سائز کا مل نہیں رہا تھا تو دو پیمپر جوڑ لئے۔'' شبن میاں نے پیڈسٹل فین کا رخ اپنی جانب کرتے ہوئے رسان سے کہا۔

''شبن میاں! تم کیا کہوں، کون سا لمحہ تھا جب میں نے تمہیں اپنی بیبیاں دی تھیں، اپنی جمع پونجی کہ جاؤ بکرا لے آؤ، اللہ کا حکم بھی ہے اور محلے میں عزت کا معاملہ بھی مگر تم...... تم تو اسے اولاد کا درجہ دینے لگے، خدا ہی پوچھے تم سے، نفیسہ! جا دال میں پانی ڈال کر روٹیاں پکا لے، یہی ہماری قسمت ہے کہ بکروں کو دودھ بادام اور گھر والے فاقے و آلام۔'' سمیعہ بیگم نے ہار مانتے ہوئے کچن سے باہر کا رخ کیا مگر ترحم آمیز نظروں سے بکرے کو دیکھنا نہ بھولیں جو شبن میاں کی غذائی محبتوں کی بھینٹ چڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

فی الوقت اس گھرانے کا اتنا ہی تعارف کافی ہے، چلئے ذرا سمیعہ بیگم کے ساتھ والے ہمسائے کی طرف چلتے ہیں، جی جی یہی گولڈن روغن والا لکڑی کا بوسیدہ دروازہ جو چی کی آواز کے ساتھ کھلتا ہے۔

آیئے آیئے خود ہی اندر آیئے کیونکہ یہاں کوئی مہمان کو خوش آمدید نہیں کہتا، خیر ہم تو ہیں ہی بن بلائے مہمان، دروازہ کھلتے ہی ایک تنگ راہداری نظر آتی ہے جس کے دونوں اطراف ایک ایک کمرہ ہے، راہداری کے پار چھوٹا صحن ہے جس کے ایک کونے میں واشنگ مشین اور دوسرے کونے میں باتھ روم اور کچن ساتھ ساتھ بنائے گئے ہیں، (اس طرز تعمیر کی وجہ موجودہ مکینوں کو بھی نہیں معلوم)، صحن کے عین درمیان سے ایک برساتی نالہ آ رہا ہے جس کے ساتھ نہایت لاغر و کمزور بکرا بندھا ہے، یہ گھر ہے ''غریب نواز'' کا، غریب نواز کی بدقسمتی کہ اس کے والدین غریب تھے، شادی ہوئی فضیلہ خانم سے جو ایک موچی کی پانچویں صاحبزادی تھیں، یہ الگ بات کہ شادی کے بعد غریب نواز نے ہی سسر کا بزنس آگے بڑھایا اور شو شاپ میں بدل دیا، روپیہ پیسہ کافی آیا، مگر صرف جمع کرنے کے لئے، رہے غریب کے غریب، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا۔

ساس صاحبہ یعنی شکورن بوا، حیات تھیں اور حد درجہ بخیل بھی اور خاصی خوش تھیں کہ ان کے قول کے عین مطابق ان کی بہو فضیلہ اور بیٹا غریب نواز ہر طرح کا سرفہ کرتے تھے، آلو بینگن، دال، کھیرے کا رائتہ، ساتھ میں الٹے توے کی روٹی، ان غریبوں کی خوراک تھی نہ جانے کیسے شکورن کو قربانی کرنے کا حکم خداوندی یاد آیا، شومئی قسمت کہ غریب نواز کم پیسوں میں قدرے صحت مند بکرا لانے میں کامیاب رہے، مگر حیرت تو یہ ہے کہ وہ اس قدر لاغر ہو چکا تھا کہ آواز کی جگہ سیٹی کی آواز گونجتی تھی اور جسم تو ایکس رے کی عملی تفسیر نظر آتا تھا، وجہ صاف تھی جو خود پر خرچ نہیں کر سکتا، اس نے جانور کو کیا کھلانے پر خرچہ کرنا ہے، شیخ کریانے والے کی دکان سے سستی کیڑے والی چنے کی دال، دس روپے کا گیلا چارہ بکرے کی دو وقت کی خوراک تھی، پانی پلانے کا البتہ سارا گھر شوقین تھا، بکرے کا نام رکھا گیا ''بہادر'' جسے سن کر بکرے کی آنکھیں اکثر نم ہو جاتی تھیں۔

''فضیلہ! بکرے کو پانی پلا، اتنی گرمی پڑ رہی ہے، پیاس لگ رہی ہوگی بیچارے کو، مانو خدا کو جواب دینا ہے۔'' شکورن بوا نے کھیرے کے رائتے میں مزید پانی شامل کیا۔

''پلا دیا بوا، سلیمہ! یہ تو چنے کی دال مٹھی میں لئے کدھر جارہی ہے۔'' فضیلہ کی نظروں سے بیٹی کے ہاتھ میں چھپی دال نہ چھپ سکی، جو وہ کچن سے نکلتے ہوئے تھامے ہوئی تھی۔

''وہ اماں میں بکرے کو کھلانے۔''

''مردودوں! تم لوگوں کے کھانے کو دال نہیں اور تم بکرے کو کھلا رہی ہو، سمجھایا تھا ناں تیرے ابا نے کہ ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن دال دینی ہے تا کہ اس کا پیٹ خراب نہ ہو۔''

''اماں! وہ مر جائے گا۔'' چھوٹے بیٹے فہد نے ہوم ورک کرتے ہوئے سر اٹھا کر لاڈ سے کہا۔

''نہیں مرتا بیٹا، یہ جانور سخت جان ہوتے ہیں، انہیں بھوکا رہنے کی عادت ہوتی ہے، پھر بندہ تب دے جانوروں کو جب خود کے پاس ہو۔''

"اماں! کل تو ابا نے آپ کو نیلے نوٹوں کا بنڈل دیا تھا جو آپ نے الماری میں رکھا تھا۔" فہد کی بات سن کر فضیلہ بھڑک اٹھی۔

"چل دفع ہو ادھر سے، جاسوسی کرتا ہے ماں باپ کی، تم جیسی اولاد ہی گھروں میں چوریاں کرواتی ہے۔"

"اماں! اللہ کو بخیلی پسند نہیں، وہ ہمیں اتنا کچھ عطا کرتا ہے تو جس غریب جانور کو اس کے نام پر قربان کرنا ہے کیا ہم اچھا کھانے کو نہیں دے سکتے۔" سلیمہ کہے بنا نہ رہ سکی کیونکہ والدین کی کنجوسی سے وہ صدا خائف رہی۔

"تف ایسی اولاد پہ، تم لوگوں کے لئے ہی جوڑتے ہیں۔"

"جھوٹ نہ بولو اماں! نیلم باجی کے بیاہ پر آپ نے باراتیوں کو کھانا تک نہ پوچھا، ان کی ساس نے ہم سے ملنے پر پابندی لگا دی، ہم آج تک اپنا بھانجا نہ دیکھ سکے مگر آپ نے کنجوسی نہ چھوڑی۔"

"تم کیا جانو کہ ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے، ہم نے تو پہلے ہی نیلم کے سسرال والوں کو کہہ دیا تھا کہ محض دودھ اور مٹھائی ملے گی، وہ اگر مذاق سمجھے تو ہمارا کیا قصور، ولیمہ سنت نبویؐ ہے۔ انہوں نے تو ہمیں بلایا ہی نہیں۔"

"یہی تو المیہ ہے ہمارا کہ جہاں چاہا دنیا رکھ لی اور جب چاہا دین کا سہارا لے لیا۔"

"والدین سے زبان درازی اور کفایت شعاری کی مخالفت کون سے دین و دنیا کے قانون میں لکھی ہے لڑکی۔" بوا جی بھی میدان میں اتر آئیں۔

"دفع ہو ادھر سے نافرمان اولاد، ایک بکرے کے لئے ماں اور دادی کے منہ لگ رہی ہے، تم کیا جانو کہ پیسہ ہی تو بڑھاپے کا سہارا ہے۔" فضیلہ نے آگے بڑھ کر شکورن بوا کو گلے لگایا جو مصنوعی آنسو بہا رہی تھیں۔

"مگر اماں! ہم نے بڑھاپے کی منزل تک پہنچنا بھی ہے یا نہیں، کھانا تو ملا نہیں بہادر کو اور میری جنت بھی مجھ سے ناراض ہو گئی۔" سلیمہ دل ہی دل میں ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی اور باہر چل دی۔

☆☆☆

ضروری تو نہیں کہ بڑے ہمیشہ صحیح ہوں، اچھی بات تو دشمن ہی کیوں نہ کہے، غور سے سنو، مگر ہم رہے صدا کے جذباتی جنہیں لگتا ہے کہ نئی نسل خاصی منہ زور ہے اور پرانی نسل یعنی ہمارے بزرگ دقیانوسی، بات اعتدال کی ہوتی ہے خواہ وہ رویوں میں ہو یا سوچ میں، کچھ جذباتی ہو گئے ناں ہم، منہ کا ذائقہ بدلتے ہیں اور شبن میاں کے گھر چلتے ہیں جہاں راجہ میاں کے لئے بوفے تیار ہو رہا ہے، منظر نامہ تھوڑا تبدیل ہے کیونکہ آج موسم ابر آلود ہے اور صحن میں باد صبا اپنی خوشبو بکھیر رہی ہے۔

شبن میاں اسی صحن کے وسط میں چارپائی پر چوکڑا مارے بیٹھے تھے، سیدھے طرف بڑا باؤل رکھا ہے جس میں باریک کٹا چارہ رکھا تھا، سمیعہ بیگم نے آواز سن کر فوراً صحن کا رخ کیا، آواز تو کچھ خاص نہ تھی مگر چونکہ شبن میاں کی تھی سو ہوشیار ہونا لازمی تھا۔

"نفیسہ! فریج میں سے چار انڈے تو لا۔" شبن میاں نے بیڈ روم کی کھڑکی سے نظر آتی نفیسہ کو مخاطب کیا جو کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس اثناء میں سمیعہ بیگم شبن میاں تک پہنچ چکی تھیں، انہوں نے اپنی تیکھی ناک سکیڑی اور بازو لڑاکا عورتوں کی طرح کمر کے گرد رکھ گئے اور سوالیہ نظروں سے شبن کو دیکھنے لگیں۔

"کس قدر حبس کا موسم ہے سمیعہ بیگم۔" شبن میاں نے ان سے نظریں چراتے ہوئے ایک نظر گدلے آسمان پر ڈالی جہاں بکھرے ہوئے بادلوں میں سے چھن چھن کر تیز سورج کی روشنی زمین پر بکھیر رہی تھی جبکہ تھوڑی دیر قبل چلنے والی نرم ہوا مفقود تھی۔

"تو۔"

"آج کل پیٹ کی بیماریاں بہت عام ہیں اور کچے انڈے ان بیماریوں کے لئے اکسیر کا کام کرتے ہیں، بس میں راجہ کے لئے کچے انڈے کھلانے کا پروگرام فکس کر رہا ہوں، چارے میں مکس کر کے کھلاؤں گا تو اسے پتہ بھی نہیں چلے گا، ہے ناں عقل کی بات۔" شبن میاں نے چارے کو مزید باریک کرتے ہوئے داد طلب نظروں سے سمیعہ بیگم کو دیکھا جن کی آنکھیں وحشت نما انداز میں خاصی پھیلی ہوئی تھیں۔

"اے بیگم! کیا گزر گئی ہو کھڑے کھڑے۔"

"ارے گزریں میرے دشمن، وہ راجہ بے وقوف ہے ناں، انڈہ ملا چارہ کھائے گا اور کہے گا، بھا...... بھا...... شکریہ شبن میاں جی...... اور تم بہت عقلمند کہ ایک سبزی خور جانور کو انڈہ کھلانے کی کوشش کر رہے ہو میاں صاحب! نہ تو اس کا پیٹ انسانی ہے اور نہ وہ انسانی بچہ جسے بطور پہلی غذا انڈہ پیش کر رہے ہو۔" سمیعہ بیگم نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھیں، نفیسہ اپنے دونوں ہاتھوں میں انڈے لائی اور چارے والے باؤل کے پاس رکھ دیئے، وہ چار قدم دور ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی کہ ماں بابا کی اس چلم چلی میں اسے دو ہتڑ عقلمندی کے انعام کے طور پر ضرور ملتا تھا۔

"او میاں! تمہیں اللہ کا واسطہ، اس بکرے کو عید تک سلامت رہنے دو، کیوں اس کو وداع کرنے پر مجبور کرتے ہو کہ آ جا بھائی قصائی، شبن میاں سے بچا لے۔" سمیعہ بیگم نے کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ ہاتھ جوڑ دیئے مگر شبن میاں سدا سے من مانی کرنے کی عادی تھے، انہوں نے انڈوں کو دھڑا دھڑ توڑ کر چارے میں ملایا۔

"اے اللہ! ایسا ضدی اور ہٹ دھرم مرد بھی کسی کو نہ ملے او پھپھی! کدھر پھنسا گئی مجھے اپنے تحفہ کے ساتھ۔" سمیعہ بیگم وہیں چارپائی کے کنارے ٹک گئیں، یہ تجسس تو انہیں بھی تھا کہ بکرے کو انڈہ کیسے کھلایا جائے گا، شبن میاں نے چارے اور انڈوں کو اچھی طرح گھوٹا اور پھر جیب میں سے سبز اور سرخ رنگ کے بڑے سائز کے کیپسول بھرا شاپر نکالا۔

"یہ بھی اس میں ڈالو گے؟" شبن میاں نے ایک نظر غلط بیگم پر یوں ڈالی، جیسے کوئی استاد اپنے نالائق شاگرد کو دیکھتا ہے۔

"بجو!" شبن میاں نے ابھی کہنے کی کوشش کی ہی تھی کہ سمیعہ بیگم کا پارہ ہائی ہو گیا۔

"تیرہ بیڑہ ترے شبن، شادی سے لے کر آج تک تیرے اس لفظ بجو کے کنارے پر ہزاروں روپے لٹا چکی ہوں، کون سمجھائے تجھے کہ نکاح فاتخ ہو جاتا ہ، آج پھر راجہ کے آملیٹ کے چکر میں کفارہ دینا پڑے گا، خود تو پھپھی اوپر چلی گئیں اور میرے جوگا یہ کاکا چھوڑ گئیں۔" سمیعہ بیگم کے لفظ "کاکا" پر شبن میاں کا اچھلنا جائز تھا۔

"کاکا کون کاکا؟"

"تم اور کون، کہتے ہیں جو نام بچپن کی چھیڑ ہوتا ہے، بندہ ویسا ہی بنتا ہے، اب خود کو دیکھ، جسم بڑا سا ہو گیا مگر دماغ سے تم رہے بچے کے بچے۔" گن گن کر بدلے چکانے کی باری اب سمیعہ بیگم کی تھی مگر دوسری طرف تھے شبن میاں انہوں نے بیگم کی باتیں ہوا میں اڑائیں اور

کیپسول کھول کر اس میں تھوڑا تھوڑا آمیزہ بھرنے لگے، فیضان بھی یہ جنگ وجدل دیکھ میدان میں پہنچ چکا تھا۔

’’ابا! بکرہ بیمار ہے کیا؟‘‘

’’نٹے منہ تم لوگوں کو، ایک طرف تیرا ابا پیسے اجاڑ رہا ہے اور دوسری طرف تو بد فال نکالنے آگئی ہے۔‘‘

’’یہ کیپسول راجہ بیٹا کھائے گا اور طاقتور بن جائے گا۔‘‘ شبن میاں اپنی ہی رو میں بول رہے تھے، یہ علیحدہ بات کی ان کی لنگی پر لگے انڈے کے داغ خاصے بدنما لگ رہے تھے۔

’’ہاں! پھر چڑیا گھر والے آئیں گے اور تیرے ابے کو اٹھا کر لے جائیں گے۔‘‘

’’تم تو جلتی رہنا میری عقل سے۔‘‘

’’کسکی عقل سے ابا۔‘‘ فیضان حیران ہوا، شبن میاں نے مدحیہ سرائی کی۔

’’اولاد سمعیہ بیگم عقل سے تو تم پر ہی گئی ہے۔‘‘

’’وہ تو دکھائی دیتا ہے کہ کس پر گئی ہے، خیر وہ تمہاری دکان کا کیا بنا یہ راجہ کو ہی بٹھا دو اپنی جگہ۔‘‘

’’دکھڑا ہی بولنا تم بھی سجاد سنبھال رہا ہے دکان، فائنل ڈیل تو میں ہی کروں گا، دو مکان ہیں، گاہک اچھے مل جائیں تو سمجھو چھ مہینے کا آرام۔‘‘

’’نہ میاں نہ، یہ جو راجہ پر لگا رہے ہو، سمجھو کہ دو ماہ ہی خرچہ چلے گا، خیر تم گھر کا صفایا کرتے رہو، میں کپڑے دھولوں۔‘‘ سمعیہ بیگم نے میاں پر باتیں بے اثر ہوتا دیکھیں تو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

دیکھا آپ لوگوں نے، شبن میاں کے گھر کے آج بھی وہی حالات تھے، بس ڈش بدل گئی تھی، چلتے ہیں ذرا کفایت شعار بوا شکورن کی طرف کہ آج بکرے کے لئے کیا مینیو ہے۔

’’فضیلہ! یہ کھیرے کے چھلکے بکرے کو ڈال آ۔‘‘ شکورن بوا نے کھیرے کے چھلکے تسلے میں ڈالے جن سے وہ چہرے پر لگا کر ٹھنڈک لینے کا کام بخوبی کر چکی تھیں، قریب بیٹھی فضیلہ اپنی پرانی ساٹن کی قمیض نکال کر اس کی تراش خراش کرنے میں مصروف تھی کہ سلیمہ کو عید پر ’’نیا سوٹ‘‘ بھی تو دینا تھا۔

’’اچھا بوا، میں سلیمہ کو کہے دیتی ہوں۔‘‘ فضیلہ نے سلیمہ کو آواز دی جو چھت پر پڑھ رہی تھی، سارا دن صرف بوا کے کمرے میں پنکھا چلتا تھا اور دوسرے بیڈروم میں رات بارہ بجے کے بعد، سلیمہ فوراً سیڑھیاں اتر کر کمرے میں آگئی اور کھیرے کے چھلکے لیتے ہوئے ہچکچانے لگی۔

’’دادی! بکرا تو چھلکے نہیں کھائے گا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’میرا مطلب ہے کہ کل کے چھلکے ہیں، اس کا پیٹ نہ مسئلہ کر جائے۔‘‘

’’تو کیا بکرے کی مامی ہے جو تجھے اس کے مسائل سے غرض ہے، دادی جو کہہ رہی ہیں، چپ چاپ کر، نافرمان اولاد۔‘‘ فضیلہ کل کی بات پر سلیمہ سے کافی ناراض تھی جبکہ سلیمہ بھی دکھی تھی کہ ماں کے ساتھ اسے بحث نہیں کرنی چاہیے تھی، سلیمہ نے تسلہ اٹھایا اور جا کر بکرے کے آگے چھلکے ڈال دیئے، بکرے کو دیکھ کر سلیمہ کو شدید دکھ نے آن گھیرا، پہلے تو سلیمہ کے دل میں آیا کہ چپ چاپ اندر پڑا چارہ بہادر کے آگے ڈال دے مگر پھر ماں کی حکم عدولی کا سوچ کر رک گئی، بکرا اس قدر مرجھایا ہوا تھا کہ اس کے سینے کی ہڈیاں بخوبی گنی جا سکتی تھیں مگر نہ جانے کیوں اس گھر کے بڑوں کو یہ سب کیوں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

’’سوری بہادر! تمہاری بدقسمتی کہ تم ہمارے گھر آئے۔‘‘ اندر بوا اور فضیلہ سر جوڑے اہم موضوع چھیڑے بیٹھی تھیں۔

’’بہو! گوشت صرف اس محلہ دار کو بھجوانا جو ہمیں بھجوائے۔‘‘

’’اور سامنے والا شبن۔‘‘

’’پہاڑ جیسا بکرا ہے اس کے پاس، کوئی ضرورت نہیں اس کے ہاں گوشت بھجوانے کی، وہ بھیجے تو رکھ لینا۔‘‘

’’بوا جی! وہ نیلم سے ملنے کو میرا بھی بہت دل کرتا ہے۔‘‘ فضیلہ کہے بنا نہ رہ سکی، سلیمہ کی باتوں نے ان کے سوئے ہوئے زخم جگا دیئے تھے، بوا شکورن نے دل میں ہزار صلواتیں سلیمہ کو سنائیں مگر اپنا لہجہ حسب حال کیا۔

’’میں تیری دشمن نہیں ہوں بیٹی مگر گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں اب جا کر ملو گی تو گوشت میں سے بڑا حصہ انہیں دینا پڑے گا، پھر نقد، کپڑے وغیرہ بطور عیدی، اس کی ساس تو یہی کہے گی کہ آگئے ناک رگڑنے تو جو چاہے مطالبہ کر دو۔‘‘

’’ٹھیک کہتی ہیں آپ بوا، کون کرے اتنا خرچہ، سمجھیں گے کہ دوسرے ملک بیاہا ہے بیٹی کو، بارہ گھنٹے گزر گئے، میں ذرا بہادر کو چارہ ڈال آؤں۔‘‘

’’گیلا چارہ ڈالنا، پانی بھی چلا جائے گا اندر، ان جانوروں کو پیاس بہت لگتی ہے۔‘‘ فضیلہ اچھا کہتے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

راجہ اور بہادر گھر سے باہر کھڑے ہیں، نہیں بھئی انہیں سیر و تفریح کے غرض سے باہر نہیں نکالا گیا بلکہ گھر کے رنگ و روغن اور صفائیاں کی وجہ سے شبن میاں اپنے راجہ کو اور غریب نواز اپنے بہادر کو اپنی اپنی کھٹولیوں سے باندھ رہے ہیں جو انہوں نے گلی میں بچھا رکھی ہیں، غریب نواز کو اپنے غریب ہونے کا احساس شدت سے ہو رہا ہے، کیونکہ راجہ کے قریب کھڑا بہادر ہاتھی کے سونڈ پر چڑھی چیونٹی لگ رہا تھا، اب ملاقات ہوئی تھی دونوں کی تو باتیں تو ہونا ہی تھیں، جی نہیں، ہم غریب نواز اور شبن میاں کی باتوں کا تذکرہ نہیں کر رہے ان دونوں کے درمیان تو کبھی نہیں بنی، اسی لئے دونوں کے رخ عملاً شرقاً اور غرباً ہیں، ہم تو راجہ اور بہادر کی آپسی گفتگو کا ذکر کر رہے ہیں، ذرا کان لگا کر سننی پڑیں گی، ان کی کہانی، انہی کی زبانی۔

’’یار راجہ! تیرے مالک نے تیرا نام تو خوب چن کر رکھا ہے۔‘‘ بہادر نے راجہ کی کسرتی رانوں اور سڈول پیروں کی طرف اشارہ کیا۔

’’دانت بھی تیرے کافی چمکدار ہیں اور سینگوں کی شان بھی نرالی ہے مگر تو نے یہ پیٹ کے نیچے کیا باندھ رکھا ہے۔‘‘

’’بھائی بہادر! نہ پوچھو، کیا گزر رہی ہے مجھ پر، یہ میاں شبن مجھے ایک انسانی بچہ سمجھ رہے ہیں، یہ جو زیر جامہ میں نے پہن رکھا ہے، اسے پیمپر کہتے ہیں تاکہ حوائج ضروریہ کا گند نہ پھیلاؤں۔‘‘

’’ہاہاہا...... تو یار پھر یہ بکرا کیوں لائے، ٹیپ ریکارڈ سے ہی کام چلا لیتے جو بھا بھا کرتا رہتا۔‘‘ بہادر ہنسا مگر سننے والوں کو یوں محسوس ہوا گویا کھانسا ہے، جان کہاں تھی بیچارے میں۔

’’کھانے کی نئی نئی تراکیب ٹیپ ریکارڈ پر تو آزما نہیں سکتا شبن۔‘‘

’’کھانے کی ترکیبیں؟ کیا چارہ، دال اور گھاس کو بھی پکایا جاتا ہے؟‘‘ بہادر کی بات سن کر

راجہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

’’کیا بتاؤں؟ کبھی گھاس کی باداموں کھیر، کبھی انڈہ کیپسول، کبھی یخنی میں پکا چارہ اور کبھی مکس سبزی ونڈ مجھے کھلایا جاتا ہے، تو سوچ کہ نمک مرچ کھاتے کھاتے میری زبان زخمی ہو گئی ہے۔‘‘ راجہ نے بے بسی سے اپنی زبان بہادر کو دکھائی جہاں جا بجا کٹ پڑے تھے۔

’’تو..... تو نہ کھایا کر۔‘‘

’’کیسے نہ کھاؤں یار! پیٹ بھوکا ہو تو کھانا ہی پڑتا ہے، سوچ رہا ہوں کہ شبن نے مجھے انڈہ کیپسول کیسے کھلائے ہوں گے؟‘‘

’’کیسے؟‘‘

’’پیٹ میں گدگدی کر کے، یہ تو اس کی بیگم نے اسے لتاڑا کہ بکروں کو گدگدی نہیں ہوتی تو اس نے مجھے بخشا ورنہ مجھے تو لگتا تھا کہ میری آنتیں باہر آ جائے گی۔‘‘

’’اور تیرے ان چمکدار دانتوں کا راز؟‘‘ بہادر کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

’’صبح و شام میرے دانت، پیسٹ لگے برش سے صاف کرتا ہے اور پھر کلی کروانے کی کوشش میں آدھ گھنٹہ صرف کرتا ہے، یہ الگ بات کہ صاحب زادے نے اپنے دانت کبھی صاف نہیں کیے، منہ سے وہ بدبو کے بھبھوکے اٹھتے ہیں کہ الامان۔‘‘ راجہ کو سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی۔

’’ہاہا..... بکرے کے دانت صاف، دانتوں کا سوپ پیئے گا یہ شبن۔‘‘

’’ہو سکتا ہے کہ ڈیکوریشن یا یادگار کے بطور رکھنا چاہتا ہو۔‘‘

’’یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ تیرا منہ گندا ہو اور جراثیم تیرے گوشت میں حلول کر جائیں۔‘‘ بہادر نے قیاس آرائی کی۔

’’کچھ بھی ہو سکتا ہے اس کا دماغ کس وقت کیا سوچتا ہے، اس کو بھی نہیں پتہ، پانی بھی مجھے کلورین اور نمکول ملا کر دیتا ہے، سوچ ذرا۔‘‘ راجہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں مزید پھیلائیں اور پھر بہادر کو بغور دیکھا۔

’’میں بھی کتنا بے وقوف ہوں، اپنی داستان غم میں تجھے ہی بھول گیا، تجھے کیا ہو گیا ہے، ٹی بی کا مریض لگ رہا ہے تو مجھے، فارم پر ہم دونوں کیسے بانکے سجیلے جوان تھے، یاد ہے بھجے قصائی کی دونوں بکریاں ہم پر عاشق تھیں، تیرے لاجواب ڈولے اور رانیں، ہر بکری کے دل کی دھڑکن بڑھاتے تھے، تو نے کیا انسانی ڈائٹنگ شروع کی ہے؟‘‘

’’یار راجہ! یاد تو مجھے بھی ہے جب مسٹر بکرا آف دا ائیر کا سالانہ خطاب میں نے تین بار جیتا تھا یہاں تک کہ بھجا قصائی مجھے ٹریکٹر گھسیٹنے کے گینز مقابلے میں لے جانے والا تھا کہ فارم پر آگ لگ گئی، کتنے ہی ہمارے ساتھی جل گئے، ہم بھی فروخت کر دیئے گئے مگر اللہ کا شکر ہے ہماری زندگی اور جان نیک مقصود کی خاطر وقف ہو گئی ورنہ ہم یا تو آگ کا ایندھن بن جاتے یا معذور ہو جاتے۔‘‘ بہادر کو ماضی یاد کر کے جھرجھری آ گئی۔

’’بالکل..... لیکن یہ استداد زمانہ یعنی غریب نواز نے کیا مہمان داری کی تیری؟ تیری مہین پسلیوں میں سے دھڑکتا دل بھی صاف دکھائی دے رہا ہے۔‘‘

’’تو سمجھ لے کہ غریب نواز تیرے شبن میاں کا الٹ ہے، تجھے تو وہ انسانی اور حیوانی خوراک کا مکسچر دیتا ہے اور مجھے حیوانی خوراک بھی نہیں ملتی، بارہ گھنٹوں بعد گیلا چارہ وہ بھی سٹیل کی تھالی میں، جیسے لالی پاپ، دو دن بعد چنے کی دال وہ بھی مٹھی بھرتا کہ میرا پیٹ خراب نہ ہو، او بے حس انسانو! پیٹ میں کچھ جائے گا تو وہ خراب ہو گا، بس پانی پلا پلا کر مار رہے ہیں مجھے۔‘‘ بہادر روہانسا ہو گیا۔

’’غلط بات ہے کہ خود اچھا کھانا اور قربانی کے جانور کو اونٹ پٹانگ کھلانا۔‘‘

’’کون اچھا کھاتا ہے، یہ غریب نواز ڈیئر تیری غلط فہمی ہے تین دن دال تین دن بینگن کا بھرتہ اور کھیرے کا رائتہ، اپنے بچوں کو بھی ترساتے ہیں یہ لوگ کھانے پینے سے۔‘‘

’’دیکھنے میں تو بھلا چنگا لگتا ہے لیکن کیا کیا دکھ ہوتے ہیں غریبوں کے سینے میں، کھانے کو پیسے نہیں بے چارے کے پاس۔‘‘ راجہ کو شدید تاسف ہوا۔

’’پیسے نہیں راجہ یار! روپے بول، جیبیں بھر بھر روپے لاتا ہے، اس کی بیگم سب چھپا لیتی ہے، نہ جانے کس مصرف کے لیے؟ خدا ہی جانے۔‘‘ بہادر اگلی ٹانگیں بچھا کر بیٹھ گیا اور راجہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

’’تجھے تو رسی سے باندھا ہے ناں شبن نے، مجھے ازار سے باندھا ہے غریب نواز نے، ایک ہی ازار بند ہے، اس بیچارے کے پاس، وہ دیکھو، اب دھوتی پہنے بیٹھا ہے۔‘‘ بہادر نے غریب نواز کی طرف اشارہ کیا جو کسی کاغذ پر نہ جانے کیا حساب کتاب لکھ رہا تھا بس یار، اب تو ہے قصائی کا انتظار۔‘‘

’’کوئی شک نہیں، ایسی زندگی سے تو قربانی کی موت بھلی ہے، بخیلی اور فضول خرچی کی صفات اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں لیکن یہ انسان خود کو عقل کل سمجھتے ہیں، تبھی آزمائشوں اور کٹھنائیوں میں پڑ جاتے ہیں۔‘‘ بہادر نے راجہ کی بات پر تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

’’تجھے پتہ ہے کہ میرے گوشت کے حصے بھی غریب نواز کی ماں اور بیگم نے زبانی کر رکھے ہیں مگر میں پریشان ہوں کہ گوشت ہے ہی کون سا میرے میں۔‘‘

’’لالچ اور حرص ہے ناں ان انسانوں میں، ہم قربانی کے جانور سمیت ہر جانور ان انسانوں سے حد درجہ بہتر ہیں، ہم تھوڑا کھاتے ہیں، جو بھی مل جائے، ذخیرہ نہیں کرتے کہ آخری سفر میں نیکی اور خوف خداوندی کے کوئی اور زاد راہ لے جانے کی اجازت نہیں، ہم اس کی راہ میں قربان ہونے کو افضل سمجھتے ہیں جبکہ انسان موت کو بھلا کر صرف زندگی کو یاد کرتا ہے، جو فانی ہے سوچنے کی بات ہے کہ شبن اور غریب نواز جیسے کروڑوں کے لئے تو زر اور زمین اکٹھی کر رہے ہیں مگر بقا کے لئے کچھ نہیں۔‘‘

’’میری تو اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ جس طرح اس نے قربانی کے جانوروں کو عجز و انکساری، خدا کی محبت، صبر و برداشت اور قربانی کے جذبے سے روشناس کروایا ہے، ان انسانوں کو بھی ان تمام صفات سے بہرہ مند فرماتا کہ یہ قربانی محض دکھاوے، نمود و نمائش اور گوشت اکٹھا کرنے کی خاطر نہ کریں بلکہ قربانی کی اصل روح کو سمجھیں۔‘‘

’’آمین۔‘‘ راجہ اور بہادر کے ساتھ ہم نے بھی آسمان کی طرف دیکھ کر کہا، جہاں نیلے افق کے پرے ایک ابدی جہان تھا اور دو جہانوں کو مالک اس بات کا منتظر تھا کہ اللہ کے حکم کے لئے کون صحیح نیت سے قربانی یعنی سنت ابراہیمی پر عمل کرتا ہے کیونکہ ’’انا اعمال و بالنیات‘‘

☆☆☆

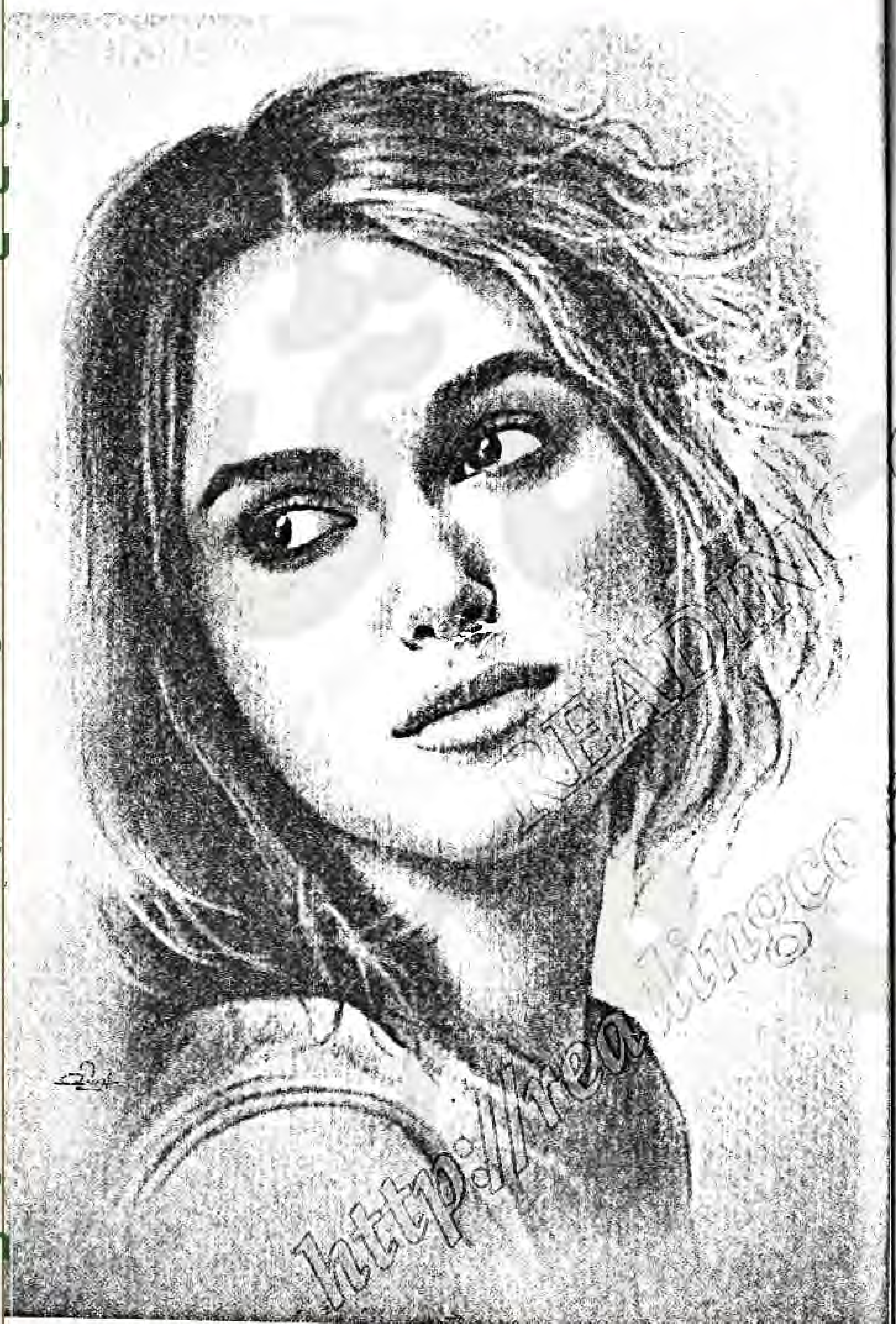

آخری خواہش

جبیہ طارق

وہ کب سے چت لیٹی چھت پر گھومتے پنکھے کو گھور رہی تھی، فضا میں دوائیوں کی بو رچی بسی تھی جو ہر سانس کے ساتھ اس کے اندر سما جاتی، اس نے ایک بار پھر کمرے میں نظر دوڑانا شروع کی، دائیں جانب سر گھمایا پاس پڑا صوفہ سیٹ آگے پڑا میز، اس کے ساتھ دروازہ اور پھر دیوار پہ لگا ٹی وی اور تھوڑے فاصلے پر باتھ روم کا دروازہ نظریں تھوڑا آگے بڑھیں تو دیوار پہ لگی گھڑی چھ بجا رہی تھی اس نے بائیں جانب دیوار پہ لگی گھڑی سے باہر جھانکنے کی ناکام کوشش کی، باہر ٹریفک کا شور تھا، وہ تیسری منزل پہ تھی غالباً، اسے ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا، انسان جب بیکار ہو اور کرنے کو کچھ نہ ہو تو سوچیں منتشر ہو ہی جاتی ہیں، ماضی کی یادیں حال کے زمانے پہ چھانے لگتی ہیں، وہ حافظے کا پردہ سرکا کر حال کے آئینے میں جھانکنے لگتی ہیں۔

ناولٹ

”کسی قدر مکمل تھا نا میرا ماضی۔“ وہ سوچنے لگی۔

”ہر چیز وہ ملی جس کی خواہش کی، ماں باپ اور بھائی کی لاڈلی، سسرال میں ہر دل عزیز، شوہر وہ جو جان نثار کرے، اولاد وہ جو پیار ہی پیار دے، کس قدر مکمل زندگی تھی میری، جیسے سارا جہان پا لیا ہو، میں نے اور اب...... اب وقت کس قدر کم رہ گیا ہے میرے پاس، زندگی کس قدر تنگ ہو گئی ہے مجھ پر۔“ وہ چھت کو گھورے جا رہی تھی مگر دماغ کہیں اور تھا، ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا، سورج دن بھر تھکنے کے بعد آرام کرنے کو ڈوبے جا رہا تھا۔

”میری زندگی بھی ایسے ہی ڈوبنے کو ہے، شاید۔“ ایک آہ بھری، ناک کے ساتھ ہی مترنم سی آواز کمرے میں گونجی۔

”مسز نعمان اب آپ کیسی ہیں؟“ سسٹر

شائستہ مسکراتے ہوئے اندر آئی۔

"جی رہی ہو سسٹر۔" نہ چاہتے ہوئے بھی زبان کڑوی ہوگئی۔

"آپ کی ڈیوٹی لگتا ہے شروع ہو گئی ہے۔" اپنے لہجے کا احساس ہوتے ہی وہ مسکرا کر بولی۔

"جی!" وہ مسکرائی۔

"آپ سے پہلے تو کوئی بہت ہی کھڑوس سی نرس تھیں۔" وہ ہنسی۔

"مسز فرزانہ کی بات کر رہی ہیں کیا؟" وہ مصروف سے انداز میں اس کی کیس شیٹ دیکھ کر مسکرائی۔

"غالباً وہیں تھیں۔" وہ ذہن پر زور دے کر بولی۔

"آپ کا روٹین چیک اپ کر لیتی ہوں تا کہ ڈاکٹر زیدی کو آپ کی پوزیشن سے آگاہ کر سکوں پھر آپ کو دوائی بھی دوں گی۔" وہ اس کی طرف بڑھی، جبکہ مسز نعمان اٹھ کر بیٹھ گئیں ساتھ ہی ایک کراہ نکلی۔

"اللہ یہ پیٹ کا درد۔"

"آرام سے مسز نعمان، احتیاط سے کام لیں۔" سسٹر سہارا دیتے ہوئے بولیں۔

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔

"آپ کے شوہر آنے والے ہی ہوں گئے۔" وہ گھڑی کو دیکھتے ہوئے اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے بولی۔

"جی! نعمان آنے والے ہی ہوں گے۔" وہ پر جوش تھی آواز میں کھنک آ گئی، جسے محسوس کر کے سسٹر بھی مسکرا دیں۔

"سسٹر ایک بات بتائیں۔" وہ سنجیدہ ہوئی۔

"بی پی تو نارمل ہے آپ کا۔" وہ سامان رکھتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس کتنا وقت باقی ہے؟" وہ سسٹر کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، سسٹر کے ہاتھ تھم گئے۔

"پلیز مسز نعمان زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ ہے میں آپ کے مرنے کا وقت کیسے بتا سکتی ہوں، میرے پاس ایسا کوئی علم نہیں یقین جانیئے۔" وہ لہجے کو ہلکا پھلکا بنا کر بولی۔

"پلیز سسٹر میں کوئی بچی نہیں ہوں جو مجھے بہلا رہی ہیں، مجھے کینسر ہے میں اچھے سے جانتی ہوں، آج کل کی پڑھی لکھی عورت ہوں تو یقیناً اپنی بیماری کے متعلق میں نے علم بھی حاصل کیا ہو گا، اس ٹائم میری حالت ٹھیک نہیں یہ بھی میرے علم میں ہے، تو پلیز مجھے بتائیں۔" سسٹر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے وہ ابھی بولنے کو الفاظ ترتیب دے ہی رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔

"ماما جان!" اس کی سات سالہ بیٹی فریحہ چہکتے ہوئے داخل ہوئی، وہ فوراً اسی طرف متوجہ ہوئی۔

"میری جان میری بیٹی!" اس نے بانہیں وا کر دیں، سسٹر اس کا دھیان بھٹکتا دیکھ کر فوراً وہاں سے کھسک گئی۔

"السلام علیکم سسٹر!" دروازے کے باہر اسے نعمان ملا، جس کے ایک ہاتھ میں اس کا پانچ سالہ بیٹے کا ہاتھ اور دوسرے ہاتھ میں بہت خوبصورت پھولوں کا گلدستہ تھا۔

"وعلیکم السلام مسٹر نعمان!" وہ مسکرائی جو اس کی شخصیت کا خاصا تھا۔

"حمیرہ کیسی ہے سسٹر!" وہ سنجیدہ تھا۔

"ٹھیک ہیں اب وہ۔" جواب مختصر مگر جامع تھا۔

"شکریہ آپ کا کہ آپ اس کا خیال رکھتیں ہیں۔" وہ ممنون تھا۔

"یہ تو میرا فرض ہے سر! میرا کام ہے اور میں ایک فرض آشنا نرس ہوں۔" وہ بولی اور بڑھ گئی جبکہ نعمان بھی کمرے میں آیا جہاں پہلے ہی حمیرہ بیٹی کو گود میں بٹھائے باتیں کر رہی تھی۔

"ماما جان!" حمزہ بھی ماں کی طرف بڑھا باپ کی گود سے نکل کر۔

"میرا بیٹا آ گیا ہے، میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔" اس نے ایک بار پھر بانہیں پھیلا دیں جس میں حمزہ سما گیا، اس نے اس کا ماتھا چوما۔

"کیسا ہے میرا سپر مین۔" وہ ناک کھینچ کر بولی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ ناک چڑھا کر بولا۔

"میں...... میں آپ سے ناراض ہوں ماما۔" فریحہ نے کہا۔

"کیوں میری جان!" وہ حیران ہو کر فریحہ کی طرف دیکھنے لگی، اتنے میں نعمان بھی ان کے پاس آ گیا۔

"کیسی ہو حمیرہ جان تم۔" اس نے گلدستہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ٹھیک ہوں نعمان آپ دیکھ لیں۔" وہ بجھی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

بیماری کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھی، رنگت بھی پیلی پڑ گئی تھی جو کبھی دن کی طرح روشن لگتی تھی۔

"مجھے تو تم بہت فریش اور خوبصورت لگ رہی ہو ہمیشہ کی طرح۔" وہ آنکھوں میں ڈھیروں پیار لے کر بولا۔

"مذاق کر رہے ہیں۔" وہ سنجیدہ ہوئی۔

"ہرگز نہیں، تم بہت اچھی لگ رہی ہو مجھے۔" وہ اس کے چہرے سے لٹ ہٹا کر اس کے کان کے پیچھے اڑس کے بولا، وہ مسکرا دی جبکہ دونوں بچے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

"ماما مجھ سے پوچھیں ناں کہ میں کیوں ناراض ہوں۔" اس کے چہرے پہ کرب ابھرا مگر وہ نظر انداز کر گئی اسے پیٹ میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا مگر وہ اس ٹائم سب بھلا کر بچوں اور شوہر میں مصروف رہنا چاہتی تھی۔

"ماما آپ ایک مہینے سے یہاں ہیں ان ڈاکٹرز کے پاس، آپ گھر میں میرے پاس کیوں نہیں ہیں کل سکول میں **Parents day** تھا آپ وہاں بھی نہیں آئیں۔" وہ شکایتی لہجہ لئے بولا، حمزہ کا چہرہ یک دم لٹک گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس نے پاس کھڑے نعمان کو دیکھا۔

"پتا ہے ماما ہمارے سارے فرینڈز کے ماما، پاپا آئے تھے مگر آپ نہیں آئے۔" فریحہ نے بھی کہا، حمیرہ کی آنکھوں میں کس قدر کرب تھا، یہ صرف نعمان جانتا تھا، اس کی آنکھوں میں واضح برسات کی دھمکی تھی۔

"بیٹا ماما بیمار ہیں ناں میں نے آپ کو بتایا تو تھا چلیں اب انہیں آرام کرنے دیں آپ ٹی وی دیکھیں۔" نعمان نے بچوں کو بیڈ سے اتارا اور ٹی وی چلا دیا، وہ حمیرہ کے پاس آیا تو وہ رو رہی تھی، آنسو تسلسل آنکھوں کا بندھ توڑے گال پر بہہ رہے تھے۔

"پلیز حمیرہ حوصلہ کرو۔" نعمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا، وہ خاموش رہی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا جان، میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔" نعمان سے اس کا رونا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"کس کو تسلی دے رہے ہیں آپ نعمان۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

"ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ میں مرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

والی ہوں۔" وہ تلخ آواز کے ساتھ بولی۔

"پلیز جان!" وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔

"مایوسی گناہ ہے حمیرہ، تم امید اور ہمت کا دامن کبھی مت چھوڑنا، میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" وہ تسلی دے کر بولا۔

"ہوں۔" وہ خاموش رہی پھر بولی۔

"نعمان پلیز مجھے گھر لے چلیں میں ہسپتال کے بستر پر یوں اپنوں سے دور مرنا نہیں چاہتی، میرے پاس جتنا بھی وقت ہے وہ میں آپ کے ساتھ بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں گزارنا چاہتی ہوں۔"

"حمیرہ لیکن تمہاری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے گھر میں یہ تم بھی جانتی ہو۔" وہ الجھا۔

"پلیز نعمان یہاں سارا دن بستر پر پڑے پڑے میں اب اکتا گئی ہوں، لگتا ہے جیسے پل پل صرف موت کی راہ دیکھ رہی ہوں کہ اب آئی کہ کب آئی، دماغ میں عجیب عجیب سوچیں آتی ہیں، اس طرح تو میں وقت سے پہلے مر جاؤں گی جو میں نہیں چاہتی پلیز نعمان مجھے لے جائیں پلیز۔" وہ التجاء کرتے ہوئے بولی۔

"موت کا انتظار بہت اذیت ناک ہوتا ہے نعمان آپ نہیں سمجھیں گے۔" وہ اندر سے بولی مگر لب ہنوز بند تھے۔

"ہوں میں کرتا ہوں انتظام تمہیں جلد از جلد گھر شفٹ کرنے کا۔" وہ مسکرایا۔

"Thank you۔" وہ آنسو صاف کر کے مسکرائی۔

"ارے دیکھو میں میڈم بی کے لئے ان کے پسندیدہ پھول لایا تھا اور بھول گیا دینا۔" وہ پاس پڑے بکے کو تھام کر بولا۔

"یہ آپ کے لئے میرے دل کی مہہ رانی صاحبہ!" وہ تھوڑا جھکا اور گلدستہ پیش کیا۔

"ہم خوش ہوئے۔" وہ اکڑ کر مسکرائی پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں ہنسنے لگے، وہ پوری رات بچوں کی باتیں سوچتی رہی۔

"میرے بچوں کو میری کتنی ضرورت ہے میرے مالک اور میرے پاس مہلت ہی نہیں ہے۔" ایک آہ بھری۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ معمول سے ہٹ کر فریش سی اٹھی۔

"اف آج میں گھر جاؤں گی۔" اٹھتے ہی وہ بچوں کی طرح چہکی جسے من پسند کھلونا ملا ہو۔

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنے پاؤں پر گھر جاؤں گی۔" وہ کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی، جو روشن تھا۔

وہ بستر کے پاس پڑی ہوئی چھڑی کا سہارا لے کر باتھ روم میں گئی، واپس آئی تو بیڈ پر میز لگا تھا جس پر روزمرہ کا ناشتہ تھا، آج اسے وہ بدمزہ اور پھیکا کھانا بھی برا نہیں لگ رہا تھا جو روز اسے حلق سے نگلنا مشکل لگتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوئی تو سسٹر غزالہ اس کے چیک اپ کو آئیں اور پھر دوائی دے کر چلی گئیں۔

وہ پاس پڑے بکے کو تھا کر مسکراتی اور پھولوں کو ناک کے قریب کر لیا، مہکتی ہوئی خوشبو اس کے اندر سما گئی جس سے دوائیوں کی بو زائل ہوئی، اب بس وہ بے چینی سے نعمان کی منتظر تھی کہ کب وہ آئے اور کب وہ گھر جائے۔

☆☆☆

"ڈاکٹر حمیرہ کی Condition اب کیسی ہے؟" وہ ڈاکٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔

"دیکھو نعمان!" سنجیدہ سے ڈاکٹر زیدی

نے اپنے چشمے اتارے اور متوجہ ہوئے۔

"میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، وہ ٹھیک نہیں ہے اس کا مرض تیزی سے اسے جکڑ رہا ہے۔"

"ہوں۔" نعمان کا چہرہ مرجھا گیا۔

"لیکن وہ گھر جانے کی ضد کر رہی ہے ڈاکٹر۔"

"میرے مطابق تو اسے یہاں رہنا چاہتے یہاں چوبیس گھنٹے ڈاکٹر ہوتے ہیں اس کی دیکھ بھال کرنے کو۔" وہ نعمان کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"مگر وہ بضد ہے ڈاکٹر، وہ گھر میں ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہے، وہ کہتی ہے کہ اسے یہاں نہیں مرنا۔"

"ہوں...... کہتی تو وہ بھی ٹھیک ہے، میری مانو تو گھر میں اس کے لئے ایک نرس کا بندوبست کرو جو اس کے ساتھ رہے۔" انہوں نے صلاح دی۔

"ہوں...... یہ مناسب ہے۔" اس نے بھی اتفاق کیا۔

"تو پھر آپ ہی ارینج کر دیں کوئی نرس جو اپنے کام کو بخوبی جانتی ہو۔"

"ہوں ٹھیک ہے میں کر دوں گا You don,t worry۔" وہ مسکرائے۔

"Thank you doctor۔" وہ مصافحہ کر کے اٹھ گیا۔

"نرس پلیز ان کا سامان پیک کر دیں آپ۔" نعمان روم میں آ کر بولا جہاں ایک نرس حمیرہ کے پاس کھڑی اس کی نبض دیکھ رہی تھی۔

"اوکے سر۔" نرس نے سر کو جنبش دی۔

"ہم جا رہے ہیں نعمان۔" وہ پرجوش تھی۔

"جی جناب ہم جا رہے ہیں۔" وہ مسکرایا اور اس کے پاس آ کر بولا۔

"شکر ہے اللہ کا۔" اس نے آنکھیں بند کر کے مسرت کو محسوس کیا۔

وہ جانے کو تیار تھی کہ سسٹر شائستہ آ گئیں۔

"ارے لگتا ہے کہ آپ جا رہی ہیں مسز نعمان۔" وہ حسب عادت مسکرا کر بولی۔

"جی سسٹر میں آپ کے قید خانے سے اپنی جنت میں جا رہی ہوں۔" وہ نعمان کا سہارا لیتے ہوئے تھی۔

"مبارک ہو بھئی آپ کو رہائی۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی۔

"شکریہ سسٹر، اگر آپ نہ ہوتیں تو میرا یہاں گزارا کچھ زیادہ ہی مشکل ہو جاتا۔" وہ ممنون تھی۔

"آپ کے ساتھ میرا بھی وقت اچھا گزرا مسز نعمان، اپنا خیال رکھیئے گا آپ اور دوائیاں لیتی رہیئے گا وقت پر آپ۔"

"جی سسٹر آخر کو چند دن تو اور جینا چاہتی ہوں میں۔" وہ ہنسی۔

"اوکے اللہ حافظ، خدا آپ کو صحت دے۔" وہ بھی مسکرائی ساتھ ہی خدا حافظ کہا۔

☆☆☆

گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ اپنے رب کا ڈھیروں شکر بجا لائی۔

"میں تیرا جتنا شکر ادا کروں کم ہے میرے مالک کہ ایک بار پھر اپنے قدموں پر چل کر آئی ہوں ورنہ آخری دفعہ تو گھر کو حسرت سے دیکھ گئی تھی کہ شاید اب دیکھنا دوبارہ ممکن نہ ہو۔" اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور زبان پر تشکر تھا۔

وہ گیراج کو عبور کر کے بڑے دروازے کی طرف بڑھی، اندر جاتے ہی دونوں بچوں نے اس

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کا استقبال کیا، وہ بہت خوش تھے۔

''ماما گھر آ گئیں۔'' وہ ناچ رہے تھے۔

''سلام بی بی کیسی ہے اب؟'' ماسی بر کتے ہاتھ پونچھتے کچن سے نکلیں۔

''ٹھیک ہوں ماسی۔'' وہ مسکرائی۔

نعمان سیدھا اسے دونوں کے مشترکہ کمرے میں لے گیا اور بیڈ پر لٹا دیا، تھوڑا سا چلنے کی وجہ سے ہی اس کا سانس پھول گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو حمیرہ۔'' نعمان فکرمندی سے بولا۔

''جی بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے مسکرانے کی زبردستی کوشش کی جبکہ چہرے پر واضح کرب تھا۔

''تم پلیز آرام کرو میں تمہاری دوائیاں لے کر آتا ہوں ساتھ ہی ماسی سے کہتا ہو کہ تمہیں جوس دے۔'' وہ اس کا ماتھا چوم کر بولا۔

''پلیز بچوں کو تو بھیج دیں۔'' وہ جانے لگا تو بولی۔

''نہیں ابھی تم بس آرام کرو، بچوں کے ویسے بھی ٹیچر کے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔''

''اوکے۔'' وہ بجھی سی بولی مگر وہ نظرانداز کر گیا۔

''تمہاری صحت اور آرام سب سے زیادہ ضروری ہے میرے لئے۔'' وہ اس کو دیکھ کر مسکرایا جبکہ لب ہنوز بند تھے۔

اس نے کراؤن سے ٹیک لگائی اور اپنے کمرے پر نظر دوڑائی، اب بھی وہ کمرہ ویسا ہی تھا جیسا چھوڑ کر گئی تھی، دائیں طرف لکڑی کی بڑی سی الماریاں دیوار پر بنی تھیں ساتھ میں دروازہ تھا سامنے دیوار پر لارج سائز کی دونوں کی تصویر لگی تھی، جس میں وہ دلہن بنی ہوئی تھی اور نعمان دلہا تھا، نعمان نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اس کا چہرہ شرم سے جھکا ہوا تھا ایسا کہ نعمان کے کندھے سے مس ہو رہا تھا، دونوں کو ہی وہ تصویر بہت پسند تھی اسی لئے کمرے میں لگائی تھی، تصویر کے نیچے سکن کلر کے لیدر کے صوفے پڑے تھے، بائیں طرف کھڑکی تھی جس پر ڈارک براؤن اور سکن کلر کے کمبی نیشن میں پردے لگے تھے ساتھ میں ڈریسنگ ٹیبل تھا جیسے ہی اس نے اپنا عکس اس میں دیکھا تو ٹھٹک گئی۔

اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کو ٹٹولا، کتنا کمزور ہو گیا تھا اس کا وجود، بالکل ہڈیوں جیسا، چہرہ یک دم پھیکا پڑ گیا اس کا، آنکھیں معلوم ہوتا تھا کہ گڑھوں میں پڑی ہیں، گال جو کبھی پھولے ہوئے تھے اب پچکے گئے تھے، ہونٹ جو کبھی گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ہوا کرتے تھے اب مرجھا گئے تھے، وہ اپنے ہاتھ سے چہرے کو ٹٹول رہی تھی، اس کے اندر ایک اداسی سما گئی وہ سامنے لگی تصویر میں حمیرہ اور اس طرف بیٹھی حمیرہ میں موازنہ کرنے لگی، زمین آسمان کا فرق آ گیا تھا دونوں میں وہ محض نو سال پرانی تصویر تھی، وہ حمیرہ گلاب کا کھلتا ہوا پھول لگ رہی تھی جو اپنے جوبن پر تھا اور یہ حمیرہ وہ مرجھائے جا رہا پھول تھی جو اپنی آخری سانسوں پر تھا، ایک سرد آہ بھری اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

''السلام علیکم ماما جان!'' فریحہ سکول جانے کو بالکل تیار اس سے ملنے کے لئے آئی۔

''وعلیکم السلام میری گڑیا۔'' وہ گال چوم کر بولی، حمزہ بھی آ گیا گلے میں بوتل لٹکائے اور سکول بیگ لے۔

''میرا سپر مین سکول جا رہا ہے۔'' وہ ناک کھینچ کر بولی۔

''جی ماما، واپس آ کر آپ سے ڈھیروں باتیں کروں گا۔'' وہ ہاتھوں کے اشارے سے بولا۔

''میں انتظار کروں گی اپنے بچوں کا۔'' وہ اس کے بال ایک بار پھر جما کر بولی۔

''بچوں تیار ہو تو دونوں تو چلو گاڑی میں بیٹھو۔'' نعمان بھی تک سک سا تیار کمرے میں داخل ہوا۔

''جی پاپا۔'' وہ دونوں نے یک زبان کہا، پھر ماں کا گال دونوں نے چوما اور خدا حافظ کہہ کر نکل گئے۔

''کیسی ہو جناب!'' وہ کف بند کرتا آگے بڑھا۔

''بالکل ٹھیک۔'' حمیرہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹائی کی ناٹ درست کی۔

''اچھا سنو، میں نے ڈاکٹر زیدی سے نرس کا کہا تھا وہ آج آ جائے گی، ابھی تم پلیز ناشتہ کر لینا اور پھر دوا بھی لے لینا پلیز۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھا ہدایات دے رہا تھا۔

''جو حکم آپ کا جناب!'' وہ آداب بجا لائی، پھر دونوں ہی مسکرا دیئے، نعمان نے بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور اٹھ گیا۔

☆☆☆

کوئی تیسری بار اس نے گھنٹی بجائی، پھر دروازہ پیٹ دیا۔

''شاید لائٹ نہ آ رہی ہو۔'' وہ دوپٹہ درست کر کے گلی میں نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔

''جی کس سے ملنا ہے؟'' پینتالیس کے لگ بھگ کی عورت سے سڑی ہوئی شکل باہر نکال کر پوچھا جیسے سوئی ہوئی اٹھ کے آئی ہو۔

''مسز نعمان سے۔'' وہ بولی۔

''کس سے؟'' وہ باہر نکل آئی۔

''نعمان...... نعمان ظفر کا ہی گھر ہے ناں یہ؟'' وہ ہاتھ گھر کی طرف کر کے بولی۔

''جی!'' جواب مختصر تھا۔

''میں نرس ہوں ان کی بیوی کے لئے آئی ہوں۔'' وہ اپنا تعارف کرا کے بولی۔

''اوہ اچھا تو تم نرس ہو بی بی، یوں بولنا تھا ناں کہ بی بی جی کے لئے آئی ہوں۔'' راستہ دیتے ہوئے بولی۔

نرس خاموشی سے پیروی کرنے لگی مختصر سے گیراج سے گزر کر وہ صدر دروازے کی طرف آئی، اندر داخل ہوتے ہی ٹھنڈک کا احساس ہوا، باہر کی نسبت اندر گرمی کم تھی۔

''ادھر بیٹھو میں بی بی کو بتا آؤں۔'' وہ صوفے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''جی!'' وہ مسکرائی اور گھر کو دیکھنے لگی، چھوٹا سا مگر خوبصورت سا گھر تھا کرینے سے بنا ہوا اور سلیقے سے سجا ہوا، وہ غالباً ٹی وی لاؤنج میں تھی، دائیں جانب صدر دروازے کے ساتھ کچن تھا اور پھر ساتھ ہی گول سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں، سیڑھیوں کے نیچے پودے پڑے ہوئے تھے، اس کے ساتھ کھڑکی تھی جو باہر لان کی طرف کھلی تھی اور جس پر گولڈن اور سفید رنگ کے پردے لگے ہوئے تھے جو دھول کے باعث پیلے لگ رہے تھے، پاس ہی ٹی وی پڑا تھا جس کے آگے کچھ فاصلے پر میز تھی صوفوں کا سیٹ ترتیب سے لگا تھا، بائیں جانب دیوار پر کتابوں کی بڑی سی الماری تھی جس میں ڈھیروں کتابیں ترتیب سے پڑی تھیں، ساتھ چھوٹی سی گلی اندر کو جا رہی تھی جہاں شاید کمرے تھے، گلی کی دیواروں پر سب سے توجہ طلب تصویریں آویزاں تھیں۔

''ارے سسٹر شائستہ آپ۔'' حمیرہ کو ماسی سہارا دے کر لا رہی تھی۔

''جی میں۔'' وہ حسب عادت مسکرا رہی

تھی۔

”مجھے ڈاکٹر زیدی نے بھیجا ہے کہ آپ کی دیکھ بھال کر دوں۔“ وہ باادب کھڑی ہو گئی تھی۔

”اوہ مجھے حقیقتاً بہت خوشی ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر۔“ وہ مسکرائی اور اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوئی۔

”ایک عجیب سی انسیت محسوس ہونے لگی ہے آپ سے۔“ دوبارہ بولی۔

”ماسی تم کچھ لاؤ ان کے لئے۔“ وہ ماسی کو دیکھ کر بولی۔

”میں ابھی کمرے سے نکلی ہوئی کل کی آئی ہوئی۔“ وہ اردگرد نظر دوڑا کر بولی، جہاں دھول پڑی تھی چیزوں پر، اسے نہایت شرمندگی ہوئی کہ یوں گھر گندا ہو رہا ہے۔

”آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے مسز نعمان۔“ وہ بھی نظر پھر سے دوڑا کر بولی۔

”شکریہ، ایک مہینہ جو آپ کے قید خانے میں گزار کر آئی ہوں تو دیکھیں گھر کی حالت کیا ہو گئی ہے، ملازموں کے سر پر پڑا تھا نا تو دیکھیں کیسے دھول نظر آ رہی ہے۔“ وہ میز کی طرف دیکھ کر بولی۔

”ہوں واقعی ملازم کے سر پر ہو تو گھر ایسا ہی ہوتا ہے جب تک انسان خود کیئر نہ کرے تب تک گھر گھر نہیں لگتا۔“ وہ دھیمے سے مسکرائی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو آپ۔“ وہ بولی مگر ذہن جھٹک گیا۔

”دیواروں پر جالے لگے تھے، دھول پڑی تھی، کشن گندے ہو رہے تھے، اگر چیزوں کا یہ حال ہے تو مکینوں کا کیا حال ہوگا۔“ سوچیں منتشر ہونے لگیں۔

”ماسی تم ان کے لئے گیسٹ روم ٹھیک کرو اور ان کا سامان وہاں رکھ دینا۔“ وہ ماسی کو ہدایت کر رہی تھی جو مشروب تھامے آ رہی تھی۔

”جی بی بی کر دوں گی میں۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”اور ماسی تم نے گھر کی حالت دیکھی ہے کیسے دھول سے اٹا ہوا ہے سارا گھر، وہ جالے دیکھ رہے ہیں تمہیں اور یہ کشن دیکھو تم، ابھی تو میں یہاں ہوں نا جانے بچوں کے کمرے کا اور پورے گھر کا کیا حشر ہو رہا ہوگا۔“ اس کا پارہ چڑھ گیا ماسی کے انداز واطوار پر۔

”بی بی میں اکیلی کیا کیا کروں مجھے تو خود کو گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔“ ماسی نے فٹ ہی معصوم سی شکل بنا کر کہا۔

”او ماسی تم ذرا خدا کا خوف کرو عمر ہی کیا ہے تمہاری پینتالیس سال کی ہو گی تم زیادہ سے زیادہ اور گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔“ وہ ناک سے مکھی اڑا کر بولی، جبکہ شائستہ خاموشی سے دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔

”ویسے بتا دو کہ تم سے کام نہیں ہوتا تو تمہارا بندوبست کیے دیتے ہوں، کام چور تو تم سدا کی ہو ویسے اوپر سے کھلی چھٹی مل گئی تمہیں۔“ اسے ماسی پر طیش آ گیا۔

”آئے ہائے بی بی ایسے ہی نکال دو گی کیا ہمارا پانچ برس کا ساتھ ہے۔“ وہ زبان پر شہد بھر کر بولی۔

”اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ اور جاؤ کھانے کا انتظام کرو اور پھر کمرہ ٹھیک کرنا بچے آتے ہی ہوں گے۔“ وہ جھاڑ کر بولی۔

”سوری سسٹر تھوڑا غصہ آ گیا۔“ وہ معذرت سے خواہ انداز میں سسٹر کو بولی، وہ آگے سے مسکرا دی۔

”میں اب آرام کروں گی تو آپ اپنا سامان کمرے میں لے جائیں اور چاہیں تو تھوڑا ریسٹ کر لیں۔“ حمیرہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”آئیں میں آپ کی مدد کرتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ آئی۔

”شکریہ۔“ وہ مسکرائی۔

”ماسی باجی کو کمرہ دکھا دو۔“ ساتھ ہی حکم بھی صادر کر دیا۔

سسٹر حمیرہ کو چھوڑنے کے بعد سیڑھیوں کی جانب بڑھی جو کہ لاؤنج میں ہی سے اوپر جا رہی تھیں، سیڑھیوں کی دیوار پر بھی تصویریں آویزاں تھیں، جیسے نیچے کوریڈور میں آویزاں تھیں، کسی میں بچے اکیلے تھے تو کسی میں حمیرہ اور نعمان اور کسی میں پوری فیملی تھی، وہ دیکھ کر مسکرانے لگی، سب سے اوپر والی سیڑھی کے ساتھ کمرہ تھا، شاید یہ ہے، وہ بڑبڑائی۔

کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور دروازہ بھی کھلا تھا، وہ دبے قدموں اندر کی جانب بڑھی، اندر پہنچ کر وہ مسکرانے لگی۔

”لگتا ہے کہ یہ بچوں کا کمرہ ہے۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی جبکہ لبوں پر اب بھی تبسم تھا، کمرہ پنک کلر اور بلو کلر کے کمبی نیشن سے مزین تھا، سامنے دیوار پر پنک کلر کی ڈریسنگ ٹیبل تھی اور سب سے خاص بات اس کا سائز تھا، وہ چھوٹی سی سنگھار میز تھی، جس کے ایک طرف دروازہ اور دوسری طرف کھڑکی تھی، کھڑکی پر کارٹونز بنے پردے لٹک رہے تھے ڈبل اسٹوری بیڈ پڑا تھا بائیں جانب اور پھر دیوار پر الماری بنی تھی۔

سنگھار میز کے اوپر بچوں کی ان لارج تصویریں لگی تھی، جس میں وہ دونوں اکیلے تھے، دائیں جانب بھی دیوار پر چند تصویریں تھیں اور ساتھ میں کرسی اور میز پڑا تھا، ساتھ ہی شیلف بنی تھی جس پر مختلف کھلونے پڑے تھے، کمرہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا مگر باقی گھر کی طرح اس کی بھی صفائی نہیں کی گئی تھی میز پر چیزیں بکھری تھیں اور بیڈ پر چادریں شکن زدہ تھیں وہ تفصیلی جائزہ لے کر پلٹنے کو تھی کہ دیوار پہ لگے ایک فریم میں اس کی نگاہ قید ہو گئی، وہ خود بخود اس کی طرف کھنچے لگی۔

فریم میں موجود تصویر پر رنگین پنسلوں کی الٹی سیدھی لکیریں لگیں تھیں، جیسے بچے نے گند مارا ہو یا پھر پہلی بار طبع آزمائی کی ہو مصور بننے کی، سب سے خاص بات نیچے جلی حروف میں لکھا تھا Fareeha numan 9-4-2009 وہ اس کی تصویر کو دیکھ رہی تھی مگر ذہن ماضی کی طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔

”اماں دیکھو مجھے پہلا انعام ملا ہے۔“ بچی دوڑتی ہوئی آئی اور ماں کو نا پا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا ہے بانو کیوں چلاوے ہے۔“ ساتھ کمرے سے اڈھیر عمر خاتون برآمد ہوئیں۔

”اماں دیکھو مجھے پہلا انعام ملا ہے۔“ وہ ہاتھ میں پکڑے گفٹ ریپ میں موجود کتاب نما چیز کو سامنے کرتے ہوئے جوش سے بولی۔

”ہیں...... پر کس لئے؟“ وہ حیرانی سے دیکھ کر بولیں۔

”اماں وہ ہماری میڈم جی ہیں ناں انہوں نے جماعت میں مقابلہ کرایا تھا ڈرائنگ کا اس میں میرا نمبر اول آیا ہے۔“ وہ فخریہ انداز لئے ہوئے تھی جیسے دنیا سر کر لی ہو۔

”اچھا!“ ماں نے سرسری سا اچھا کہا، آٹھ سالہ بانو کا چہرہ لٹک گیا۔

”ارے واہ! کیا بات ہے بھئی لگتا ہے ہماری چھٹکو اب مصورہ بنے گی بھئی۔“ صحن سے اس کی بڑی بہن مسکراتے ہوئے داخل ہوئی، بانو

بہن کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"چل لا تو دکھا کہ کیا بنایا تھا۔" بارہ سالہ شائستہ بہن کو پھر سے جوش دلاتے ہوئے بولی۔

"ابھی لائی۔" وہ باہر سے بستہ لینے کو دوڑی۔

"اماں کیا ہے بھئی تم بھی ذرا حوصلہ افزائی کر دیا کرو نا بانو کی وہ خوش ہو جاتی ہے۔" وہ ناراض سی ماں سے مخاطب ہوئی، ماں چپ کیے کسی لحاف کے کپڑے کو ادھیڑنے میں لگی تھی، شائستہ نے افسوس سے سر مارا۔

"دیکھو باجی۔" بانو کاپی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ارے واہ بانو توں نے تو بڑی اچھی تصویر بنائی ہے۔" وہ سامنے کیے اس تصویر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"بتا تو کیا بنایا ہے؟" وہ کاپی آگے کرنے لگی۔

"باجی یہ ہے ہمارا گھر۔" وہ جھونپڑی پر انگلی رکھ کر بولی۔

"یہ ہو تم یہ ہوں میں اور یہ ہیں اماں۔" وہ سامنے عجیب سی چیز پر انگلی رکھ کر بولی جو لڑکیوں جیسی لگ رہی تھی۔

"اچھا!" وہ بھنویں اچکا کر بولی اور ساتھ میں ہنس دی۔

"اور یہ دونوں کون ہیں جو سڑک پہ پڑے ہیں۔" وہ دو انسانوں جیسی چیز کو دیکھ کر بولی جو گھر کے باہر بنائی گئی، سڑک پر پڑے تھے، بظاہر وہ گرے ہوئے نظر آ رہے تھے جبکہ بانو نے اپنی طرف سے انہیں کھڑا کر کے دکھایا تھا۔

"یہ دونوں بھائی ہیں ناں، وہ سارا دن باہر رہتے ہیں ناں تو میں نے بھی انہیں سڑک پر ہی بنایا۔" وہ معصومیت سے بولی تو شائستہ کو اس پر بہت پیار آیا وہ اس کا گال چوم کر بولی۔

"مجھے بہت اچھی لگی تمہاری کوشش اس طرح آگے بڑھتی رہنا۔" وہ ماں کی طرف دیکھ کر مایوس ہو گئی جواب بھی اپنے کام میں مصروف دونوں سے بے نیاز بیٹھی تھی۔

"میری پیاری بہن۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ سامنے لگی تصویر پر ہاتھ لگا کر بولی۔

"کاش تم آج زندہ ہوتیں تو شاید زندگی مختلف ہوتی۔" اس نے خاموشی سے آنسو صاف کیے۔

"باجی جی...... اوہ باجی جی۔" ماسی اسے دروازے سے آواز دیتے ہوئے بولی۔

"ہاں...... ہاں۔" وہ چونکی۔

"یہ کمرہ تمہارا نہیں ہے بلکہ وہ سامنے والا ہے۔" وہ دوسری طرف اشارہ کر کے بولی۔

"جی ٹھیک ہے۔" وہ نظریں چرا گئی کہ کہیں ماسی آنسو نہ دیکھ لے اور خاموشی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

☆☆☆

شام کو حمیرہ کی نند اور میاں اس کی عیادت کو آئے، وہ لوگ کافی دیر تک بیٹھے رہے ان کے جانے کے بعد حمیرہ کافی تھکن محسوس کرنے لگی تھی۔

"مسز نعمان!" سسٹر شائستہ نے دروازے پہ دستک دی اور اندر چلی آئی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟ معاف کیجیے گا میری آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"کوئی بات نہیں سسٹر آپ بھی تو انسان ہی ہیں کوئی مشین تھوڑی ہیں اور ویسے بھی ابھی چند منٹ پہلے ہی تو مہمان گئے ہیں۔" وہ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"لائیں آپ کا چیک اپ کر لیتی ہوں۔" وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ماما جی۔" حمزہ کمرے میں دوڑتا ہوا آیا۔

"کیسا ہے میرا اسپر مین۔" وہ مسکرائی۔

"ٹھیک ہوں، آپ چلیں نا باہر ہم کھیلتے ہیں۔" وہ دوسری طرف سے بیڈ پر چڑھ گیا جوتوں سمیت ہی، حمیرہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا، جسے سسٹر نے محسوس کیا۔

"بیٹا آپ اور فریحہ کھیلو نا میں ذرا بڑی ہوں آنٹی کے ساتھ۔" وہ ٹالتے ہوئے بولی۔

"فریحہ تو ٹی وی دیکھ رہی ہے وہ نہیں کھیلتی میرے ساتھ۔" وہ منہ لٹکا کر بولا۔

"اوہ...... کوئی بات نہیں ماما کو ریسٹ کرنے دیتے ہیں اور میں کھیل لیتی ہوں آپ کے ساتھ" سسٹر نے پیار سے حمیرہ کا ہاتھ دبایا وہ اس کی حالت سے بخوبی آشنا تھی۔"

"آپ کھیلیں گی؟" وہ بھنویں اچکا کر دیکھ کر بولا جیسے یقین نہ ہو کہ یہ کھیلے گی۔

"جی بالکل کھیلوں گی۔" وہ چیزیں بیگ میں رکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں بولی۔

"آپ ایسا کرو کہ چلو میں ماما کو دوا دے کر آتی ہوں اوکے۔" وہ اس کی تھوڑی کو چھو کر مسکرائی۔

"اوکے۔" وہ کندھے اچکا کر نکل گیا۔

"مسز نعمان آپ ریسٹ کریں آپ کا بی پی نارمل نہیں ہے، میں آپ کو دوا بھی دیتی ہوں اور انجکشن بھی۔" وہ اب سامنے چہرہ لٹکائے حمیرہ کو دیکھ کر بولی۔

"ہوں۔" جواب دوسری طرف سے مختصر تھا۔

"مسز نعمان حوصلہ رکھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ تسلی دے کر بولی، وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے اور اسے حمیرہ سے دلی ہمدردی تھی۔

"سسٹر آپ مجھے باہر لاؤنج تک لے چلیں گی۔" وہ نم دیدہ آنکھوں سے بولی۔

"کیوں نہیں آئیں۔" وہ اسے اٹھاتے ہوئے بولی، وہ سہارا دے کر لاؤنج تک لائی جہاں فریحہ ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی ساتھ ہی ماسی بھی بیٹھی تھی۔

"ماسی ذرا یہ کشن وغیرہ ٹھیک سے لگا دو بلکہ مجھے اندر سے تکیہ بھی لا دو۔" حمیرہ نے بڑی ہمت سے بولا اس کے اندر سے طاقت دن بدن ختم ہوتی جا رہی تھی، ہر گزرتا لمحہ اسے کمزور سے کمزور تر کر رہا تھا۔

"جی بی بی!" ماسی نے تیزی سے حرکت کی اور سسٹر نے اسے صوفے پر نیم دراز سا بٹھا دیا۔

"آپ ریلیکس کریں پلیز۔" وہ مسکرائی۔

"شکریہ سسٹر آپ کا۔" لہجہ ایک دم بجھا ہوا تھا۔

"سسٹر آنٹی آئیں ناں بھئی۔" حمزہ لان کا دروازہ جو لاؤنج میں کھلتا تھا وہاں سے برآمد ہوا، ہاتھ میں بلا پکڑے۔

"جی آئی بیٹا۔" وہ اسے دیکھ کر بولی۔

"بی بی جی تکیہ۔" ماسی نے آواز دی۔

"ہاں لگا دو میرے پیچھے اور کھڑکی سے پردے ہٹاؤ گھٹن ہو رہی ہے۔" وہ آنکھیں بند کیے ہوئے بولی۔

"جی!" ماسی نے تیزی سے حرکت کی، صبح والی ڈانٹ کا خاطر خواہ اثر دیکھنے کو مل رہا تھا، ماسی کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔

"اُف میں کتنی بے بس ہوتی جا رہی ہوں، اب اتنی بھی ہمت وجود میں نہیں رہی کہ اپنے بچوں کے ساتھ چند لمحے کھیل کر ان کا دل رکھ

سکوں۔" آنسو بندھ توڑے نکل آئے، اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، حمزہ بال کرا رہا تھا جبکہ سسٹر نے بلا پکڑا تھا، کتنا خوش لگ رہا تھا وہ کھیلتے ہوئے، جبکہ فریحہ انہماک سے کارٹونز میں کھوئی ہوئی تھی۔

"میرے بچے، آہ نکلی، میرے مالک مجھے مہلت دے کہ ان کے مستقبل کے لئے چند اہم فیصلے کر پاؤں۔" وہ ناخن منہ میں لئے پرسوچ تھی۔

"السلام علیکم جناب!" نعمان پاس آ کر بولا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے ہشاش بشاش بننے کی بھرپور کوشش کی مگر ناکام رہی۔

"تمہاری حالت نہیں ٹھیک ناں۔" وہ فکر مندی سے اس کے قریب والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں وہ بس درد ہو رہا ہے اور تو کچھ نہیں ابھی میڈیسن لیں ہیں میں نے ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"پلیز آرام کرو تم، کوئی ضرورت نہیں ہے یوں اس طرح صوفے پر بے آرام ہونے کی چلو کمرے میں لے چلتا ہوں تمہیں۔" وہ اٹھنے لگا تو اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابھی تو آئی ہوں میں کمرے میں نعمان دل گھبرا رہا تھا تو سسٹر سے کہا کہ مجھے باہر ہی لے چلیں تو وہ لے آئیں ہیں۔" حمیرہ نے کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہا جہاں اب وہ گیند کرا رہی تھی، نعمان نے بھی دیکھا اور مسکرا دیا۔

"کافی نائس خاتون معلوم ہوتی ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہوں واقعی کافی سوبر سی خاتون ہیں، فرض شناس، مسکراتی ہوئیں۔" حمیرہ نے بھی تعریف کی۔

"اچھا تم بیٹھو میں چینج کر کے آتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔

"ماسی میرے لئے چائے اور بی بی کے لئے جوس بناؤ میں آ رہا ہوں۔" وہ بولتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔

"ماسی مجھے گھر ایک دم صاف چاہیے سمجھیں ناں کل صبح تک ہر چیز بالکل صاف دھلی دھلائی ہونی چاہیے۔" حمیرہ کی نظریں گندے کشن پر اٹک گئیں تو دوبارہ اسے یاد آ گیا تو ماسی کو بولی۔

"جی بی بی کر دوں گی۔" وہ جھٹ سے بولی اس سے پہلے کہ وہ اسے فارغ ہی نہ کر دے، پندرہ منٹ بعد نعمان نہا کر آ گیا، اتنے میں ماسی چائے اور جوس بھی لے آئیں۔

"آج غزالہ باجی اور خالد بھائی آئے تھے۔" وہ جوس کا سیپ لے کر بولی۔

"اچھا! میں نے کل بتایا تھا کہ تم آ گئی ہو گھر اسی لئے آئیں ہوں گی۔" نعمان نے کپ اٹھایا۔

"فریحہ بیٹا آپ بھی کھیلو کہاں ٹی وی دیکھتی رہتی ہو تم۔" نعمان نے فریحہ کو کہا جو اب بھی ٹی وی دیکھنے میں گم تھی۔

"پاپا جی بس دو منٹ یہ پرنس والے کارٹونز ختم ہونے لگے ہیں۔" وہ نظریں ہٹائے بغیر بولی۔

"کیا کہہ رہی تھیں باجی۔" وہ دوبارہ متوجہ ہوا۔

"کچھ نہیں بس حال چال پوچھ رہی تھیں شازیہ بھی (بیٹی) سلام دے رہی تھی، کہہ رہی تھیں کہ ارسلان (بیٹا) بھی کل آئے گا اسلام آباد سے۔"

"ہوں میری بات ہوئی تھی ارسلان سے

آج کہہ رہا تھا ماموں کہ کام بس ہو گیا ہے ایک آدھ دن میں آؤں گا تمہارا بھی پوچھ رہا تھا اور سلام کہا ہے۔"

"وعلیکم السلام!" اس نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

☆☆☆

غزالہ اور بجیلہ اس کی دو ہی نندیں تھیں سسرال کے نام پر، غزالہ بڑی جبکہ بجیلہ نعمان سے چھوٹی تھی، بجیلہ شادی کے بعد امریکہ جا بسی تھی جبکہ غزالہ گھر کے قریب ہی رہتی تھیں، نعمان کا کوئی بھائی نہ تھا اسی طرح حمیرہ کا بھی صرف ایک بھائی تھا جو کہ لندن میں آباد تھا وہ مہینہ بھر پہلے ہی حمیرہ سے ملنے آیا تھا۔

دونوں کی فیملیز چھوٹی سی تھیں اور حمیرہ کے لئے آج کل یہ فکر مندی کی علامت تھی، غزالہ باجی تو خود نانی تھیں شازیہ ان کی ایک بیٹی تھی اور ارسلان بیٹا تھا، شازیہ کی شادی ہو چکی تھی جبکہ ارسلان ابھی کنوارا تھا۔

جب سے وہ گھر آئی تھی گھر کی حالت دیکھ کر وہ پریشان رہنے لگی تھی، ابھی صرف ایک ماہ رہ کر گئی تھی تو گھر کی حالت خراب ہو گئی تھی۔

"نوکروں کے اوپر کام ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" غزالہ باجی نے اسے کہا تھا جب اس نے ذکر کیا تھا ماسی کا تو۔

غزالہ باجی نے ایک آدھ بار چکر لگایا تھا مگر جس طرح حمیرہ گھر کی صفائی ستھرائی کراتی تھی وہ بات غزالہ باجی میں نہیں تھی۔

حمیرہ شروع ہی سے بہت Active تھی چاہے گھر کے معاملات ہوں یا بچوں کے، اگرچہ ٹیچر لگوایا ہوا تھا بچوں کی ٹیوشنز کے لئے مگر پھر بھی وہ خود روزانہ ان کا ہوم ورک چیک کرتی تھی مالی لان کے لئے آیا تو سر پہ کھڑی ہو کر کام کراتی، ماسی سے کونے کھدرے تک اچھے سے صاف کراتی۔

اسے صاف ستھرے گھر سے عشق تھا، گھر صاف ہو، کرینے سے سجا ہو پھولوں سے بھرا ہو اسے بہت اچھا لگتا تھا، وہ اپنے گھر کو جنت کہتی تھی اور اسے جنت جیسا بنانے میں بھی لگی رہتی تھی۔

مگر ہاسپٹل سے واپسی پر اسے حقیقی دکھ ہوا تھا، گھر ابتر ہو رہا تھا، آج اسے آئے چوتھا دن تھا اب اس میں پہلے جیسی ہمت نہیں رہی تھی کہ ماسی کے پر پہ کھڑے ہو کر کام کرائے، بچوں کو وقت دے وہ بس پڑی رہتی تھی۔

دماغ اس کا عجیب الجھنوں میں الجھا ہوا تھا، ایسا کیسے چلے گا میرے بعد کیا بنے گا میرے شوہر، بچوں اور گھر کا، وہ گھر جس کو میں نے اتنی محبت سے سینچا ہے، وہ گھر جس کو اپنی زندگی کے گیارہ سال دیئے ہیں جب اس کی شادی ہوئی تو وہ چوبیس سال کی تھی اور اب وہ پینتیس کی ہونے لگی تھی، کتنی مختصر ہے ناں میری زندگی شاید پینتیس سال اور کچھ دن۔

وہ کمرے میں لیٹی سامنے تصویر کو گھور رہی تھی، جبکہ دماغ کی سوچیں پھر سے منتشر تھیں، ایک سوال اسے بے چین کیے ہوئے تھا، کہ میرے بعد کیا ہوگا؟ وہ بہت فکر مند تھی دماغ پر مسلسل زور دینے کی وجہ سے وہ دکھنے لگا تھا، پھر اچانک اس نے لیپ ٹاپ جو سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا اٹھایا اور کھول کر سرچ کرنے لگی، کہ اس کے پاس کتنا وقت بچا ہے، وہ اپنی بیماری کے متعلق جاننے لگی اور گہرائی سے۔

☆☆☆

آج کل اس کی حالت میں سدھار کی بجائے بگڑاؤ بڑھتا جا رہا تھا اور یہ بات نعمان کے

لئے تشویش ناک تھی، وہ مسلسل اسے لے کر فکر مند تھا کیونکہ وہ حمیرہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا، وہ بہت چاہتا تھا اسے اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا صرف اسی کے بارے میں سوچا تھا وہ اس کی خالہ زاد تھی، اس کی امی اور حمیرہ کی امی دو ہی بہنیں تھیں۔

دونوں کا پیار اور سلوک مثالی تھا لہٰذا جب نعمان کا رشتہ گیا تو بغیر کسی حیل وحجل کے قبول کر لیا گیا، حمیرہ کو پانے کے بعد وہ واقعی اپنے آپ کو قسمت والا سمجھتا تھا اس میں ہر وہ خوبی تھی جو کسی بھی مرد کو اپنے جیون ساتھی میں چاہیے ہوتی ہے، وہ سلیقہ شعار تھی چاہنے والی تھی، اچھی بیوی تھی اور سب سے بڑھ کر وہ ایک اچھی ماں تھی۔

وہ مسلسل لان میں چکر لگا رہا تھا اور ساتھ میں سگریٹ کے دھوئیں کو فضا میں چھوڑ رہا تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ کچھ دنوں سے حمیرہ کو کوئی بات مسلسل پریشان کر رہی تھی، کیا؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا، اس نے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گئی تھی۔

☆☆☆

آج اس نے بڑی مشکلوں سے ماسی کے سر پہ کھڑے ہو کر گھر صاف کرایا تھا، ابھی وہ گیراج کی صفائی سے فارغ ہوئی تھی پھر ادھر ہی کرسی پر بیٹھ کر سستانے لگی۔

''السلام علیکم مسز نعمان!'' سسٹر چیک اپ کا سامان لے کر آئیں اور کرسی کھسکا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''وعلیکم السلام سسٹر!'' اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''ماسی پلیز ہم دونوں کے لئے چائے لے آئیں۔'' حمیرہ نے آواز دی۔

''لائیں آپ کا روٹین چیک اپ کر لوں۔'' وہ بی پی چیک کرنے لگی۔

''آپ نے کبھی اپنے بارے میں بتایا نہیں شائستہ۔'' حمیرہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولی، کالی گہری آنکھیں اس کے اوپر کمان کی مانند بھنوئیں، ناک نسبتاً موٹا تھا جبکہ ہونٹ پتلے تھے۔

''کیا؟'' بھنوئیں اچکائے پوچھا۔

''اپنے بارے میں اپنی فیملی کے متعلق۔'' وہ ابھی بھی متوجہ تھی، وہ مسکرائی۔

''میری کہانی تو عام سی ہے میرے بارے میں کیا جاننا۔''

''بھئی آپ عام سی ہی سنا دیں۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

''ضرور۔'' وہ کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''ہم چار بہن بھائی تھے، والد کی وفات بچپن میں ہی ہو گئی تھی، امی نے گھر کو اچھے سے چلانے کی کوشش میں زندگی گزار دی، میرے بھائی بڑے تھے جبکہ بہن چھوٹی، گزر بسر بس گزارا ہی تھا، میری بہن دس سال کی تھی تو اس کی وفات ہو گئی۔'' لہجہ ایک دم بجھ گیا۔

''میٹرک میں آئی تو والدہ کا انتقال ہو گیا، اپنے بل بوتے پر گریجویشن مکمل کیا اسی دوران بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں، جب محسوس ہونے لگا کہ بھابھیوں کو بوجھ لگنے لگی ہوں تو اپنے لئے کچھ فیصلے لے لئے اور بس نرس کا کورس کیا اور ہسپتال کے ہاسٹلز میں شفٹ ہو گئی، عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کو، اب بھائی بھی خوش اور میں بھی پرسکون عید شب برات پر مل لیتی ہوں ان سے۔'' آخر میں لہجہ تلخ ہو گیا، اتنے میں ماسی چائے لے آئی۔

''لیجئے۔'' حمیرہ نے اشارہ کیا۔

''شکریہ۔'' اس نے کپ تھامتے ہوئے کہا چہرے پر اداسی واضح تھی، جسے حمیرہ نے محسوس کیا۔

''شادی نہیں کی آپ نے؟'' لہجہ ٹٹولتا تھا۔

''نہیں، کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ شادی کر لوں۔'' وہ دقت سے مسکرائی۔

''ہوں۔'' حمیرہ کپ کے اوپر بھاپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ سے ایک بات پوچھوں اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو۔'' سسٹر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''جی ضرور۔'' حمیرہ مسکرائی۔

''آپ کو کینسر جیسی خطرناک بیماری ہے اور میں نے آپ کی ہسٹری دیکھی ہے آپ کی تشخیص آخری سٹیج پر ہوئی میرے لئے یہ حیران کن ہے، کیونکہ اس مرض کی تکلیف کافی ہوتی ہے۔'' حمیرہ نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، میرے کافی عرصے سے پیٹ میں درد رہتا تھا۔'' پھر خاموش ہو گئی اور لان کو دیکھنے لگی جہاں پودے ہوا کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھے، دائیں جانب کونے میں موتیے کا بڑا سا پودا تھا جس پر ڈھیروں پھول تھے، اس کے ساتھ ہی رات کی رانی تھی، مشرق کی جانب کونے میں بڑا سا لیموں کا پودا تھا جہاں کچے لیموں لٹک رہے تھے، دیواروں کے ساتھ کیاریاں بنی تھی جہاں موسمی پودے لگے تھے، گیراج کے پلر کے ساتھ بوگن ویلیا کی بیل چڑھ رہی تھی اور دیوار کے ساتھ دوڑیاں باندھ کر منی پلانٹ لگایا گیا تھا، لان چوڑائی میں تھا درمیان میں دو کرسیاں پڑی تھیں۔

طویل خاموشی کے بعد وہ بولی۔

''میں اپنے پیٹ درد کی وجہ کبھی گیس سمجھتی تھی تو کبھی لگتا کہ شاید سمک کا مسئلہ ہے، قریبی ڈاکٹر سے دوا لے آتی تو وقتی آرام مل جاتا، تو کبھی ٹوٹکے آزماتی رہی، مجھے شروع ہی سے ڈاکٹرز سے بہت ڈر لگتا تھا، جب بھی نعمان مکمل چیک اپ کا کہتے میں ٹال جاتی۔'' وہ طنزیہ مسکرائی۔

''پھر جب درد بڑھنے لگا تو مجھے لگ کہ شاید السر ہے معدہ کا، نعمان نے سختی سے کہا کہ اب بس مکمل چیک اپ ہو گا، ڈاکٹر کے پاس گئی تو کچھ ٹیسٹ ہوئے اور جب رپورٹ ہاتھ آئی تو بہت دیر ہو گئی تھی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''مجھے افسوس ہوا مسز نعمان۔'' شائستہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

''ہوں۔'' وہ نرمی سے آنسو صاف کرنے لگی۔

☆☆☆

ابھی ابھی وہ بچوں کے ساتھ ٹائم گزار کر کمرے میں آئی تھی کہ اچانک اس کا دل خراب ہونے لگا متلی آنے لگی اور سر چکرانے لگا، وہ بڑی مشکلوں سے واش روم تک گئی، اس نے منہ بھر کر خون کی الٹی کی۔

''مطلب وقت اب قریب ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''حمیرہ! تم واش روم میں ہو۔'' نعمان کی آواز آئی۔

''جی...... جی......'' اس نے جلدی سے سنک صاف کیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی، پھر دوپٹے سے منہ صاف کیا اور باہر آ گئی۔

''جی کیا بات ہے؟'' وہ مسکرائی اور پلکیں جھپکے بنا اسے دیکھنے لگی۔

''ہم باہر چل رہے ہیں کھانا کھانے۔'' اس نے کہا اور الماری سے کچھ نکالنے لگا، پلٹا تو وہ اسی حالت میں کھڑی تھی۔

''کیا بہت اچھا لگ رہا ہوں آپ کو جناب۔'' وہ شوخ ہوا تو حمیرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اب تو مہلت بھی ختم ہونے کو ہے نعمان،

میں اپنی آنکھوں میں آپ کو محفوظ کر لینا چاہتی ہوں ہمیشہ کے لئے۔" وہ دل میں بولی لب ہنوز بند تھے، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"چلو پھر آج میں بھی آپ کو گھورتا ہوں کیونکہ آپ مجھے بھی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" وہ اسے کندھوں سے تھام کر بولا اور پاس پڑے صوفے پر بٹھا دیا۔

اس کا چہرہ بالکل مرجھا گیا تھا، وہ آنکھیں جو کبھی ہرنی کی طرح تھیں اب گڑھوں میں پڑی معلوم ہوتیں تھیں، گال جو کبھی روئی کے گالوں کی طرح تھے پچک گئے تھے، ہونٹ جو کبھی تر و تازہ گلاب کی طرح لگتے تھے اب بالکل مرجھا گئے تھے، رنگ جو کبھی صبح کی پاکیزہ روشنی لگتا تھا اب شام کی طرح ڈھل گیا تھا، مگر اب بھی نعمان کو وہ پہلی جیسی ہی لگتی تھی، شاید وہ قبول نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ بدل گئی ہے۔

"مجھے بھول تو نہیں جائیں گے نعمان۔" سوال اچانک کہا گیا تھا۔

نعمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں برسات کی واضح دھمکی تھی۔

"تمہیں بھول گیا تو جیوں گا کیسے؟" نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"تم میری زندگی ہو حمیرہ، تم یہ بات جانتی ہو تمہیں کھو دینے سے سب سے زیادہ میں ڈرتا ہوں، شاید تم بھی اتنا نہیں ڈرتی۔" حمیرہ اس کے سینے سے آ لگی اور وہ بندھ جو اس نے باندھ رکھا تھا آنسوؤں کے سمندر پس وہ ٹوٹ گیا، نعمان کی آنکھیں بھی پر نم تھیں۔

"ماما، پاپا چلو نا میں کب سے تیار ہوں۔" فریحہ اچانک کمرے میں آ گئی، تو وہ دونوں سنبھلے۔

"ہاں بھئی چلو، پاپا بھی کب سے تیار ہیں بس ماما ہی دیر کر رہی ہیں۔" وہ سارا الزام حمیرہ پہ ڈال گیا۔

حمیرہ کی حالت غیر ہو رہی تھی مگر وہ برداشت کر رہی تھی اپنے پیاروں کی خوشی کے لئے۔

"تم ٹھیک نہیں ہو تو آرام کرو پلیز، ہم نہیں جاتے۔" نعمان نے اس کے چہرے کے بدلتے زاویوں کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں میں ٹھیک ہوں چلیں پلیز۔" وہ مضبوط بن کر دکھانے لگی۔

"اوکے چلو۔" وہ مطمئن نہیں تھا مگر خاموش رہا۔

"آپ بھی چلیں سسٹر۔" نعمان نے دعوت دی شائستہ کو جو حمزہ کو تیار کرنے میں لگی تھی، حمیرہ نے سسٹر کو غور سے دیکھا۔

"واقعی یہ میرے گھر کے لئے اور بچوں کے لئے درست فیصلہ ہوگا۔" وہ پچھلے کئی دنوں سے جس کشمکش تھی اس کا جواب اسے مل گیا تھا۔

"نہیں بھئی مجھے تو نیند آ رہی ہے آپ لوگ جائیں انجوائے کریں۔" انداز معذرت خواہ تھا، اس نے حمزہ کی ناک کھینچی، جیسے حمیرہ اکثر کھینچتی تھی پیار سے۔

"مسز نعمان یہ ٹیبلٹ آپ ضرور لے لیجئے گا اوکے۔" وہ دوائیوں کا پتہ اس کے سامنے کر کے بولی۔

"تھینک یو سسٹر۔" حمیرہ نے تھام لیا اور پھر وہ چلے گئے۔

☆☆☆

گھر میں مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کبھی کوئی رشتے دار عیادت کو آ جاتا تو کبھی نعمان کے دوست اور ان کی فیملیز، حمیرہ اور نعمان کا سوشل سرکل کافی وسیع تھا، وہ لوگوں سے گھلا ملا کرتے تھے اسی وجہ سے لوگ بھی آئے دن آتے رہتے

تھے، حمیرہ لوگوں سے مل کر اکتانے لگی تھی، اس کی طبیعت تیزی سے خراب ہو رہی تھی اور صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔

ابھی ابھی وہ اپنے بھائی جان کا فون سن کر فارغ ہوئی تھی، اس سے پہلے پڑوس کی مسز شبیر آئی تھیں اور اس سے پہلے غزالہ جی اور ان کا بیٹا ارسلان آئے تھے ساتھ میں غزالہ باجی کی نند نبیلہ تھی جو ابھی کنواری تھی، وہ کافی تھکن محسوس کر رہی تھی وہ بیڈ پر دراز ہوئی تو نیند کا شائبہ تک آنکھوں میں نہ آیا حالانکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ اب وہ کچھ دیر سو جائے، سسٹر نے اسے دوا بھی دی تھی اس سے بھی کوئی خاص بہتری نہیں آئی تھی، پیٹ میں بلا کا درد تھا مگر سوچیں منتشر تھیں، وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ کیا کرے، وہ اپنے بچوں کو محفوظ ہاتھوں میں دے کر جانا چاہتی تھی، جو ٹھیک سے پرورش کر سکے، خاندان میں کوئی نہ تھا جو اس کے گھر آ کر رہتا، صرف ایک ہی خیال اس کے ذہن میں ابھرا، ہاں یہ بھی سب سے بہتر راستہ ہے، آج ہی بات کروں گی نعمان سے۔

رات اس کی حالت خراب ہو گی اسے پھر سے خون کی الٹی ہوئی تھی، وہ نڈھال سی بستر پر پڑی تھی اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی اور آنکھیں بس برسنے کو تیار تھیں، نعمان جب سونے کے لئے آیا تو اس نے ہمت کر کے بولا۔

"نعمان!" آواز دھیمی اور کمزور تھی۔

"ہاں بولو۔" وہ بیڈ پر دراز ہوا۔

وہ سامنے لگی تصویر کو دیکھنے لگی اور الفاظ ترتیب دینے لگی، جو بھی تھا اسے یہ کہنا ہی تھا اور وہ بھی اب کیونکہ وقت بہت کم تھا، وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔

"ہر مرنے والے سے اس کی آخری خواہش پوچھتے ہیں، کیا آپ مجھ سے نہیں پوچھیں گے۔" نعمان نے حیرانی سے اسے دیکھا جو سامنے تصویر میں کھوئی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے حمیرہ میں نوٹ کر رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو۔" وہ اس کی طرف مڑا۔

"کوئی بات نہیں ہے میں نے جو پوچھا ہے وہ بتائیں۔" وہ بنا مڑے بولی۔

"کیا آپ میری آخری، آخری خواہش نہیں جاننا چاہتے، لیکن پہلا وعدہ کریں کہ اسے پورا ضرور کریں گے۔" وہ اپنی طرف سے ہر فرار کا راستہ بند کر دینا چاہتی تھی نعمان کے لئے۔

کیونکہ وہ اچھے سے جانتی تھی کہ نعمان نہیں مانے گی، نعمان خاموش رہا اس نے اس کی خاموشی کو رضامندی گردانا اور بولی۔

"میری آخری خواہش یہ ہے کہ آپ میرے مرنے کے بعد......" نعمان کا پورا جسم سماعت بنا ہوا تھا وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا غم اسے اندر سے کھائے جا رہا ہے وہ خاموش تھا جبکہ حمیرہ نے توقف کیا، ایک لمبا سانس لیا اور پھر بولی۔

"میرے مرنے کے بعد آپ دوسری شادی کر لیجئے گا۔" آخرکار وہ ہمت کر کے بولی۔

"یہ میری آخری خواہش ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں جس سے بھی مناسب سمجھیں۔" ٹھا...... ٹھا...... نعمان کو لگا کہ آس پاس کوئی پٹاخے چلا رہا ہو۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو حمیرہ۔" وہ جھٹ سے بیٹھ گیا آنکھوں میں حیرانی کا سمندر موجزن تھا۔

"پلیز نعمان!" وہ مڑی۔

"پلیز میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔" وہ ہاتھ کے اشارے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سے بولی، نعمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں شدید کرب کی کیفیت تھی وہ بہت درد سے گزر رہی تھی صاف پتہ چل رہا تھا۔

''حمیرہ! تم جانتی ہو کہ یہ ناممکن ہے میرے لئے کہ میں تمہاری جگہ کسی اور کو دے دوں۔'' وہ نظریں چرا گیا وہ اس کی آنکھوں کی تاب کو ادا نہیں سہہ سکتا تھا۔

''دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے نعمان!'' وہ آنکھیں موند کر بولی۔

''آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کو آپ سے زیادہ چاہتی ہوں، اگر میں یہ فیصلہ کر سکتی ہوں تو آپ عمل بھی کر سکتے ہیں۔''

''لیکن حمیرہ......'' وہ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر حمیرہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''پلیز نعمان! آپ جانتے ہیں اچھے سے کہ میں مر رہی ہوں گنتی کی سانسیں ہیں میرے پاس اب۔'' آواز میں درد بھر آیا، مگر وہ پھر بھی ہمت سے بولی، جبکہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''ہم دونوں نے یہ گھر بہت پیار سے بنایا ہے، ہمارے بچے بہت چھوٹے ہیں ابھی، اس گھر کو میرے بچوں اور آپ کو بھی ایک عورت کی ضرورت ہو گی، اس گھر کو سنبھالنے والی کی ضرورت ہوے میرے بچوں کو ایک اچھی ماں کی ضرورت ہے اور آپ کو سہارے کی ضرورت پڑے گی نعمان، پلیز میری خواہش کی عزت کریں پلیز۔'' وہ التجاء کر رہی تھی جبکہ اس کے اندر طوفان کی سی کیفیت تھی۔

نعمان نے اس کا چہرہ دیکھا، ہو اب بھی ایک کوشش کر لینا چاہتا تھا، حالانکہ وہ اچھے سے جانتا تھا کہ اس طوفان کے آگے اس کی جھونپڑی کی کوئی بساط نہیں ہے مگر پھر بھی وہ ایک آخری کیل لگانا چاہتا تھا، اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''مان لو کہ میں شادی کر لوں گا مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آنے والی اچھی ماں ہو گی وہ سوتیلا پن نہیں دکھائے گی اور اس بات کا کیا بھروسہ ہے کہ آنے والی میری اچھی ہم سفر بن پائے گی اور میں خود۔'' وہ اپنی طرف انگلی کر کے بولا۔

''میں خود اسے اپنا پاؤں گا بچے اسے تمہاری جگہ دے پائیں گے، بتاؤ مجھے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی جہاں آنسو تیر رہے تھے، وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہ موقع گنوا دے، وہ اچھے سے جانتی تھی کہ نعمان کو راضی کرنا سب سے بڑا مرحلہ ہے، وہ ٹوٹ رہی تھی پھر بھی ہمت کر کے بولی۔

''ہر عورت میں ماں ہوتی ہے نعمان، یہ تو لوگ ہیں جو اسے سوتیلی بنا دیتے ہیں، فرض شناس عورتیں اپنے فرض کو بخوبی جانتیں ہیں نعمان، اب سسٹر شائستہ کو ہی لے لیں، وہ کتنے دن سے ہمارے ساتھ ہیں مگر وہ کبھی بھی غیر نہیں لگیں، بچے مانوس ہو گئے ہیں ان سے میری دیکھ بھال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں وہ لیکن ہماری پرائیوسی میں بھی دخل انداز نہیں ہوتیں کس قدر مکمل خاتون معلوم ہوتیں ہیں وہ، بچوں کو اگر پیار سے ہینڈل کیا جائے تو وہ سنبھل جاتے ہیں اور جہاں تک بات آپ کی ہے وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے، آپ بھی وقت کے ساتھ سنبھل ہی جاؤ گے، مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا اس نے آگے کا سفر اکیلے ہی کرنا ہوتا ہے۔''

نعمان اس کو سن رہا تھا وہ کس قدر بہادری سے بول رہی تھی اس کی ہر دلیل مکمل تھی اور نعمان کو اپنا دامن خالی لگ رہا تھا جہاں بولنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

''آپ کے پاس بہت سی Options ہیں نعمان۔'' وہ اسے خاموش دیکھ کر پھر بولی۔

''غزالہ باجی کی نند ہے، آپ کے دوست شبیر کی بہن ہے اور میرے خیال میں تو سسٹر شائستہ بھی ہیں اور بھی بہت سی لڑکیاں ہو گئیں جنہیں سہارے کی ضرورت ہے، اگر مناسب سمجھیں تو سسٹر شائستہ سے ہی شادی کر لیجئے گا، مجھے اپنے رب پر مکمل یقین ہے کہ وہ میری دعاؤں کو رد نہیں کرے گا۔'' وہ اپنے آنسو صاف کر کے بولی۔

''پلیز حمیرہ......بس کر دو۔'' وہ چڑ گیا اور اٹھ کر چلا گیا، نعمان کے جاتے ہی وہ مضبوط نظر آنے والی عورت ریت کی دیوار کسی طرح ڈھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''آپ نہیں جانتے نعمان میں نے دل پر کتنا بڑا پتھر رکھ کر آپ سے یہ بات کی ہے، میں کتنی تکلیف میں ہوں آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک عورت کے لئے کس قدر کٹھن امر ہوتا ہے اپنے حصے کی خوشیاں کسی اور کی جھولی میں ڈال دینا، اپنی جنت کی چابی کسی اور کو تھما دینا، میری تکلیفوں کو اور نہ بڑھائیں پلیز نعمان۔'' وہ چہرہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر سسکیوں سے رو رہی تھی۔

''وہ مجھ سے اتنی بڑی خواہش کیسے کر سکتی ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں یہ پوری نہیں کر سکتا۔'' وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا اور مسلسل گیراج میں چکر لگا رہا تھا، رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا شاید آخری پہر تھا، اس کا دماغ بالکل ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

کتنی امیدوں سے کتنی مشکلوں سے اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے مگر، میں کیا کروں اس کے علاوہ نہ کبھی کسی کا تصور کیا اور نہ کر سکوں گا، میرے خدا کیا کروں، وہ آسمان پر نظر جما کر بولا جہاں چاند ڈوبنے کو لگا۔

☆☆☆

آج صبح ہی سے وہ بہت نڈھال تھی، رات بھر رونے کے باعث آنکھیں سوج گئیں تھیں جبکہ سر چکرا رہا تھا، وہ بہت مشکل سے اٹھی اور پیپر اور پین لے کر کرسی پر جا بیٹھی، نعمان کمرے میں آیا تو وہ الماری میں کچھ رکھ رہی تھی۔

''کیا رکھ رہی ہو تم؟'' وہ متوجہ تھا۔

''جس سے شادی کریں نا آپ اسے دے دیجئے گا یہ، میری طرف سے۔'' وہ دیکھے بغیر چور بنی ہوئی بولی۔

''حمیرہ پلیز، ایسی باتیں مت کرو۔'' وہ اسے کندھوں سے تھام کر بولا۔

''یہ میری آخری خواہش ہے نعمان جو آپ کو ماننا ہی ہو گی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی جہاں امید تھی کہ وہ مان جائے گا۔

''مجھ سے وعدہ کریں نعمان وعدہ کریں کہ میرے جاتے ہی جس قدر جلد ممکن ہو آپ شادی کر لیں گے، وعدہ کریں۔'' حمیرہ کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر تھے جہاں سے اس کے دل کی دھڑکن حمیرہ محسوس کر سکتی تھی۔

نعمان نے سر جھکا لیا، اس نے اپنی ہار تسلیم کر لی اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔

☆☆☆

ابھی وہ چند لمحے پہلے ہی لیٹی تھی کہ اس کے پیٹ میں درد پھر سے شروع ہو گیا وہ تڑپنے لگی ساتھ ہی دل گھبرانے لگا، وہ بستر پر بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی جب سسٹر کمرے میں آئیں، وہ اسے دیکھ کر فوراً لپکی اور اسے سنبھالنے لگی۔

''ماسی ماسی جلدی آؤ۔'' اس کے ہاتھ تیزی

سے کام کر رہے تھے اور وہ حمیرہ کو انجکشن دے رہی تھی۔

"نعمان...... سسٹر نعمان۔" حمیرہ کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔

"ریلیکس مسز نعمان ریلیکس۔" وہ اسے تسلی دینے لگی، ماسی بھی دوڑی چلی آئی اور ساتھ میں بچے بھی سسٹر کی آواز سن کر آ گئے۔

"ماسی پلیز ادھر بیٹھو میں ایمبولینس منگواتی ہوں اور نعمان صاحب کہاں ہیں۔"

"باجی وہ تو باہر نکلے ہیں۔" ماسی حمیرہ کو سنبھالتے ہوئے بولی جو بے چین تھی، دونوں بچے دروازے کے ساتھ کھڑے عجیب حالت میں اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان کی ماں کیوں یوں تڑپ رہی ہے۔

حمیرہ گردن موڑے اپنے بچوں کو دیکھ رہی تھی حسرت سے، وہ بولنا چاہ رہی تھی مگر الفاظ منہ سے ادا نہیں ہو رہے تھے، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

سسٹر ابھی فون کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ نعمان بھی آ گیا، سسٹر کے چہرے پر تشویش دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

"شکر ہے آپ آ گئے سر، مسز نعمان کو ہاسپٹل لے کر جانا ہو گا جلدی، ان کی حالت خراب ہو گئی ہے۔" وہ دونوں تیزی سے اندر بڑھے جہاں وہ اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کی انتڑیوں کو مروڑ رہا ہو، اسے اپنا جسم بے جان ہوتا محسوس ہو رہا تھا، سانسیں سینے میں اٹک رہی تھیں آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

"حمیرہ پلیز ہمت کرو۔" نعمان کی اپنی عجیب حالت تھی، وہ اسے اٹھانے لگا تو حمیرہ نے روک لیا، اس نے نعمان کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

"نعمان بچے۔" الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔

"خیال رکھنا۔" سانسیں ٹوٹنے لگیں۔

"اللہ۔" آخر میں اس کے منہ سے ادا ہوا اور پھر روح کا اور جسم کا ساتھ ٹوٹ گیا جسم بے جان ہو گیا، سسٹر نے بڑھ کر چیک کیا، مگر بے سود، نعمان آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔

"پاپا...... ماما کو کیا ہوا ہے۔" فریحہ ڈرتے ڈرتے پاس آئی۔

نعمان بس چپ چاپ دیکھ رہا تھا حمیرہ کو، جبکہ آنکھیں خشک تھیں، سسٹر نے نرمی سے فریحہ کو نعمان سے جدا کیا اور پیچھے لے گئی، سب کی آنکھیں نم تھیں۔

☆☆☆

فریحہ کو گزرے دو مہینے ہونے کو آئے تھے، اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ زندہ ہے، جی رہا ہے، اسے لگتا تھا کہ وہ حمیرہ کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتا، مگر وہ ٹھیک کہتی تھی مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا، وہ بھی جی رہا تھا۔

غزالہ باجی اکثر آتی تھیں وہ گھر کا اور بچوں کا دھیان کر لیتی تھیں، آج سنڈے تھا تو وہ گھر پر ہی موجود تھا، بچے باہر کھیل رہے تھے اسے آوازیں آ رہی تھیں، غزالہ باجی آئیں تو اسے اس کے کمرے میں پایا جہاں وہ سامنے لگی تصویر کو مسلسل گھور رہا تھا، کمرے کی حالت ابتر ہو رہی تھی، شکن زدہ بیڈ اور شکن زدہ وہ خود، چیزیں بکھری ہوئیں، سگریٹ کا دھواں کمرے میں موجود تھا، وہ شاید صبح سے سگریٹ پی رہا تھا، داڑھی بڑھی ہوئی، گندے کپڑے ہو رہے تھے

جیسے کئی دن سے بدلے ہی نہ ہوں، ان کا جی خراب ہو گیا، یہ ہی حمیرہ ہوتی تھی تو گھر مہک رہا ہوتا تھا وہ نعمان کو ایسے دیکھ لیتی تو کتنا ڈانٹتی وہ اسے۔

"نعمان میرے بچے تجھے کیا ہو گیا ہے، اپنی حالت دیکھو تو۔" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"کیا ہوا باجی زندہ ہوں۔" لہجہ یک دم بجھا ہوا تھا۔

"اسے زندہ ہونا ہی کہتے ہیں جینا نہیں۔" وہ رو دیں۔

"میں مانتی ہوں کہ حمیرہ کے جانے کا اثر سب سے زیادہ مجھ پر ہوا ہے مگر میرے بھائی زندگی تو ابھی چل رہی ہے ناں، اپنا نہیں تو اپنے بچوں کا خیال کر، ماسی کے سر پر چھوڑ رکھا ہے تو نے تو اپنا گھر، وہ تو ہفتے بعد چکر لگا لیتی ہوں میں تو ماسی ذرا کام کر لیتی ہے مگر چندا اس طرح ملازموں کے سر پر نہیں چھوڑا جاتا سب کچھ، ابھی تیرے بچے چھوٹے ہیں ان کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا، میں مانتی ہوں کہ گھر عورت سے چلتا ہے مگر پھر بھی تم کچھ تو خیال کرو، اپنے کمرے کا ہی حال دیکھ لو تم کس قدر گندا اور بے ترتیب ہو رہا تھا تو پورا گھر کتنا بے ترتیب ہو رہا ہو گا۔" وہ افسوس سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"میری مان بھائی تو شادی کے متعلق غور کر۔" انہوں نے آخر کو اپنے دل کی بات کر دی۔

"میری خواہش نعمان۔" پاس ہی کہیں حمیرہ کی بھی آواز گونجی، اسے لگا شاید حمیرہ نے ہی باجی کو بھی کہا ہو گا مگر خاموش رہا۔

☆☆☆

زندہ رہنے کی چاہ عجب بجھ سی گئی تھی اس کے اندر حمیرہ کے جانے کے بعد سب کچھ گڈمڈ ہو گیا ہو جیسے، خوشی جیسے روٹھ گئی ہو اور غموں نے جیسے ڈیرہ ڈال لیا ہو، وہ بس گھر میں پڑا رہتا تھا، آفس بھی کئی دنوں سے نہیں جا رہا تھا، بچوں پر بھی توجہ دینا چھوڑ دیا تھا، اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا، غزالہ باجی ہی تھیں جو اکثر آ کر سمجھاتیں تھیں، وہ باتوں ہی باتوں میں اسے شادی کا کہتی تھیں اور ساتھ ہی لڑکیاں بھی بتائیں، کبھی اپنی نند نبیلہ کے گن گانے لگتیں تو کبھی حمیرہ کی منہ بولی خالہ جو اس کے کپڑے سلائی کرتیں تھیں ان کی بیٹی کی تعریف کرنے لگتیں، وہ بس چاہتیں تھیں کہ نعمان اپنی زندگی کو پھر سے ڈگر پر لے آئے، ایک وہ ہی تھا جو بس خاموش تھا، جو چپ سادھے حمیرہ کی یادوں کو سینے سے لگائے پڑا رہتا تھا۔

آج بھی وہ ابھی بس آوارہ گردی کر کے باہر سے آیا تھا کہ سامنے بچے پڑھ رہے تھے، وہ سلام کر کے کمرے میں چلا گیا، کچھ ہی دیر بعد حمزہ کمرے میں آیا اسے بلانے کہ ٹیچر بلا رہے ہیں، تو وہ اٹھ کر ٹیچر سے ملنے کو چل پڑا۔

"جی سر!" وہ باادب بولا۔

"مسٹر نعمان! یہ دیکھیں۔" انہوں نے دونوں بچوں کے رزلٹ کارڈز آگے رکھ دیئے، نعمان نے خاموشی سے اٹھا لئے، دونوں کے رزلٹس خراب آئے تھے۔

"میں اکثر بات کرنا چاہتا تھا آپ سے مگر آپ Available نہیں ہوتے تھے۔" ستائیس اٹھائیس سال کا نوجوان بہت تحمل سے بات کر رہا تھا، وہ نعمان کی ذہنی حالت کے پیش نظر الفاظ کے چناؤ کا خاص خیال کرتے ہوئے بولا۔

بچے تقریباً فیل تھے ٹیسٹ میں، نعمان کو

افسوس ہوا کیونکہ اس کے بچے ہمیشہ سے پوزیشن ہولڈرز رہے تھے حمیرہ کے ہوتے ہوئے۔

”بچے پڑھائی پر دھیان نہیں دے پا رہے سر!“ وہ بولا۔

”جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انہوں نے بہت کم سکور گین کیا ہے اپنے ٹیسٹ میں، آپ نے شاید ان پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے یا پھر بہت ہی کم توجہ دے پا رہے ہیں، جبکہ آپ کی مسز بچوں کی پڑھائی کو لے کر کافی دلچسپی شو کرتی تھیں، وہ باقاعدہ میرے ساتھ بیٹھ کر ان کی سٹڈی پر بات چیت کرتی تھیں۔“ وہ خاموش ہوا اور نعمان کو دیکھا جو دونوں بچوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو سر جھکائے سامنے بیٹھے تھے۔

”آپ کے بچے ابھی کافی چھوٹے ہیں انہیں اس عمر میں والدین کی نگرانی کسی اشد ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام آپ کی مسز بخوبی سر انجام دیتی تھیں، ان کے جانے کے بعد اب یہ کام ادھورا ہے میں نے اپنی طرف سے مکمل کوشش کی ہے مگر شاید بچے بھی ماں کی کمی کو بہت بری طرح فیل کر رہے ہیں اور آپ بھی شاید توجہ نہیں دے پا رہے، یہ تو چلو Monthly test تھے مگر ان کے فائنل پیپرز آنے والے ہیں اگر یہ ہی کنڈیشن رہی تو ان کا یہ سال ضائع بھی ہو سکتا ہے، پلیز تھوڑی توجہ اور محبت درکار ہے آپ کے بچوں کو آپ کی، آپ اسے میری Request سمجھ لیں سر۔“ وہ چشمے درست کر کے بولا۔

”پلیز محسن صاحب آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔“ وہ اس کے ٹیچر سے مخاطب ہوا۔

”I am exteramly sorry میں واقعی لاپرواہ ہو گیا ہوں حمیرہ کے جانے کے بعد اس نے ساری ذمہ داریاں ایسے سنبھالی ہوئیں تھیں کہ مجھے احساس ہی نہیں ہونے دیتی تھی، بیماری کے باوجود پوری کوشش کرتی تھی، میں واقعی شرمندہ ہوں اب میں پوری کوشش کروں گا کہ بچوں کو بھرپور توجہ دوں اور فریحہ اور حمزہ بھی اب دل لگا کر پڑھیں گے اوکے۔“ وہ بچوں کو دیکھ کر بولا۔

”جی پاپا!“ دونوں کی شرمندہ سی آواز آئی۔

☆☆☆

وہ ابھی بچوں کو سلا کر آ رہا ہے، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیسے اپنے اور حمیرہ کے بچوں سے لاپرواہ ہو گیا تھا، وہ کمرے میں بڑے مردہ قدموں سے داخل ہوا، اسے لگا جیسے سامنے بیڈ کے دوسرے کنارے حمیرہ بیٹھی ہو اور شکوہ لئے آنکھوں میں اسے دیکھ رہی ہو، کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی ہی تھی صرف۔

”حمیرہ!“ وہ بے ساختہ بولا۔

”میرے بچوں کا خیال نہیں رکھا آپ نے نعمان۔“ وہ بولی۔

”حمیرہ تم ہی ہو؟“ اسے یقین نہ ہوا۔

”میرا کہا بھی نہیں مانا نا آپ نے۔“ وہ بنا جواب دیئے بس بولے جا رہی تھی، سفید رنگ کے موتیوں سے بھرے جوڑے میں چہرہ دوپٹے کے حالے میں لئے وہ بالکل حور لگ رہی تھی، کتنی پاکیزہ، بالکل کانچ کی گڑیا لگ رہی تھی، وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔

”میری خواہش کا احترام نہیں کیا آپ نے؟“ وہ پھر بولی۔

”حمیرہ تم یہاں ہو میرے پاس۔“ وہ اس کے اور پاس ہوا۔

”میری خواہش نہیں مانی آپ...... آپ نے مجھے ناراض کیا ہے نعمان، ناراض کیا ہے۔“

MOVEETA®
The Touch of Softness
Quality Tissue No More An Issue
نفاست اور سہولت موویٹا ٹشو کی بدولت
VIRGIN PLUS سے تیار کردہ پاکستان کا واحد پرنٹیڈ ٹشو پیپر
ایکسٹرا ملائم، ایکسٹرا حفظان صحت، ایکسٹرا سہولت!
جذب کرے آسانی سے صاف کرے روانی سے

MOVEETA
MOVEETA
MOVEETA
MODNAP
MOVEETA
MODNAP

Super Soft
زیادہ سہولت ... زیادہ نفاست
Perfumed Sandooq
دلآویز خشبو سے بھرپور ٹشو پیپر
Super Soft Roll
& Kitchen Roll
ضرورت بھی ... سہولت بھی
A PRODUCT OF K.B. TRADERS P.O. BOX 2223 KARACHI-74600 PAKISTAN
TEL : (021) 36602348 - 36623757 - 36609032 FAX : (+021) 36623513
visit : www.moveeta.com moveetatissuepaper@hotmail.com

وہ قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ قدم بہ قدم پیچھے جاتی جا رہی تھی۔

”رکو...... حمیرہ میری بات سنو...... رکو حمیرہ...... رکو۔“ وہ چلایا مگر وہ جاتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ دیوار میں گم ہو گئی۔

”حمیرہ!“ وہ چلایا جبکہ اسے روکنے کے لئے بڑھایا اس کا ہاتھ ہوا میں ہی رہ گیا۔

رات والے واقع کے بعد وہ بے چین ہو گیا تھا، آخر کار اس نے فیصلہ کیا اور اٹھ کے چلا گیا۔

☆☆☆

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کی گھر میں کبھی مالکن بن کر قدم رکھے گی، یوں تو وہ کافی بار یہاں آ چکی تھی بلکہ رہ چکی تھی مگر ایک ملازمہ کی حیثیت سے جو نوکری کرنے آئی ہو، وہ نعمان کے نقشے قدم پر چلتے ہوئے آگے بڑھی ہاتھ میں مختصر سا سامان لئے ہوئے۔

”ارے سسٹر شائستہ!“ فریحہ چہک کر آئی اور اس کے گلے لگ گئی۔

”کیسی ہو تم گڑیا؟“ وہ اس کا گال چوم کر بولی۔

”میں ٹھیک ہوں، ماما کے جانے کے بعد آپ بھی ہمیں بھول گئیں۔“ سات سالہ فریحہ معصومیت سے بولی۔

”ارے نہیں گڑیا شائستہ آنٹی آپ کو بھلا کیسے بھول سکتی ہیں، وہ بس تھوڑا بزی تھی بس۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”اچھا بتاؤ حمزہ کہاں ہے؟“ وہ بولتے ہوئے ارد گرد دیکھنے لگی۔

نعمان شاید اندر چلا گیا تھا جبکہ ماسی بھی نظر نہیں آ رہی تھی گھر کی حالت بھی کچھ ابتر سی تھی بکھری بکھری، نفاست کا عنصر غائب تھا، جو مسز نعمان کے ہوتے ہوئے ہوا کرتا تھا، اسے مسز نعمان کی شدت سے یاد آئی اور آنکھیں بھر آئیں۔

”حمزہ، ماسی کے ساتھ باہر گیا ہے سامان لینے۔“ فریحہ نے اس کا ہاتھ ابھی بھی تھاما ہوا تھا۔

”اوکے کوئی بات نہیں ہم انتظار کرتے ہیں۔“ وہ اسے چکار کر بولی۔

ابھی بھی وہ بچوں کو کھانا کھلا کر کمرے میں آئی تھی، مگر وہ دروازے پر ہی رک گئی، کمرے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں تھی بس کمی تھی تو اس کی جو اس کمرے میں بیٹھی سجتی تھی، وہ نپے تلے قدموں سے اندر آئی، بیڈ، صوفہ، قالین، پردے یہ سب کتنا پائیدار تھا اور انسانی زندگی، انسانی زندگی کتنی ناپائیدار ہے، سامان پڑا رہتا تھا مگر زندگی کا بھروسہ نہیں آج سانس ہے تو کل نہیں، اس نے آہ بھری اور دیوار پر لگی ان کی تصویر کے آگے کھڑی ہو گئی، اسے یہ تصویر گھر میں لگی سب تصویروں سے زیادہ پسند آئی تھی کس قدر مکمل تصویر تھی محبت کرنے والوں کی، وہ سوچا کرتی تھی۔

بائیس گھنٹوں میں صرف بائیس گھنٹوں میں زندگی کس قدر بدل گئی تھی، بائیس گھنٹے پہلے وہ سسٹر شائستہ ایک ہسپتال کی ملازمہ اور اب وہ شائستہ نعمان، اس گھر کی مالکن تھی دو بچوں کی ماں تھی۔

کل ہی نعمان اس سے ملنے ہاسپٹل آئے تھے اسے حیرانی ہوئی تھی کہ بھلا اب کیا کام، مگر انہوں نے اسے شادی کے لئے کہا تھا، جسے سن کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”میرا ہی انتخاب کیوں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”آپ میرا نہیں حمیرہ کا انتخاب ہیں شائستہ اور مجھے اس کے انتخاب پر مکمل یقین ہے۔“ جواب مختصر مگر تمام جمع تفریق لئے ہوا تھا۔

اور آج وہ اس کے کمرے میں موجود تھی، اسے یاد تھا کہ جب وہ پہلی بار اس گھر میں آئی تھی تو اس کے دل میں بھی خواہش آئی تھی کہ کاش اس کا بھی ایسا چھوٹا سا گھر مکمل گھر ہوتا ایسے ہی پیارے بچے اور جان نچھاور کرنے والا شوہر ہوتا، اسے نہیں معلوم تھا کہ کاتب تقدیر نے اس کی قسمت میں یہ ہی گھر لکھ دیا تھا۔

وہ اپنے ہی خیالات میں گم تھی کہ کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، اس نے پلٹ کر دیکھا تو نعمان نہ جانے کب سے اسے پیچھے کھڑا تھا۔

اس نے پہلی بار نعمان کو تفصیل سے دیکھا، چھ فٹ سے نکلتا قد، چوڑے شانے، بھرا ہوا جسم کا مالک انسان تھا، چہرے پر ایک سنجیدگی سی تھی البتہ آنکھیں شرارت سے بھری ہوئی معلوم ہوتیں تھیں، کالے سیدھے بال تھے جو ماتھے پر بکھر رہے تھے، کافی دنوں کی شیو تھی اس کی، وہ مسکرائی۔

”مجھے آپ کی یہ تصویر بہت پسند ہے۔“ وہ تصویر کی طرف اشارہ کرکے بولی۔

”ہوں واقعی یہ مکمل تصویر ہے ہماری۔“ وہ بھی مسکرایا۔

”آپ کو بچوں کے ساتھ گھلا ملا دیکھ کر سکون ہوا۔“ وہ ہاتھ پیچھے باندھ کر آواز میں نرمی لئے بولا۔

”بچے بہت پیارے ہیں ماشاء اللہ، وہ تو خود پیار سمیٹنا چاہتے ہیں۔“ وہ ہاتھوں کو مسل کر بولی نہ جانے کیوں اسے نعمان سے بات کرنا مشکل لگ رہا تھا، آج نعمان کی آنکھیں اسے بدلی بدلی لگ رہی تھیں یا شاید اس کا نعمان کو دیکھنے کا نظریہ بدل گیا تھا۔

”آپ اچھے سے جانتیں ہیں شائستہ کہ میرے لئے حمیرہ کیا ہے۔“ وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولا، جبکہ شائستہ کا پورا وجود سماعت بنا ہوا تھا۔

اس نے اپنے سامنے کھڑی عورت کو دیکھا، سر پہ دوپٹہ سجائے جس سے آدھا سر ڈھکا ہوا تھا، سر کی مانگ صاف نظر آ رہی تھی کالے سیاہ بال جو کہ آگے سے نکلنے کو بے چین تھے پھسل کر چہرے پہ آ رہے تھے، بیضوی چہرے پر ہرنی جیسی آنکھیں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا ہے، وہ میری زندگی میں آنے والی واحد عورت تھی، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے علاوہ کسی اور کو اپنی زندگی میں آنے دوں گا، مگر......“ وہ رکا پھر بولا۔

”مگر ضروری تو نہیں کہ جو انسان سوچے وہی ہو، آپ کو میں پوری ذمہ داری سے اس گھر میں لایا ہوں، مجھے کچھ وقت درکار ہو گا حالات کے مطابق ڈھلنے کے لئے، مجھے امید ہے کہ آپ سمجھیں گی۔“ وہ خاموش ہوا، شائستہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا بولے، لہٰذا چپ رہی۔

”یاد آیا۔“ وہ بولا اور الماری سے باکس نکال کر اس نے شائستہ کو دیا۔

”یہ حمیرہ نے آپ کے لئے دیا تھا۔“ وہ مسکرایا اور کمرے سے نکل گیا، شائستہ نے حیرت سے باکس کو دیکھا اور بیڈ پر رکھ کر اسے کھولنے لگی، باکس اور اندر سے طلائی زیورات کے سیٹ نکلے، ساتھ ہی ایک فوٹو البم، گھر کی چابیاں اور ایک خط نکلا، اس نے متجسس ہوتے ہوئے سب سے پہلے خط نکالا اور پڑھا۔

پیاری سوتن!

سدا آباد رہو اور خوشیاں سمیٹو

بہت ممکن ہے کہ ہم مل چکے ہوں اور عین ممکن ہے کہ کبھی ملاقات نصیب نہ ہوئی ہو، اب تم اس گھر کی مالکن کی حیثیت سے آ چکی ہو گی اس کے لئے مبارکباد، میں اپنا سب کچھ تمہارے پاس امانت رکھ کر جا رہی ہوں، میرے شوہر اب تمہارے ہیں، نعمان بہت پیار کرنے والے انسان ہیں، روٹھ جاتے ہیں مگر پیار سے مناؤ تو مان بھی جاتے ہیں مجھے یقین ہے کہ تم انہیں پیار سے اپنا بنا لو گی۔

میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ میرے بچے میری جان ہیں، مجھے خدا پر مکمل یقین ہے کہ تم ان کے لئے ایک بہت اچھی ماں ثابت ہو گی، بچوں کو اچھی تربیت دینا ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے، ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھے ہوتا دیکھنا، انہیں کامیابیاں ملتے دیکھنا ہر ماں کا خواب ہوتا ہے، مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ دیکھ پاؤں اسی لئے اپنے خواب تمہاری آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں، میرے بچے چھوٹے ہیں، نادان ہیں، اگر ان سے کوئی غلطی کوتاہی ہو جائے تو درگزر کر دینا اور ان کی اچھی تربیت کرنا، یہ میری تم سے التجاء ہے۔

شائستہ کی آنکھیں نم ہو گئیں، وہ نرمی سے آنسو صاف کر کے دوبارہ پڑھنے لگی۔

اس گھر کو میں نے اور نعمان نے بہت محبت سے سجایا ہے، اب تم ہی اس کی نگران ہو جو چاہو کرنے کے لئے آزاد ہو۔

مجھے یقین ہے کہ تم ایک اچھی بیوی، اچھی ماں ہو گی کیونکہ یہ خوبیاں تو عورت کا خاصا ہوتیں ہیں۔

میں دعا کرتی ہوں اپنے رب کے حضور کے تمہیں زندگی کی تمام خوشیوں سے ہمکنار کرے اور تمام نعمتیں عطا کرے، میری درخواست ہے کہ مجھے نعمان کی اور بچوں کی یادوں میں زندہ رکھنا اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

حمیرہ نعمان

شائستہ خط پڑھ کر خوب روئی، حمیرہ کی قدر اور عزت تو وہ پہلے بھی کرتی تھی مگر اب تو وہ اس کی گرویدہ ہو گئی، وہ واقعی ایک باہمت عورت تھی، محبت کرنا اور نبھانا وہ خوب جانتی تھی، جو اپنی سوکن کی خوشیوں کی دعا کرے اس کا دل اور ظرف کتنا بڑا ہو گا، وہ خط ہاتھ میں لئے ایک بار پھر ان کی تصویر کے آگے کھڑی تھی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں مسز نعمان کہ میں آپ کے خواب جو آپ نے بچوں کے، نعمان کے اور اس گھر کے حوالے سے دیکھے ہیں انہیں ضرور پورا کروں گی، میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کی امیدوں پر پورا اتروں، اب سے یہ گھر اور اس گھر کے مکین میرے ہوئے۔'' اس نے آنسو صاف کیئے۔

''بس میرے خدا مجھے اتنی ہمت و توفیق دینا کہ میں اپنے وعدے پر پوری اتروں اور اس گھر کو خوشیوں سے بھر دوں۔'' وہ عظم سے بولی۔

اس نے سچے دل سے اپنے رب سے دعا کی اور جو دعا رب سے دل سے کی جائے وہ کبھی رد نہیں ہوتی، آج سے اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا جہاں اس نے اپنے فرائض ادا کرنے تھے اور وہ ان سب کے لئے بالکل تیار تھی اک نئی امید و ہمت کے ساتھ۔

☆☆☆

ہما راؤ

READING
http://readingcom

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

یہ ساون کی پہلی بارش تھی، گھٹا ٹوپ اندھیرے اور سناٹے نے ایمن کے دل میں خوف سا پیدا کر دیا تھا، پنکی گہری نیند سوئی ہوئی تھی، رات کے دس بجنے والے تھے اور عامر ابھی تک گھر نہیں آیا تھا، اس کا موبائل بھی آف تھا، وہ آفس سے روزانہ پانچ بجے گھر آ جاتا تھا، ایمن نے آفس فون کیا تو معلوم ہوا، وہ آفس سے وقت پر نکل چکا ہے، ایمن بہت پریشان تھی، دل میں عجیب سے وسوسے اور اندیشے آ رہے تھے، وہ عامر کے خیریت سے گھر آنے کے لئے بہت سی دعائیں مانگ چکی تھی، اتنے میں عامر کی مخصوص بیل سن کے وہ بے صبری سے گیٹ کی جانب بھاگی۔

''شکر ہے، آپ آ گئے، میں کتنی پریشان تھی، اتنی دیر کیسے ہو گئی؟'' ایمن نے بے قراری سے پوچھا۔

''یار! ایک دوست کے ساتھ ڈنر کے لئے چلا گیا تھا، عامر و لاپرواہی سے کہتا کپڑے چینج کرنے چلا گیا، ایمن یونہی کھڑی رہی کچھ دیر بعد وہ آیا تو ایمن کو دیکھ کے چونک گیا۔'' اور جھنجلا کے پوچھا۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟''

''کھانا لاؤں؟'' ایمن نے دریافت کیا۔

''تمہیں بتایا ہے کے دوست کے ساتھ ڈنر پہ گیا تھا، اب پلیز مجھے تنگ مت کرو، میں تھک گیا ہوں، سونا چاہتا ہوں۔'' عامر بیڈ روم میں چلا گیا، ایمن اس کے رویے پہ حیران تھی، ان کی چار سالہ شادی شدہ زندگی میں ایسا پہلی بار ہوا تھا، کے وہ کھانا باہر کھا کے آیا تھا اور ایسا انداز؟ ایمن کو یقین نہیں آ رہا تھا، عامر نے اس سے اس طرح بات کی ہے، ایمن ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی، کھانا وہ ہمیشہ عامر کے ساتھ کھاتی تھی، سو کھانا کھانے کا ارادہ اس نے ملتوی کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایمن اور عامر کی شادی چار سال قبل بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی، عامر نے ایمن کو اپنے بھائی کی شادی میں دیکھا تھا اور پہلی نظر میں وہ ایمن کا اسیر ہو گیا تھا، ایمن بہت پیاری اور خوب صورت لڑکی تھی، لیکن سونے پہ سہاگہ اس کے بہترین اخلاق و کردار اور سیرت کے سب گرویدہ تھے۔

ایمن عامر کی دور کی کزن تھی، عامر ایمن سے پہلی مرتبہ ملا تھا، لیکن اپنے گھر والوں کی زبانی اکثر ایمن کی تعریفیں سنتا تھا، ایمن کو دیکھ کر وہ قائل ہو گیا تھا، وہ واقعی تعریف کے قابل تھی، ایمن نے اس کی نگاہوں کی تپش سے چونک کر اس کی طرف دیکھا، ایمن اگر خوب صورت تھی تو بلاشبہ عامر بھی کم نہیں تھا، ہینڈسم، ایجوکیٹڈ اور اعلیٰ اوصاف کا مالک تھا، عامر اب بھی دیدہ دلیری سے شرمندہ ہونے کی بجائے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا، ایمن کا دل زور سے دھڑکا تھا، دوسرے ہی لمحے وہ جھینپ کے کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

نجانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا ایمن باوجود کوشش کے اسے نظر انداز نہیں کر سکی تھی، حالانکہ وہ پہلا لڑکا نہیں تھا جس نے اسے یوں دیکھا تھا، یونیورسٹی، فنکشن، پارٹیز میں متعدد بار ایمن نے بہت سے لڑکوں کو اپنی تعریف کرتے دیکھا تھا، بہت سے مردوں کی نگاہوں میں اسے کے لئے ستائش ہوتی تھی، لیکن ایمن سب کو نظر انداز کر دیتی تھی، وہ اعلیٰ کردار کی مالک تھی، اس لئے دانستہ عامر کے سامنے آنے سے گریز کرتی، شادی ختم ہوتے ہی وہ اپنے گھر آ گئی تھی حالانکہ تمام کزنز کا اصرار تھا کے وہ کراچی پہلی مرتبہ آئی ہے، اس لئے سیر وتفریح کا پروگرام لازمی ہونا چاہیے، خود ایمن کو بھی سمندر دیکھنے کا بہت ارمان تھا، لیکن محض عامر کی نگاہوں سے بچنے کے لئے اس نے انکار کر دیا اور اسٹیڈیز کا بہانہ کر کے لاہور اپنے گھر لوٹ آئی۔

ایمن ایم اے فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی، ایگزم قریب تھے وہ دن رات پڑھائی میں مصروف تھی، ایسے میں اسے کبھی وہ آنکھیں ڈسٹرب کرتی تھی جن میں اس کے لئے محبت تھی، نجانے ان میں ایسی کیا بات تھی جو اسے تمام مردوں سے مختلف لگتی تھی، پھر وہ سر جھٹک کر دوبارہ پڑھائی میں مصروف ہو جاتی، جس دن وہ آخری پیپر دے کر اپنے گھر آئی، اس دن اپنے گھر خلاف توقع بنا کسی اطلاع کے عامر کی امی اور بہنوں کو دیکھ کر چونک گئی، عامر کی بہنوں سے چونکہ اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی، اس لئے حیرت خوشی میں بدل گئی تھی، ایگزم کی ساری تھکن مٹ چکی تھی۔

''ایمن! تم نے تو ہمیں سیر وتفریح کرانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا، لیکن ہم تمہیں یہ موقع ضرور فراہم کریں گے تاکہ تم ہمیں لاہور کی سیر کرا سکو۔'' حنا گھومنے پھرنے کی بے حد شوقین تھی۔

''کیوں نہیں میں تمہیں سارا لاہور دیکھاؤں گی۔'' ایمن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یار! اچانک تم لوگ محض لاہور کی سیر کرنے تو نہیں آئیں ہو گے؟'' ایمن سے چھوٹی ثمن سے مشکوک نظروں سے حنا ثنا کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''واقعی ہمارا مقصد سیر وتفریح نہیں ہے بات دراصل یہ ہے کہ عامر بھائی پہلی ہی نظر میں ایمن پر مر مٹے ہیں اور ہم دونوں ایمن کو بھابھی بنانے آئیں ہیں۔'' ثناء نے ایمن کو دیکھتے ہوئے شوخی سے جواب دیا تھا ایمن کا دل دھڑکا تھا۔

ایمن کی امی کو یہ رشتہ بہت پسند آیا تھا، اس لئے انکار کا جواز ہی نہیں بنتا تھا، عامر کی امی ایمن کی امی کی کزن بھی تھی، عامر کی والدہ کا اصرار تھا، شادی کی تاریخ جلدی کی دی جائے، ایمن کی اسٹیڈیز بھی کمپلیٹ ہو چکی تھی، عامر بھی اچھے عہدے پہ تھا، ایمن کی امی نے اپنے شوہر سے مشورہ کیا اور یوں باہمی صلاح و مشورے کے بعد چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ دے دی۔

''ایمن شکر ہے، آنٹی نے شادی کی تاریخ دے دی، عامر بھائی نے کہا تھا کہ اگر تم شادی کی تاریخ لینے میں کامیاب ہو گئیں تو میں تم دونوں کو گولڈ کی چین بنوا کر دوں گا۔'' حنا ثنا اپنی کامیابی پہ مسرور تھی۔

''لگتا ہے، عامر بھائی بے صبرے ہیں۔'' ثمن نے اپنا خیال پیش کیا۔

''ہاں لیکن صرف ایمن کے بارے میں جب سے ایمن کو دیکھا ہے، ان کو بے قراری قابل دید ہے۔'' ثناء کے جواب پہ ایمن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

دونوں گھروں میں زور وشور سے شادی کی تیاریاں جاری تھی، بالآخر شادی کا دن بھی آ گیا۔

گہرے سرخ رنگ کے عروسی لباس، جس پر سرخ اور گرے امتزاج کا نفیس کام تھا، ہم رنگ خوب صورت زیورات، کلائیوں میں مہکتے گجرے، ایک کلائی میں سونے کی چوڑیاں ایک ہاتھ میں کانچ کی چوڑیاں نرم و نازک ہاتھوں اور بازوؤں پر مہندی کا گہرا رنگ، وہ بلاشبہ بہت حسین لگ رہی تھی، عامر منظر کی دلکشی میں کھو گیا تھا، دم بخود رہ گیا تھا۔

زندہ رکھا اس کی سانسوں کی گرمی نے
مجھ میں چلنے والی ہوا برفیلی تھی
پہلی نظر پڑتے ہی آنکھوں میں
میں نے اس کی صورت گھول کے پی لی تھی

عامر ایمن کو پا کے بہت خوش تھا، عامر ایمن کو بے تحاشہ چاہتا تھا، ایمن عامر کی اتنی محبتوں پہ حیران ہوتی تھی، کیا کوئی اتنا بھی چاہا سکتا ہے، ایمن سوچتی، ایمن اپنی قسمت پہ نازاں تھی، وہ خود بھی عامر سے بہت محبت کرتی تھی۔

ایمن کی کزنز اس کی قسمت پر رشک کرتی اور کہتی، کاش ہمیں بھی کوئی عامر بھائی جیسا مل جائے، ان کے انداز میں حسرت ہوتی، ایمن مسکراتی اور صدق دل سے آمین کہتی۔

عامر کا شادی سے تین ماہ قبل لاہور ٹرانسفر ہو گیا تھا، ایمن شادی کے ایک ماہ بعد لاہور عامر کے گھر میں آ گئی تھی۔

ایمن سے شادی سے پہلے عامر اس گھر میں تنہا رہتا تھا، اب ایمن کے آنے سے عامر کی بے کیف، بے رنگ زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر گئے تھے، زندگی یکدم ہی بہت حسین لگنے لگی تھی، ایمن عامر کا بہت خیال رکھتی تھی، وقت پر کھانا پینا، اس کی پسند و ناپسند کا خاص خیال رکھنا اس کا ہر چھوٹا بڑا کام خوشدلی سے کرتی تھی، ایمن بہت ذہین، سلیقہ مند اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی، عامر کے دل میں بھی ایمن کی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔

عامر کے دل کی ہر دھڑکن ایمن کے نام کی مالا جپتی تھی، اس کی ہر سانس سے ایمن کی خوشبو مہکتی تھی، عامر اس کے بنا سانس لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، ایمن کی طبیعت میں از حد نفاست اور صفائی پسندی تھی، ایمن کے آنے سے پہلے گھر میں ملازمہ تھی، لیکن گھر کبھی صاف ستھرا نظر نہیں آتا تھا، کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں ملتی تھی، اکثر ملازمہ کپڑے استری کرنا بھول جاتی تھی، ایمن نے شادی کے بعد عامر کے بے حد اصرار پہ بھی ملازمہ نہیں رکھی تھی، اس کا موقف تھا کہ یہ میرا گھر ہے اس کو سجانا صاف ستھرا رکھنا میرا حق اور فرض ہے، عامر نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت کام کر کے تھک جائے، لیکن ایمن سارے کام اپنے ہاتھوں سے کر کے بھی فریش نظر آتی تھی، شام کو عامر کے آنے سے پہلے وہ کوئی خوب صورت سا اسٹائلش سوٹ، لائیٹ میک اپ اور نازک سی جیولری پہن کر وہ ہنستی مسکراتی عامر کا استقبال کرتی تھی، شام کی چائے کے ساتھ وہ کبھی اسنیکس بنا لیتی کبھی پکوڑے، کیونکہ عامر کھانے پینے کا بے حد شوقین تھا، اپنے لئے وہ دوپہر میں کھانا نہیں بناتی تھی البتہ عامر کے لئے رات کے کھانے پہ وہ اہتمام کرتی تھی۔

ایمن کے ہاتھ میں اتنی لذت تھی کے عامر انگلیاں چاٹتا رہ جاتا تھا، ایسے میں اسے اپنے انتخاب پہ فخر ہوتا تھا، وہ ایمن کے ہر گن پہ سو بار نثار ہوتا تھا۔

عامر پانچ بجے ہی گھر آ جاتا تھا، جب کے شادی سے پہلے وہ سات بجے تک لازمی آفس میں کام کرتا تھا، وہ اکثر کہتا۔

”یار! تم نے کیا جادو کر دیا ہے؟ اب تمہارے بنا کہیں بھی دل نہیں لگتا ہے۔“

”میں بھی یہ ہی چاہتی ہوں کہ آپ کا میرے بنا کہیں بھی دل نہ لگے۔“ ایمن شرارت سے مسکراتے ہوئے بولتی۔

”یار! مجھے لگتا ہے اگر یہی صورتحال رہی تو کاروبار ٹھپ ہو جائے گا، سب کچھ دیوالیہ ہو جائے گا۔“ عامر کہتا۔

ایمن کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا، ایمن کا میکہ بھی قریب ہی تھا اور ایمن ایک رات بھی

اپنے میکے نہیں ٹھہری تھی، عامر آفس جاتے ہوئے ڈراپ کر جاتا تھا اور آفس سے واپسی میں اپنے ساتھ لے جاتا تھا، اس بار ایمن کی بہن ثمن نے شکوہ کیا تھا۔

”آپی! شادی کے بعد آپ ہمیں بالکل ہی بھول گئی ہے، جس گھر میں آپ نے پچیس سال گزارے ہیں، اب آپ اس گھر میں ایک رات ٹھہرنے کی بھی روادار نہیں ہیں۔“

ایمن شرمندہ ہو گئی تھی، واقعی عامر کی محبت سب محبتوں پہ حاوی ہو گئی تھی، ایمن نے ثمن کو یقین دلایا کے اگلی مرتبہ وہ دو دن کے لئے آئے گی۔

نیکسٹ ویک جب ایمن امی کے گھر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو اچانک ثمن کی بات یاد آ گئی۔

”میں اس مرتبہ دو دن بعد آؤں گی۔“ ایمن نے عامر سے نگاہیں چراتے ہوئے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا۔

”کیا؟ دو دن بعد؟“ عامر نے حیرت سے کہا۔

ثمن اصرار کر رہی تھی، ایمن عامر کے پاس آ کے بیٹھی۔

”یار! کس طرح گزاروں گا میں یہ دن یہ راتیں، کیسے کٹیں گے یہ پل یہ لمحے، تمہارے بنا میں اب کہیں بھی نہیں رہ پاؤں گا۔“ عامر کے انداز میں اس کے لئے بے تحاشہ محبت تھی، ایمن کو اپنی قسمت پہ رشک ہونے لگا تھا، عامر نے آفس جاتے ہوئے اسے ڈراپ کر دیا تھا۔

شام کے پانچ بجتے ہی وہ لاشعوری طور پر عامر کی آمد کی منتظر تھی، عامر کے آتے ہی وہ اپنے گھر چلی گئی، ثمن کی آنکھوں میں اس کے لئے ناراضگی اور شکوے کے رنگ واضح تھے، لیکن وہ عامر کی محبت کے آگے مجبور تھی۔

سچی بات تو یہی تھی کہ ایمن بھی عامر کے بنا نہیں رہ سکتی تھی، عامر کے بنا کہیں بھی رہنے کا تصور بھی اس کے لئے محال تھا۔

☆☆☆

ایمن کی طبیعت کچھ دن سے عجیب سی ہو رہی تھی، عامر اسے ہاسپٹل لے گیا تھا، لیڈی ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی اور عامر اور ایمن بہت خوش تھے، عامر مزید شوخ ہو رہا تھا اور خوشی سے چہک رہا تھا، جبکہ ایمن شرما رہی تھی اور شرماتے ہوئے ایمن کا روپ بہت دلکش لگ رہا تھا، عامر محو ہو کے دیکھتا رہا عامر ایمن سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کرنے لگا تھا۔

وہ ایمن کا خیال اس طرح رکھتا تھا، جیسے وہ کوئی کانچ کی گڑیا ہو، ایمن ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتی، عامر نے ایمن کے منع کرنے کے باوجود ایک ملازمہ رکھ لی تھی، ڈلیوری سے ایک ماہ قبل عامر کی امی اور حیا ثناء آ گئیں تھیں، وہ بھی ایمن کا بہت خیال رکھتی تھیں، ایمن کی ساس اور نندیں ہمیشہ ایمن کی تعریفیں کرتی تھیں، ایمن نے اپنے اخلاق و عمل سے سب کا دل جیت لیا تھا۔

پھر وہ دن بھی آ گیا تھا جب اللہ نے انہیں ایک پیاری سی بیٹی عطا کی۔

”یار! یہ پری بالکل تمہاری طرح ہے۔“ عامر ننھی گڑیا کو پا کے بہت خوش تھا، ایمن اس رحمت پہ اللہ کی شکر گزار تھی، عامر کی امی اور بہنیں بھی بہت خوش تھیں، عامر کو اپنی لاڈلی گڑیا پنکی بہت عزیز تھی، لیکن ایمن کے لئے محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، ان کی جوڑی تمام خاندان میں آئیڈیل تھی، وہ ہمیشہ اللہ سے دعا گو رہتی کے ان کے آشیانے کو کسی کی نظر نہ لگے۔

ایمن کی دونوں نندوں کی شادی ہو گئی تھی،

ایمن اپنی ساس کو اپنے گھر لے آئی تھی، ایمن ان کا بہت خیال رکھتی تھی، وہ بھی ایمن سے بہت پیار کرتی تھیں، عامر، ایمن کا مشکور تھا، سچ تو یہ تھا کہ ایمن کو پانے کے بعد وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو گیا تھا اور پنکی آنے کے بعد وہ تمام رشتوں سے دور ہو گیا تھا، اس کی توجہ کا مرکز صرف ایمن اور پنکی کی ذات تھی، بے شک وہ باقی رشتوں کو فراموش کر چکا تھا لیکن ایمن کو اپنے فرائض یاد تھے، پنکی اب تین سال کی ہو چکی تھی، شام ہوتے ہی وہ بیتابی سے عامر کا انتظار کرنے لگتی، لیکن عامر آج کل دیر سے گھر آتا تھا، گھر آتے ہی وہ کھانا کھاتے ہی سو جاتا تھا، پنکی بدمزہ ہو جاتی، ایمن اور اپنی دادی سے شکایت کرتی۔

"گڑیا! تمہارے بابا بزی ہے، وہ آج کل نئی فرم میں چیف ایگزیکٹو کی پوسٹ پہ کام کر رہے تھے، جیسے ہی انہیں ٹائم ملے گا وہ تمہیں پہلے کی طرح پیار کریں گے اور سیر و تفریح کروائیں گے۔" ایمن پنکی سے زیادہ خود کو تسلی دیتی، عامر میں اسے نمایاں فرق محسوس ہو رہا تھا۔

اس دن ثمن کی منگنی تھی، عامر نے چار بجے آنے کا کہا تھا، ایمن نے پنکی کو تیار کر دیا تھا، خود بھی تیار ہو گئی تھی، پنکی کی دادی آج کل ثنا کے گھر تھیں۔

چار سے سات بج گئے، عامر نہیں آیا، عامر کے نمبر پہ کال کی نمبر آف جا رہا تھا، آفس فون کیا وہاں سے جواب ملا، وہ پانچ بجے جا چکا ہے، ایمن بہت پریشان تھی اتنی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ تو کبھی بھی نہیں کیا تھا، ایمن نے ایک مرتبہ پھر عامر کے سیل کو ری ڈائل کیا، دوسری طرف سریلی نسوانی آواز سن کے ایمن نے فون کاٹ دیا۔

"لگتا ہے فون کہیں اور ملا دیا پریشانی میں۔" ایمن نے سوچا ایک مرتبہ پھر عامر کا نمبر ملایا، پھر اس سریلی آواز نے فون اٹینڈ کیا۔

"عامر سے بات کروا دیں۔" ایمن نے کہا۔

لیکن دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا، ایمن ہکا بکا اپنے سیل فون کو دیکھتی رہ گئی، ایک مرتبہ پھر عامر کا نمبر ملایا، لیکن اس مرتبہ سیل آف ملا، ایمن ٹرائی پہ ٹرائی کرتی چلی گئی، پندرہ منٹ بعد تھک ہار کر سیل فون رکھ دیا۔

آٹھ بجے ایمن کا بھائی علی از خود ایمن کو لینے پہنچ گیا تھا، ایمن پنکی کو لے کر میکے تو آ گئی، لیکن اس کا دھیان عامر کی طرف ہی رہا، فنکشن میں وہ غائب دماغی سے شریک رہی، فنکشن میں اس کی عدم دلچسپی سب نے محسوس کر لی تھی۔

"آپی! عامر بھائی کی محبت نے آپ کو کہیں کا بھی نہیں رکھا۔" ثمن کے سنجیدگی سے کہنے پہ ایمن سوچنے لگی، واقعی عامر کے بناء اس کو اپنا آپ ادھورا لگتا تھا، رات بارہ بجے فنکشن ختم ہوا، عامر کے نہ آنے کا سبب اس نے آؤٹ آف سٹی بتایا تھا، پنکی سو چکی تھی، ایمن نے کپڑے چینج کیے اور منہ ہاتھ دھویا اور پنکی کے بیڈ پہ آ کے لیٹ گئی، نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

صبح اٹھتے ہی اسے عامر کا خیال آیا، عامر نے بتایا کہ وہ رات دس بجے گھر آیا تھا، ایمن بجھ کے رہ گئی، رات کو لینے بھی نہیں آ سکا، ایمن نے بے ساختہ شکوہ کیا۔

حیرت یہ تھی، وہ ذرا بھی شرمندہ نہ تھا، صرف مصروف ہونے کا بودا سا جواز پیش کیا، ایمن خاموش ہو گئی۔

"عامر! تم بدل گئے ہو۔" ایمن نے سرگوشی کی خود سے۔

شام کو یقین تھا، عامر اسے لینے آئے گا،

لیکن رات کو دس بجے اس نے علی کو فون کر دیا کہ ایمن کو چھوڑ جانے کا کہا، ایمن علی کے ساتھ گھر آ گئی، ایمن کے گھر آنے سے پہلے وہ سو چکا تھا، ایمن مایوس ہو گئی، شکر کے پنکی گاڑی میں ہی سو گئی تھی، ورنہ عامر کو سوتے دیکھ کر خفا ہوتی۔

ایمن سے صبح بھی اس نے اس موضوع پہ کوئی بات نہیں کری، پھر روز و شب ایسے ہی گزرنے لگے، عامر صبح جا کے رات کو آتا تھا، آ کے سوئی ہوئی پنکی کو پیار کر کے سو جاتا، ایمن تو بات کرنے کو ترس گئی تھی۔

☆☆☆

رات کے دو بج رہے تھے، عامر گہری نیند سو رہا تھا، ایمن نے بے ساختہ عامر کا کندھا جھنجوڑا، عامر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟"

"بہت دن ہو گئے ہیں ہم نے باتیں نہیں کیں نہ ہم کہیں باہر گئے، پنکی اور میں آپ کا انتظار کرتے رہ جاتے ہیں، آپ آتے ہی سو جاتے ہیں۔" ایمن نے شکوہ کیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مجھے کوئی کام نہیں کرنا چاہیے، دن رات تمہارے گھٹنے سے لگا بیٹھا رہوں۔" عامر نے طنز سے کاٹ دار لہجے میں جواب دیا۔

ایمن سن ہو کے رہ گئی، یہ انداز یہ لہجہ اس کے لیے اجنبی تھا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ۔" الفاظ اس کے گلے میں پھنس گئے، آنسو آنکھوں میں آ گئے۔

"سو جاؤ پلیز۔" عامر کی جھنجلائی ہوئی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی، دوسرے ہی پل وہ کروٹ بدل کے سو گیا تھا۔

ایمن رات کے آخری پہر تک جاگتی رہی، صبح ایمن کی ساس واپس آ گئیں تھیں۔

"ایمن! میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں، ٹھنڈے دل و دماغ سے سننا اور اس پر غور کرنا۔" عامر نے سپاٹ انداز میں سرد مہری سے ناشتہ لگاتی ایمن کو مخاطب کیا، نجانے کیوں ایمن کا دل لرز گیا، کچھ اندیشوں اور وسوسوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

"ایمن! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، تم نے مجھے بہت محبت اور سکھ دیا، لیکن شہرینہ جمال نے مجھ پہ جادو کر دیا ہے، بہت کوشش کے باوجود میں اس کے سحر سے نہیں نکل پایا، وہ بہت ضدی اور پاگل لڑکی ہے، یونیورسٹی میں وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، لیکن اپنے پاپا کی اچانک ڈیتھ کی وجہ سے وہ پڑھائی چھوڑ کے امریکہ چلی گئی اور اسے اظہار کا موقع نہیں ملا، وہ یہاں صرف مجھے ڈھونڈنے آئی ہے، اگر میں نے اس سے شادی نہیں کی تو وہ تنہا رہ جائے گی، میں اس سے الگ گھر میں رکھوں گا، یہ تمہارا گھر ہے، اس میں تم امی اور پنکی رہنا۔" عامر کہہ کے چلا گیا تھا، ایمن سکتے کی کیفیت میں ساکت کھڑی رہی، اسے لگا وہ ماؤنٹ ایورسٹ تلے دب گئی ہے۔

"میری محبت اور ریاضت کا یہ صلہ دیا ہے۔" آنسو گالوں سے لڑھکتے آ رہے تھے ایک پل میں مجھے آسمان سے زمین پہ لا پٹخا ہے میرا سارا اعتبار کرچی کرچی کر دیا ہے، بے مول کر دیا، ایمن کو ساری دنیا ڈولتی ہوئی نظر آئی۔

"ایمن! ایمن کیا ہوا بیٹا!" ایمن کی ساس نے ایمن کا شانہ ہلایا، ایمن کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ان کی بانہوں میں جھول گئی، ایک قیامت تھی جو اس پہ گزری تھی۔

شام کو عامر کے آنے سے پہلے پنکی کو لے کے اپنے میکے آ گئی، ایمن کے میکے میں سب سناٹے میں رہ گئے، کیا عامر ایسا کر سکتا ہے؟ سب

بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھے، ایمن کی حالت سب سے بری تھی، اس کا مان اعتماد سب ٹوٹ گیا تھا، وہ بکھر گئی تھی، ہار گئی تھی، ہارنے کی نڈھال سی کیفیت نے اسے اپنی گرفت میں کچھ اس طرح سے جکڑا کہ اس پژمردگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی، ایک قیامت تھی جو آ کے گزر گئی تھی، ایمن کی گویا زندگی ہی بدل گئی تھی، چپ چاپ پتھر بنی بس خلاؤں میں کچھ ڈھونڈتی رہتی، گھر کے سب ہی افراد نے اس کٹھن مرحلے پر بے حد ساتھ دیا اور سب سے زیادہ اس کا خیال رکھا، اسے غم سے نکالنے کے لئے بہت جتن کیے، لیکن ناکام رہے، پنکی الگ تنگ کرتی تھی، ہر وقت بابا بابا کی رٹ لگائے رکھتی تھی اور روز پوچھتی۔

''مما! ہم اپنے گھر کب جائیں گے۔؟ مما مجھے بابا بہت یاد آتے ہیں۔'' پنکی روہانسی ہو کے کہتی۔

''مما! بابا کب آئیں گے؟'' ایمن کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔

عامر کی امی، عامر سے بہت ناراض تھیں، عامر کے فیصلے نے انہیں بہت رنج دیا تھا، وہ ناراض ہو کے اپنے دوسرے بیٹے کے گھر چلی گئی تھیں، انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کے وہ اس گھر میں جب ہی آئیں گی، جب ایمن یہاں آئے گی، لیکن عامر پہ شہرینہ جمال کو بولڈ مغرب زدہ اداؤں کا جادو چل گیا تھا اور وہ ہر قیمت پہ شہرینہ جمال کو پانا چاہتا تھا، اس کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں بسانا چاہتا تھا، اس کے لمس کو محسوس کرنا چاہتا تھا، عورت مرد کی طرف دی گئی تھوڑی سی محبت کی خاطر خود کو مغلوب کرنے سے بھی نہیں چوکتی، لیکن مرد دریافت کا پرندہ ہے، مرد ایک آسمان پر قناعت نہیں کرتا، جب وہ پرواز کرتا ہے، اپنی خواہشوں کے نئے آسمان تسخیر کرتا ہے۔

☆☆☆

بالآخر عامر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، شہرینہ آج دولہن بنی اس کے گھر میں موجود تھی، حسین تو وہ پہلے ہی تھی، آج وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی، عامر مبہوت ہو رہا تھا، شہرینہ بھی سرشار ہو رہی تھی، فاتح جو ٹھہری تھی جسے چاہا تھا اسے پا لیا تھا، دونوں بہت خوش تھے، عامر کا دل اب آفس جانے کو نہیں چاہتا تھا، شہرینہ اس کے دل و دماغ اس کے حواسوں پہ چھا گئی تھی، شہرینہ کے لئے ہی اس نے سب رشتوں کو فراموش کیا تھا۔

شہرینہ کا دو ماہ بعد یکدم اس روٹین سے دل اکتا گیا، وہ بوریت محسوس کرنے لگی تھی، وہ بیزار رہنے لگی، تنہائی سے اسے نفرت تھی، وہ شور و ہنگامہ ہلا گلہ پسند کرتی تھی، عامر کے جانے کے بعد وہ تنہا گھر میں ہوتی تھی، تنہائی سے وحشت محسوس ہوتی تھی۔

شہرینہ چاہتی تھی کہ وہ عامر کے ہمراہ امریکہ اپنے عزیزوں کے قریب سیٹل ہو جائے، ذاتی طور پر وہ وہاں کے لائف اسٹائل کو پسند کرتی تھی، لیکن عامر امریکہ جانے کے لئے رضا مند نہیں تھا، اسے وہاں کی زندگی سے کوئی انٹرسٹ نہیں تھا، عامر کے انکار پہ شہرینہ بجھ گئی تھی اب اس کے رویے میں سرد مہری اور چڑچڑا پن نمایاں محسوس ہوتا تھا، وہ عامر سے خفا رہنے لگی تھی۔

ان ہی دنوں عامر کے گھر شہرینہ کے کزن سہیل کی آمد ہوئی، سہیل بیس برس سے امریکہ میں مقیم تھا، چھ سال کی عمر میں وہ امریکہ چلا گیا تھا، سہیل پاکستان میں اپنا کاروبار کرنا چاہتا تھا، جس کے لئے اس کے پاس خطیر سرمایہ تھا، سہیل کی آمد سے شہرینہ کھل گئی تھی، حالانکہ سہیل سے شہرینہ صرف ایک مرتبہ ملی تھی، وہ بھی جب شہرینہ

گیارہ برس کی تھی، سہیل اس وقت آٹھ سال کا تھا، سہیل کے آنے سے شہرینہ بہت خوش تھی، دونوں میں بہت جلد دوستی ہو گئی تھی، دونوں کے مزاج حیرت انگیز طور پر ایک جیسے تھے، اس لئے انڈر اسٹینڈنگ کمال کی ہو گئی تھی، سہیل کا ارادہ اپنا گھر خریدنے کا تھا کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے وہ جب تک مجبور تھا، جب تک اسے اس کی پسند کا گھر نہ مل جاتا۔

شہرینہ ہوٹل سے اصرار کے اپنے گھر لے آئی تھی، شہرینہ اب ہر لمحہ ہنستی مسکراتی گنگناتی نظر آتی تھی، عامر بھی مطمئن ہو گیا تھا، عامر آج کل بہت بزی تھا، آٹھ بجے جب گھر آتا، گھر میں صرف ایک ملازمہ ہوتی تھی، گھر کے تمام کام حتیٰ کہ کوکنگ بھی ملازمہ کرتی، جو نو بجے عامر کے کھانے اور چائے کے بعد چھٹی کر جاتی تھی۔

شہرینہ اور سہیل شام کو ہی گھومنے پھرنے چلے جاتے تھے، رات گئے لوٹتے تھے، عامر کچھ دن خاموش رہا، لیکن پھر اسے یہ روز کی روٹین ناگوار گزرنے لگتی تھی۔

لیکن وہ برداشت کر رہا تھا، ایک رات تین بجے عامر کو پیاس لگی تھی، عامر کچن میں پانی پینے آیا، سہیل کی بیڈ روم کی لائیٹ آن تھی، عامر بلا ارادہ اس کے بیڈ روم کی طرف چلا گیا، جہاں وہ مے نوشی میں مشغول تھا، عامر دم بخود رہ گیا، اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی، عامر نے اسی وقت سہیل کو گھر سے جانے کا حکم دیا، سہیل اچانک عامر کو اپنے کمرے میں دیکھ کے گھبرا گیا، عامر کے چلانے سے شہرینہ بھی جاگ گئی۔

عامر کا رویہ شہرینہ کو پسند نہیں آیا تھا، سہیل ناراض ہو کے اسی وقت چلا گیا تھا۔

شہرینہ اپنے مہمان کی بے عزتی پہ غصے میں تھی اور عامر سے ناراض ہو گئی تھی۔

''شہرینہ تم کیا سمجھتی ہو جو میں نے کیا ہے وہ غلط کیا ہے۔'' عامر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں تم نے غلط کیا ہے اتنی معمولی سی بات پہ تم نے میرے کزن کی توہین کی ہے۔'' شہرینہ چلائی۔

''معمولی سی بات، شراب پینا معمولی بات ہے، شراب حرام ہے میں مسلمان ہوں، میں اپنے گھر میں کسی کو شراب پینے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' عامر نے تحمل سے کہا۔

''وہ امریکہ میں رہا ہے، وہ لبرل فیملی سے تعلق رکھتا ہے، تمہاری طرح کنزرویٹو نہیں ہے۔'' شہرینہ نے طنز کیا۔

''مجھے افسوس ہو رہا ہے، تمہاری ذہنیت پہ تم برائی کو برائی نہیں سمجھ رہی، یہ بھی گناہ ہے۔'' عامر نے افسوس کا اظہار کیا۔

''بس کرو یہ اپنے فتوے اپنے پاس رکھو۔'' شہرینہ نے چڑ کے ہاتھ جوڑے۔

''شہرینہ! آج کے بعد تم اپنے آوارہ کزن سے نہیں ملو گی۔'' عامر نے وارننگ دی۔

''میں سہیل سے ضرور ملوں گی، تمہاری فضول پابندیاں مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، میں نے غلطی کی جو تم سے شادی کی، اب میں مزید اپنی زندگی تمہارے ساتھ برباد نہیں کرنا چاہتی، مجھے طلاق دے دو۔'' شہرینہ نے اطمینان سے حتمی انداز میں کہا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو، تم اپنے ہوش و حواس میں ہو؟'' عامر نے بے یقینی سے شہرینہ کو دیکھا۔

''میں مکمل ہوش و حواس میں تم سے طلاق کا تقاضہ کر رہی ہوں، تم سے شادی کا فیصلہ میں نے جلد بازی میں کیا، میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی، میں اکتا گئی ہوں، بہتر یہی ہے کہ تم مجھے طلاق دے دو۔'' شہرینہ کے اطمینان میں کوئی

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

فرق نہیں آیا تھا۔

''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا، تم پاگل ہو رہی ہو، شادی بیاہ کھیل نہیں ہے، اتنا بڑا فیصلہ اتنی آسانی سے تم نے کرلیا۔'' عامر حیران تھا۔

''شادی بیاہ واقعی کھیل نہیں ہے، تب ہی تم نے اپنی وفا پرست آئیڈیل بیوی کو پل میں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔'' شہرینہ نے جواباً طنز کیا۔

''ہاں میں نے انہیں چھوڑ کے غلطی کی، لیکن صرف تمہارے لئے، تم سے محبت کرنے لگا تھا میں، تمہارے لئے میں نے اپنی جانثار بیوی اور عزیز جان بیٹی کو چھوڑا، صری شہرینہ جمال کو پانے کے لئے۔'' عامر کے لہجے میں دکھ تھا۔

''میں سہیل سے محبت کرنے لگی ہوں مجھے یقین ہے کے وہ میرے لئے بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگا، تم نے اگر مجھے طلاق نہیں دی تو میں کورٹ سے رجوع کروں گی۔'' شہرینہ دھمکی دیتے ہوئے سہیل کے تعاقب میں ہوٹل چلی گئی۔

☆☆☆

عامر نے خاموشی سے شہرینہ کو طلاق دے دی، وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا، بکھر گیا تھا، کچھ دنوں میں ہی وہ برسوں کا بیمار رہنے لگا تھا، ذہنی طور پر وہ بہت پریشان تھا، پندرہ دن سے وہ آفس نہیں گیا تھا، آفس سے فون آرہے تھے، لیکن وہ ریسو نہیں کر رہا تھا، گیٹ بج رہا تھا، لیکن وہ بے خبر تھا۔

''ایمن مجھے تمہاری بددعا لگی ہے، اپنی ماں کو ناراض کرنے کی سزا ملی ہے، اپنی معصوم بچی کی حق تلفی کی سزا ہے۔'' آنسو اتر سے بہنے لگے۔

''مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارا دل دکھایا ہے۔'' وہ تنہائی میں رات کے اندھیرے میں ایمن سے مخاطب ہو کے کہتا لیکن ایمن سے معافی مانگنے کی ہمت نہیں تھی، اس سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا، وہ تنہا تھا، غمگین تھا۔

ایمن اپنے میکے کیا آئی، خبر تمام محلے اور رشتے داروں میں پہنچ گئی، لوگوں کو تشویش ہونے لگی تھی، کچھ تجسس میں مبتلا ہو کے ملنے کے بہانے کن سوئیاں لینے آگئے، ایمن تو ایک رات بھی نہیں ٹھہرتی تھی۔

اب مہینوں ہوگئے، خیریت تو ہے نہ لوگوں کے سوالوں سے وہ تنگ آنے لگی تھی، اسے بہت شرم آتی تھی، جب لوگ کرید کرید کے اس کے بارے میں سوالات کرتے تھے، اس نے گھر سے نکلنے چھوڑ دیا تھا، کوئی گھر آتا تو کمرے میں بند ہو جاتی۔

''عامر! بہت بے مول کر دیا تم نے مجھے نجانے کس خطا کی سزا دی ہے، بہت تنہا کر دیا۔'' کمرے میں نم آنکھوں سے وہ شکوہ کرتی۔

ایمن نے اپنے تمام عزیز رشتے داروں سے عامر اور شہرینہ کی دوسری شادی کی خبر چھپائی تھی۔

پنکی سارا دن پاپا کے بارے میں الگ پوچھ پوچھ کے تنگ کرتی تھی، ایمن کا خیال تھا وہ چھوٹی گڑیا کچھ دن میں سب بھول جائے گی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ مزید تنگ کرنے لگی تھی، اس کو بہلانا اب ایمن کے لئے ممکن نہیں رہا تھا، پنکی کی ضد سے تنگ آ کے ایمن نے اس کا اسکول میں ایڈمیشن کروا دیا، اس دن وہ اسکول لے کے جا رہی تھی، جب اچانک عامر سے سامنا ہوگیا، وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے، ایمن اسے دیکھ کر حیران رہ گئی، وہ بہت کمزور ہو گیا تھا، رنگ پیلا پڑ گیا تھا، آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے نمایاں تھے، آنکھوں کی چمک ماند تھی، چہرے کی شادابی ختم تھی، بے ترتیب بالوں کے ساتھ، عجیب سے حلیے میں وہ ایمن کے سامنے تھا۔

عامر پنکی کو دیکھ کر تڑپ گیا اور اسے گود میں اٹھائے چومنے لگا۔

''پنکی! چلو بیٹا دیر ہو رہی ہے۔'' ایمن برہمی سے بولی۔

پنکی عامر کی گود میں چڑھی لاڈ پیار کے ساتھ شکوتیں شکائتیں کر رہی تھی۔

''مما! ہم بابا کے ساتھ اپنے گھر جائیں گے، نانا کے گھر میرا دل نہیں لگتا۔'' پنکی عامر سے کسی صورت میں جدا ہونے پہ آمادہ نہیں تھی۔

''بیٹا! وہ گھر اب ہمارا نہیں رہا۔'' ایمن نے اداسی سے کہا تو عامر بے حد شرمندہ نظر آنے لگا، اس کے چہرے پہ شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔

''ایمن! میری زندگی کی سب سے بڑی بھول شہرینہ تھی، میں نے جو کیا ہے میں اس کے لئے بہت شرمندہ ہوں، سچ تو یہ ہے تمہارے بعد میں کبھی دل سے خوش نہیں ہوا، کبھی کوئی ملال کبھی تمہاری یاد، کبھی تمہاری محبتیں، کبھی خدمتیں، کبھی کچھ یاد آتا، میں بے سکون رہنے لگا، شہرینہ کو شادی کے بعد وہ محبت نہیں دے سکا میں اس میں تمہیں تلاش کرنے لگا تھا، تمہارا عکس دیکھنا چاہتا تھا، پھر میں مایوس ہو گیا، میں جان گیا، شہرینہ ایمن نہیں بن سکتی، بلکہ کوئی بھی لڑکی ایمن نہیں ہو سکتی، میں کم ظرف تھا، اس لئے تم پہ شہرینہ کو ترجیح دی، شادی کے ابتداء میں ہی شہرینہ مجھ سے بیزار ہو گئی، ہمارے تعلقات میں سرد مہری آ گئی، شہرینہ نے مجھ سے طلاق لے لی ہے وہ اپنے کزن سہیل سے شادی کرنا چاہتی ہے، میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا، لیکن بہت شرمندہ تھا، آنے کی ہمت نہیں ہوئی، اب تمہارے پاس ہی آ رہا تھا۔''

''پلیز مجھے معاف کر دو، میں تمہارے بنا ادھورا ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں، آئندہ کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' وہ نم آنکھوں سے التجا کر رہا تھا۔

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیئے

ابن انشاء

اردو کی آخری کتاب .... ☆
خمار گندم .... ☆
دنیا گول ہے .... ☆
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☆
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☆
چلتے ہو تو چین کو چلیئے .... ☆
نگری نگری پھرا مسافر .... ☆
خط انشا جی کے .... ☆
بستی کے اک کوچے میں .... ☆
چاند نگر .... ☆
دل وحشی .... ☆
آپ سے کیا پردہ .... ☆

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قواعد اردو .... ☆

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور
فون نمبرز 7321690-7310797

”اتنی ہی بے وقعت ہوں کہ جب چاہا مجھے دھتکار دیا، جب چاہا پکار لیا۔“ ایمن نے دکھ سے کہا تو عامر کٹ کے رہ گیا۔

”ایمن! صرف ایک بار معاف کر دو۔“ عامر گڑگڑا رہا تھا، یہ شکر تھا کہ وہ جہاں کھڑے تھے وہ اسکول سے کچھ دور ویران راستہ تھا، ورنہ پل میں اچھا خاصہ تماشہ بن جاتا تھا۔

”عامر! تم نے میرا مان میرا اعتبار، میرا غرور، میرا فخر سب کچھ خاک میں ملا دیا، میں تمہیں کیسے معاف کر دوں۔“ ایمن نے آنسو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ایمن! میں بہت شرمندہ ہوں، میں بہک گیا تھا، تم نے مجھے معاف نہیں کیا تو میں کبھی خوش نہیں رہ سکوں گا، میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے، امی بھی مجھ سے ناراض ہے، پنکی بڑی ہوگی تو کیا سوچے گی میرے بارے میں، پنکی کو ہم دونوں کی محبت و شفقت کی ضرورت ہے۔“

”یہ سب تمہیں پہلے سوچنا تھا۔“ ایمن نے غصے سے کہتے ہوئے پنکی کو کھینچا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی عامر سے دور ہوگئی۔

”مما! مجھے بابا کے پاس جانا ہے۔“ پنکی روتے ہوئے اس کی گود میں مچلنے لگی، ایمن نے بہلانا چاہا لیکن پنکی بضد تھی، غصے میں ایمن نے پنکی کو تھپڑ مارا پنکی یکدم خاموش ہو کے بے یقینی سے ایمن کو دیکھنے لگی، ایمن شرمندہ ہوگئی، پنکی خاموش ہو گئی، لیکن اس کے سسکنے کی آوازیں آنے لگی، گھر آ کے پنکی کو بیڈ پہ لٹا دیا، وہ راستے میں ہی سوگئی تھی، ایمن کو بے ساختہ اس پہ پیار آیا، ساتھ میں خود پہ غصہ آیا، پہلی بار پنکی کو مارا تھا، بھلا اس میں بچی کا کیا قصور، عامر نے پنکی کو اتنا پیار دیا ہے، ایسے میں ہر بچہ ہی باپ کو یاد کرتا ہے، ایمن نے سوچتے ہوئے بغور پنکی کا جائزہ لیا، وہ بہت اداس رہنے لگی تھی، ہر وقت عامر کو یاد کرتی تھی، کمزور ہو گئی تھی، چہرے پہ رونق اور شادابی کے آثار بھی نہیں تھے، حالانکہ وہ مکمل طور پر صحت مند بچی تھی، اس وقت بالکل مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی، ایمن کا دل کٹنے لگا، پنکی بڑی ہوگئی تو میں اسے کیا جواب دوں گی، پنکی کو باپ کی شفقت سے محروم کرنا زیادتی ہے، باپ کی شفقت محبت پنکی کا حق ہے اور میں اسے اس کے حق سے محروم نہیں کر سکتی، مجھے جانا ہوگا، اپنے لئے نہیں تو اپنی بیٹی کے بہترین مستقبل کے لئے۔ ایمن نے بے بسی سے آنسو صاف کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا تھا۔

یہ سچ ہے، عامر اب میرے دل میں تمہارے لئے وہ محبت وہ مقام نہیں رہا اور اب میرا دل تمہارے ساتھ رہنے کو نہیں کر رہا، میرا دل ویران ہو گیا ہے، میری انا کو شدید ٹھیس پہنچی ہے لیکن میں اتنی خود غرض نہیں ہوں کہ اپنی انا کے لئے اپنی بیٹی کو، اپنی عزیز جان پنکی کو باپ کی شفقت سے محروم کر دوں، ایمن نے اپنا سامان پیک کیا، سوئی ہوئی پنکی کو گود میں اٹھایا، عامر ڈرائنگ روم میں شرمندہ سا ان دونوں کا منتظر تھا۔

ایمن نے ایک نظر کمرے کو دیکھا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دی، اپنی انا کو کمرے میں چھوڑ گئی تھی، اس کمرے میں لحہ یہ لحہ عامر کی بیوفائی پہ اس نے موت کی اذیت جھیلی تھی۔

اب اگر وہ انا کو نہ چھوڑتی تو بیٹی کو چھوڑنا پڑتا، اس نے انا اور بیٹی کی خوشیوں میں سے انا کو چھوڑ دیا تھا بیٹی کی خوشیوں کو اپنا لیا تھا۔

☆☆☆

مسیحائی

مہک فاطمہ

http://readingpk.com

''رجو کا تو کچھ نہ پوچھیں چودھرانی جی! ہر ایک سے لڑنا جھگڑنا تو پہلے ہی اس کا وتیرہ تھا اب جب سے گاؤں میں اپنی ہٹی (دکان) بنالی ہے دماغ ہی ساتویں آسمان پر ہے چار پیسے جو ہاتھ آ گئے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ۔'' پچو نے آہ بھری۔

''پہلے ہی گزارہ مشکل تھا اوپر سے بیچاری نے جان لے رکھی ہے کام کا حرج الگ، پیسے کا خرچ الگ، مجھ بیمار کی کچھ امداد کر دیں چودھرانی جی، خدا آپ کی حویلی میں خیر رکھے۔'' پچو جو چودھرانی فاخرہ کی خوشامد کرتے ہوئے پورے گاؤں کی ہر خبر بڑھا چڑھا کے سنا رہی تھی آخر اپنے مطلب پہ آ ہی گئی۔

''بس معلوم تھا مجھے یہ جو گھنٹے بھر سے تو اِدھر اُدھر کی لگا رہی ہے تیری تان اسی بات پر آ کے ٹوٹتی ہے۔'' فاخرہ بیزاری سے بولیں اسے مزارعین کی ہر وقت مانگنے کی عادت سے سخت چڑ تھی۔

پچو پہ کوئی خاص اثر نہ ہوا کیونکہ فاخرہ کا یہ رویہ معمول کی بات تھی وہ کچھ لمحے خاموش رہی ماحول میں رعب دار آواز کی سرسراہٹ باقی تھی۔

مہرو پاس بیٹھی فراغت بھرے انداز میں میگزین کی ورق گردانی میں مشغول تھی (وہ ان دنوں انٹر کے امتحانات کے بعد فارغ تھی) اس نے ایک نظر ماں کو دیکھا اور پھر پچو کے بےچارگی بھرے چہرے کو، وہ آنگن میں لگے شیشم کے پیڑ تلے بچھی چارپائیوں پر بیٹھی تھیں، ایک چڑیا چہچہاتے ہوئے آ کے پیڑ کی شاخوں میں پھدکنے لگی۔

''ہمیں تو جی آپ کا ہی آسرا ہے آپ کے سائے میں جو بیٹھے ہیں ہم۔'' پچو ایک بار پھر ہمت کر کے بولی اس کا انداز خوشامد اور بےچارگی بھرا تھا۔

چڑیا سبز پتوں کے بیچ نازک سی ٹہنی پر بیٹھی جھول رہی تھی۔

''آسرا صرف خدا کا ہوتا ہے ماسی پچو کسی اور کا نہیں۔'' مہرو نے اس کی سوچ کی تصحیح کی۔

''میں بھی تو خدا کے نام پر ہی مانگ رہی ہوں۔'' پچو نے موقف بدلا۔

''مانگنا تمہارا کبھی کبھار کا کام ہو تب ناں، تم تو ہر وقت ناک میں دم کیے رکھتی ہو۔'' فاخرہ کی بیزاری کم ہونے کو ہی نہیں آ رہی تھی۔

مہرو نے ایک بے بسی بھری نظر ماں پہ ڈالی اس کے اندر خوف خدا کی لہر اٹھی تھی، جھولتی چڑیا نے اڑان بھری اور آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی۔

فاخرہ کچھ تساہل کی بنا پہ بھی اسے ٹالنا چاہ رہی تھیں کیونکہ انہیں اٹھ کے وسیع صحن سے گزر کر کمرے میں جا کے پیسے لا کر دینے پڑتے، لیکن وہ بھی جانتی تھیں کہ پچو کتنی ڈھیٹ ہے وہ پیسے لئے بغیر ٹلنے والی نہیں اور پچو بھی جانتی تھی کہ چودھرانی باتیں تو سنائے گی لیکن بالآخر اس کا سوال پورا کر دے گی، کچھ ردوکد کے بعد فاخرہ نے مہرو کو اندر سے پیسے لا کر دینے کو کہا مہرو نے روپے لا کے ماں کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

''لو بھلا اتنے پیسوں کی کیا ضرورت تھی۔'' فاخرہ نے گھڑک کے بیٹی کو دیکھا اسی لئے وہ مہرو کو یہ کام کہنے سے گریزاں تھی لیکن سستی کی بناء پہ اسے ہی کہنا پڑا۔

''اماں اس سے کم پیسوں میں دوا نہیں آنی تھی اگر پیسے دینے ہی ہیں تو اتنے تو ہوں کہ وہ دوا لے سکے۔'' مہرو نے مدلل اور قائل کرنے کے انداز میں وضاحت کی۔

''ایک تو تمہاری یہ دریا دلی اور سخاوتیں نہیں ٹھہرتیں، باپ کی طرح۔''

مہرو کو سخاوت کی خوبی واقعی ہی اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی لیکن فاخرہ کا خیال تھا کہ ان کی معصوم بیٹی لوگوں کی عیاریاں سمجھنے سے قاصر ہے یہ غریب تو یونہی ڈھونگ رچا کے مال بٹورتے ہیں فاخرہ نے سر جھٹک کے پیسے پچو کی طرف بڑھائے اور ساتھ ہی لہجے میں کرختگی اٹھ آئی۔

''یہ لو، پکڑو۔'' دینے کے انداز میں تکبر اور تحقیر واضح تھی۔

''اگر تمہیں کسی کام سے حویلی میں بلایا جائے تب تو سو سو نخرے دکھاتی ہو گھنٹوں بعد اپنی مرضی سے آتی ہو اور جب کسی چیز کی ضرورت پڑے تب تو تمہیں پتنگے لگ جاتے ہیں ہم تو پھر بھی خدا واسطے کر کے تمہارا سوال پورا کر دیتے ہیں۔''

''وہ جی! اس جب حویلی میں مہمان آئے تھے تو آپ نے مجھے بلایا تھا تب میں بیمار تھی رانو مینو اچارہ کاٹنے گئی ہوئی تھیں۔'' پچو نے جھوٹ کی ملاوٹ کے ساتھ عذر پیش کیا حالانکہ رانو مینو گھر پر ہی تھیں لیکن پچو کے کہنے کے باوجود وہ حویلی نہیں آئیں۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے اب جاؤ اور ہاں کل رانو اور مینو بھیج دینا سفیان کے کچھ دوست آ رہے ہیں شہر سے کھانا وغیرہ بنانا ہے، کافی کام ہو گا شرفاں (حویلی کی کل وقتی ملازمہ) سے کہاں سنبھالا جائے گا سارا کام۔''

''جی اچھا۔'' پچو یہ کہہ کر اٹھ گئی۔

مہرو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ پچو میں کو دیئے جانے والے پیسے، خیرات تھی یا بیگار کی پیشگی اجرت۔

اگر خیرات تھی تو کیسی خیرات؟ خدا تو یہ تک گوارا نہیں کرتا اس کے نام پہ کچھ دے کر اشارتاً بھی بتایا جائے کجا تحقیر ریا کاری اور غرور......؟

☆☆☆

چودہری کرم داد کا شمار علاقے کے بڑے زمینداروں اور معزز ترین لوگوں میں ہوتا تھا ان کی خاندانی روایات کے مطابق کسی سوالی کو در سے خالی ہاتھ لوٹایا جانا گویا گناہ کبیرہ کے مترادف تھا ان کی بیوی فاخرہ بہ حیثیت بہو حویلی کی اس روایت کو نبھانے پہ مجبور تھیں ورنہ اگر ان کا بس چلتا تو ہر سوالی کو ایسی کھری کھری سنا کے خالی ہاتھ بھیجتیں کہ دوبارہ کوئی در پہ آنے کی جرأت نہ کرتا۔

شام دھیرے دھیرے شفق کے پردوں سے سرکتی رات کا پیرہن اوڑھ رہی تھی سرخ اینٹوں والے آنگن میں پانی کے چھڑکاؤ سے کچی مٹی کی مدہم مہک چار سو پھیل گئی۔

پانی کی دھار پڑتے ہی دھوپ سے جھلسی زمین اندر کا غبار جس کی صورت فضا میں خارج کرنے لگتی، ٹالی کے پتے ساکت اور خاموش تھے، ہوا کی مہربانی کے منتظر، صحن کے وسط میں ایک قطار سے رنگین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔

پچو کی بیٹی رانو فاخرہ بیگم کی نظر سے بچتی مہرو کی طرف آئی فاخرہ بیگم صحن کے دوسرے کونے میں لگے واش بیسن پہ منہ دھو رہی تھیں۔

''باجی مہرو!'' رانو کی آواز پر مہرو نے موبائل سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا رانو چارپائی کی پائنتی پہ ٹک گئی اس کے ہاتھ میں دو برتن تھے۔

''باجی مہرو! پورا ہو گیا آپ کا یہ قمیض جو آپ سلائی کر رہی تھیں۔'' اس نے مسکرا کے پوچھا وہ مہرو کی ہم عمر تھی اس لئے کچھ بے تکلفی بھی تھی رانو نے پاس پڑا قمیض کھولا۔

"باجی یہ تو بہت سوہنا (خوبصورت) بنا ہے۔" قمیض واقعی ہی بہت نفاست اور مہارت سے سلا تھا لیکن رانو کے ستائشی انداز میں خوشامد کا عنصر زیادہ تھا جواباً مہرو کے چہرے پہ گہری سی مسکراہٹ ابھری۔

جدید ڈیزائنگ کے ساتھ کپڑے سلائی کرنا اس کا شوق تھا۔

رانو نے قمیض تہہ کرتے ہوئے چونکی سے نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا، وہ فاخرہ کے وہاں آنے سے پہلے اپنا مدعا بیان کر دینا چاہتی تھی اسی لمحے مہرو کی نظر اس کی انگلی پر لگے زخم پر پڑی۔

"یہ تمہارے ہاتھ پہ کیا ہوا ہے۔" مہرو کے چہرے پر ترحم امیز سی فکر مندی کے تاثرات ابھرے۔

"یہ واڈی (گندم کی کٹائی) کرتے ہوئے درانتی لگ گئی تھی۔" رانو نے بتایا مہرو کی نظر ہنوز اس کی انگلی پہ تھی زخم گہرا ہونے کے ساتھ ریشے سے بھر چکا تھا۔

"کوئی مرہم پٹی وغیرہ کرنی تھی۔" مہرو نے جیسے پوچھا تھا۔

"ہاں جی کی تھی پٹی بھی اب اتار دی ہے، ہاتھ بہت دکھتا ہے۔" رانو نے بے چارگی سے بتایا۔

"تم پانی میں ہاتھ مت ڈالا کرو اس سے انفکیشن بڑھتا ہے۔" مہرو نے احتیاطی تدبیر بتا کے ہدایت کی۔

"کیا لینا ہے رانو ہے۔" فاخرہ اس کے سامنے کھڑی روکھے لہجے میں پوچھ رہی تھیں اسے کمی کمینوں کا یوں مہرو کے ساتھ بے تکلف ہونا بالکل پسند نہیں تھا۔

"وہ جی! اماں آج دوائی لے کر آئی ہے ڈاکٹر نے دوا دودھ کے ساتھ لینے کو کہا ہے تھوڑا سا دودھ چاہیے اور برف بھی۔" رانو نے جھجک اور بوکھلاہٹ کے ساتھ کہا دوپہر اور شام کو برف لینا تو ویسے بھی اس کا معمول تھا برف دینے پر فاخرہ کچھ نہ کہہ سکتی تھیں کیونکہ یہ چوہدری صاحب کا حکم تھا کہ مزرعین کو برف لازمی فراہم کی جائے۔

"غضب خدا، دودھ ابھی دھو کے گھر آیا نہیں اور تم پہلے ہی برتن اٹھا کے سر پہ آن کھڑی ہوئی ہو۔" وہی برہمی وہی ناگواری۔

پھر دودھ گھر آنے پہ فاخرہ نے تقریباً ایک کلو سے زیادہ دودھ اس کے برتن میں ڈالا لیکن سنا کے۔

"رانو کو شہر کے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے اس کے ہاتھ کا زخم بہت خراب ہو گیا ہے۔" تیسرے دن پینو پھر اپنا مدعا لئے فاخرہ کے سامنے بیٹھی تھی۔

"آج پھر پیسے مانگنے آ گئی ہو نہ میں پوچھتی ہوں تم لوگ جو کچھ کماتے ہو وہ کون سے کنویں میں جاتا ہے۔" فاخرہ سیخ پا تھیں۔

"ہم تو جی روز نیا کنواں کھود کے پانی پینے والے لوگ ہیں یہ بیماریاں تو بڑوں بڑوں کو لاچار کر کے رکھ دیتی ہیں، کجا ہم غریب، پتہ نہیں عقل کی اندھی نے کیسے درانتی ہاتھ پہ لگوا لی۔" اس نے رانو کو کوسا۔

"یہ سب بہانے بازیاں ہیں کام سے بچنے کے لئے کوئی کام بھی ٹھیک نہیں ہوتا ہے اس بدنیتی سے بس کہتی ہے چارپائی پہ بیٹھے ٹھونسنے کو ملتا رہے وہ بھی مانگ تانگ کے۔" فاخرہ نے اپنے غصے کا ابال پینو پہ انڈیلتے ہوئے چند روپے تھما ہی دیئے، پینو نے گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں پیسوں کو گنا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں رقم اس کی ضرورت کافی کم تھی۔

"تھوڑے پیسے اور دے دیں جی، اپنے بچوں کا صدقہ سمجھ کر خدا آپ کی حویلی کی خیر رکھے۔" اس نے بڑے دل سے دعا دی لیکن اس کی مراد پوری نہ ہو سکی۔

درباروں پہ جا کے دعاؤں کی قبولیت کے لئے ہزاروں کا نذرانہ پیش کرنے والے لوگ در پہ آ کے دعائیں دینے والے ضرورت مند کے دامن میں چند سکوں سے زیادہ ڈالنے کے متحمل کیوں نہیں ہوتے، شاید انہیں ان کی زبان سے نکلی دعاؤں کی قبولیت پہ یقین نہیں ہوتا، یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ چند سکے ان تک آنے والی اذیتوں کے درمیان ڈھال ثابت ہونگے۔

پینو مایوسی سے قدم اٹھاتی باہر کی جانب بڑھنے لگی، اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتی مہرو سے پینو کی حالت زار دیکھی نہ گئی دفعتاً کسی احساس کی، نے اسے متحرک کیا وہ تیزی سے چلتی باہر آئی صحن میں بیٹھی فاخرہ نے اس کے تاثرات پہ غور نہیں کیا مہرو نے اندرونی صحن عبور کر کے بیرونی صحن میں قدم رکھتے ہی پینو کو آواز دی۔

"ماسی پینو یہ پیسے رکھ لو، رانو کی دوا لے لینا اور ہاں اماں کو مت بتانا۔" مہرو نے تاکید کی۔

پینو تشکر سے لبریز محبت بھری نگاہوں سے اس پیاری اور معصوم صورت لڑکی کو دیکھ رہی تھی جو اس کے لئے مجسم مسیحائی کھڑی تھی۔

"خدا تجھے صدا خوش رکھے میری تی رانی، تو نے میرا احساس کیا خدا تجھے ہر مصیبت سے بچائے رکھے۔" وہ پیسے دوپٹے کے پلو سے بندھ کر دعائیں دیتی رخصت ہو گئی۔

مہرو نے پرسکون سا سانس بھرا اسے اپنے اندر طمانیت کی لہر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆☆☆

"اماں بھائی سے کہیں ناں وہ مجھے بھی ساتھ شہر لے جائے سبین (خالہ زاد) کی سالگرہ ہے اس نے مجھے سپیشل فون کر کے کہا ہے آنے کو۔" مہرو اکثر بھائی کے آگے ماں کو ہی سفارشی بنایا کرتی تھی، سفیان کمرے میں تیار ہو رہا تھا جب فاخرہ نے اس سے پوچھا۔

"کدھر جا رہے ہو سفیان اور کب تک واپس آؤ گے؟"

"میں شہر تک جا رہا ہوں شام سے پہلے تک واپس آ جاؤں گا۔" سفیان نے سفید کلف لگے سوٹ کی آستین بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا خیر سے جاؤ۔" فاخرہ نے اس کے کڑیل وجود سے نظر چرائی وہ بھی ایسی ہی ماں تھی جو جوان بیٹوں کے وجود کو نظر بھر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا پاتیں جیسے اپنی ہی نظر لگ جانے کا خوف ہو۔

"یہ مہرو کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔" فاخرہ کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ سفیان بول پڑا۔

"اماں میں مہرو کو ساتھ نہیں لے جا سکتا میں بائیک پہ جا رہا ہوں گاڑی تو ابا جی لے گئے ہیں۔" وہ جوتے کے تسمے بند کرتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں بول رہا تھا۔

"لیکن بیٹا مہرو نے تو آج ہی جانا ہے آج سبین کی سالگرہ ہے ناں، اس نے فون پہ مجھے بھی کہا ہے کہ میں مہرو ضرور بھیجوں۔" فاخرہ نے وضاحت دی۔

"سبین کی سالگرہ۔" سفیان کی دھڑکنوں کو اچھوتا سا احساس چھو گیا چلو اسی بہانے دیدار یار بھی ہو جائے گا ویسے تو وہ شاید مہرو کو ساتھ لے جانے کے لئے رد و کد سے کام لیتا لیکن اب بخوشی رضامند ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے اماں لے جاتا ہوں اسے بھی

ساتھ ہو جائے تیار جلدی سے۔" سفیان نے جیسے کمال فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔

فاخرہ نے مہرو کو خریداری کے لئے بھی رقم تھما دی مہرو کو لگا پچو کو دیئے جانے والے چند کئی گناہ بڑھ اسے واپس مل گئے ہیں۔

گاؤں کی سولنگ والی سڑک ختم ہوئی تو اسفر نے بائیک شہر کی پکی سڑک پہ ڈالی جس کا کچھ حصہ خراب تھا، بالائی سطح سے بجری اکھڑی ہوئی تھی سڑک کے کنارے بائیک پھسلنے لگی اسفر نے کنٹرول کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن بائیک قابو سے باہر ہوتی گئی۔

مہرو کا دل خوف سے تیز دھڑکنے لگا چڑر چڑر کی آوازیں اور پھر اگلے ہی لمحے مہرو اچھل کر بازیاں کھاتی سڑک کے کنارے کچی زمین پر جا گری۔

وہ جس لمحے سنبھل کے اٹھی اسے فوراً اپنی چادر درست کی سیفٹی پن سے کیا گیا نقاب تک کھل چکا تھا چادر کا صرف ایک پلو اس کے بازو رتھا پھر یہ احساس کیے بغیر کے اسے چوٹ کہاں لگی ہے وہ بھائی کی طرف لپکی۔

اسفر بائیک کے نیچے کراہ رہا تھا کچھ لوگوں نے اس کے اوپر سے بائیک ہٹائی اس کی ٹانگ لگنے والے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔

ہسپتال سے مرہم پٹی کروانے کے بعد نوں کو گھر لایا گیا مہرو کے چہرے بازوؤں پہ رف معمولی خراشیں آئی تھیں۔

حادثے کی خبر سنتے ہی رشتہ دار اور گاؤں کی رتیں خبر گیری کے لئے حویلی چلی آئیں آنگن ا بھانت بھانت بولیاں تھیں، حادثے کے ے میں پوچھتیں تبصرے کرتیں مشوروں سے زتی عورتیں۔

لیکن ایک بات جو سب کے لئے باعث حیرت تھی کہ موٹر سائیکل کے حادثے میں پچھلی سواری کو چوٹ لگنے کا زیادہ احتمال ہوتا ہے لیکن مہرو کا تو خیر سے خاصا بچ بچاؤ ہو گیا تھا مہرو کو خود بھی یہی محسوس ہوا جیسے کسی غیبی مدد سے اسے بچایا ہو۔

"ہائے میرا تو دل ہول رہا ہے جوان پتر کو یوں چارپائی پر پڑا دیکھ کے کیسی مصیبت آ گئی بے چارے پہ پڑ جاتی۔ اس کا کوئی صدقہ وغیرہ دوا بھی۔" مہرو کی پھوپھی نے مشورہ بلکہ ہدایت دی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" فاخرہ بجھی ہوئی کمزور آواز میں بولی اور پھر اس نے کئی لال نیلے نوٹ سفیان کے سر پر سے وار کر خاص طور پہ پچو کو بلا کر اسے تھمائے کیونکہ اس وقت وہی سب سے زیادہ ضرورت مند تھی۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میری دھی تجھے کچھ نہیں ہوا۔" پچو نے تشکر بھری خوشی سے ایک طرف بیٹھی مہرو کو دھیرے سے کہا۔

"صدقہ سو بلا ٹالتا ہے۔" باہر صحن میں بیٹھی کسی عورت نے با آواز تبصرہ کیا۔

"ہاں واقعی صدقہ ہر آنے والی مصیبت کو ٹالتا ہے اور ہمیں خیال آتا ہے مصیبت آنے کے بعد صدقہ دینے کا۔" فاخرہ پشیمانی سے بول رہی تھیں۔

"لیکن خدا بڑا رحیم ہے اس نے بڑا کرم کیا جان بخشی کر کے میرے بچوں کی۔" فاخرہ کے دل میں جیسے کسی محاسبے کا آغاز ہونے لگا۔

☆☆☆

میرے بچے

فرحین اظفر

میں عورتوں کی اس قسم سے تعلق رکھتی تھی جو اپنے شوہر اور بچوں کی کارکردگی سے کبھی مطمئن نہیں ہوتیں، شوہر کی تو چلو خیر تھی، وہ بے چارے پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھے، جاب اچھی تھی، لیکن تنخواہ...... وہ اتنی اچھی نہیں تھی اور پھر بھی کمپنیوں کے مالک اپنے ورکرز سے جس طرح گدھوں کی طرح دن رات کی تفریق کے بغیر کام لیتے ہیں، اس حساب سے تو بہت ہی کم تھی، بس گزارا ہو جاتا ہے۔

میں ایک غیر مطمئن لیکن شکر گزار عورت تھی، جو ملا ہے اس پر شکر کرتے جاؤ لیکن آگے بڑھنے کے لئے جدوجہد کرنا نہیں چھوڑو، ذاتی زندگی میں شادی سے پہلے میرا یہی موٹو تھا، بعد میں میں نے اپنے شوہر اور بچوں پر بھی تھوپ دیا، شوہر صاحب محنتی تھے، محنت سے نہ گھبراتے تھے نہ جی چراتے تھے، سو ان کی لگن اور محنت سے گھر کا انتظام بخیر و خوبی چل ہی رہا تھا، بس یہ میری کی بے چین طبیعت ہی تھی، جو مجھے کسی پل سکون نہیں لینے دیتی تھی۔

☆☆☆

"مجال ہے جو اسکول سے آ کر ایک بار صرف ایک دن اپنی زندگی کے کسی ایک دن، ان لڑکوں نے یونیفارم اور جوتے جگہ پر رکھے ہوں۔" بچے اسکول سے آ چکے تھے اور امی کی آواز بخوبی سن رہے تھے، جو کلستی ہوئی انہیں ڈائننگ ٹیبل پر کھانا دینے کے بعد ان کے کمرے کا پھیلاوا دوسری بار سمیٹ رہی تھی۔

"اس قدر ڈھیٹ اور بے غیرت اولاد کسی کی نہیں ہو گی۔" کبھی کبھی میں بالکل ہی پٹڑی سے اتر جاتی اور گالم گلوچ شروع کر دیتی، جیسے کہ اس وقت۔

"ٹیپو کے بچے الو کے......" اس کی چیخ نما دھاڑ پر ٹیپو اور بلال دونوں ہی ہڑبڑا گئے۔

"میں نے کہاں لگایا تھا کھانا۔" وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل سے پلیٹیں اٹھا کر لاؤنج میں فلور کشن پر ڈھیر ہو چکے تھے، ٹی وی سامنے چل رہا تھا اور ہاتھ پلیٹوں میں۔

"امی بھئی مجھے اپنا فیورٹ کارٹون دیکھنا تھا۔" ٹیپو نے حسب عادت تنک کر اس کی بات کا پس منظر جان کر جواب دیا، وہ بری طرح بھنا کر رہ گئی، حد ہو گئی یعنی کہ ماں کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

"اگر ایک بھی نوڈل میں نے کہیں بھی گرا ہوا دیکھ لیا تو تمہاری خیر نہیں۔"

"اچھا ناں ماما پلیز سامنے سے ہٹیں۔"

میری بات تو خیر کیا سنی تھی انہوں نے اور الٹا مجھے ٹی وی اسکرین کے سامنے سے ہٹانے لگا، بلال البتہ خاموشی اور تیزی سے کھانا ختم کرنے میں لگا ہوا تھا، اس کا حلیہ بھی غصہ دلانے کے لئے کافی تھا، بدن کے اوپر شرٹ ندارد اور صرف پینٹ میں ملبوس وہ بھی اسکول یونیفارم کی۔

"اے بھوکے ندیدے، کتنے دن سے کھانا نہیں ملا تجھے ہیں۔" بالکل جاہل گنوار عورتوں کی طرح میں نے اس کے آگے سے پلیٹ جھپٹی اور غرائی۔

"ماما ابھی چینج کرتا ہوں پلیز بہت بھوک لگی ہے، دے دیں ناں بھئی۔" ٹھیک ہی کہہ رہا تھا وہ، میں نے گھورتے ہوئے پلیٹ واپس کی اور پیر پٹختی ہوئی بیٹی کے کمرے میں آئی، ان دونوں نے کھانا وہیں بیٹھ کر کھانا تھا وراسی حلیے میں کھانا تھا اف۔

"مومی! تم نے اب تک چینج نہیں کیا، اف خدایا۔" طیش اور غصے کے مارے مجھے غش آنے کو تھا، کس طرح کے بچے تھے یہ، اسکول سے آ کر پسینہ سے بھیگتے کپڑے اتارنے کو ان کا دل ہی نہیں کرتا تھا، ایک گھنٹہ تو روز اسی بحث کی نظر ہو جاتا کہ یونیفارم چینج کر کے فوراً نہاؤ یا کم سے کم منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھانے بیٹھو، ہزار مرتبہ چلانے کے بعد صرف اتنا ہو پاتا کہ ٹیپو بمشکل ہاتھ دھو لیتا اور بلال کبھی شرٹ بدل لیتا اور کبھی صرف شرٹ اتار کر کھانا کھانے بیٹھ جاتا۔

تینوں بچوں کی پیدائش میں ایک ڈیڑھ سال سے زیادہ کا فرق نہیں تھا، یوں ان کی کلاسز بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہی تھیں، سب سے بڑا ٹیپو فائیو میں اور بلال اور مومل بالترتیب فور اور تھری کلاس میں تھے، یوں اگر دیکھا جاتا تو اتنے بڑے بچوں کو نہانے اور کپڑے بدلنے کے لئے کسی کے سہارے کی ضرورت ہی تھی، اسی طرح یہ اتنے ننھے بچے نہیں تھے کہ ان کو کھانا کھانے کے آداب اور ٹیبل مینرز سکھائے جاتے، عام طور پر اتنے بڑے بچے اگر کچھ تمیز دار ہوں تو اس عمر میں سیکھنے اور سکھانے کی فیز سے نکل کر ویل مینرڈ نہیں تو تھوڑے بہت تمیز دار تو ہو ہی جاتے ہیں مگر۔

مجھے تو لگتا تھا جیسے میں جانوروں کے درمیان کسی جنگل میں آ بسی ہوں۔

ٹیپو اور بلال بات بات جنگلیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے، حالانکہ کھیلتے مل کر ہی تھے، مگر لڑتے بھی اتنا ہی تھے اور جب لڑنے پر آتے، تو ایک دوسرے کو اتنی بری طرح پیٹ ڈالتے، جیسے آج ختم کر کے ہی دم لیں گے، میرا دل ہول جاتا اور اپنے بچے کی جگہ میری چیخیں نکل جاتیں، چلا چلا کر میرا گلا بیٹھ جاتا مگر مجال ہے جو ان کے کانوں پر جوں رینگ جائے۔

"ماما دیکھیں کتنی پیاری ڈرائنگ۔"

میری سوچوں کا تسلسل مومی کی آواز سے ٹوٹا، کلرنگ اس کا فیورٹ کام تھا، اس لئے اس نے گھر آتے ہی صرف واٹر کلر نکال لیے تھے بلکہ کلر کرتے میں رنگ برنگا پانی اپنے یونیفارم اور وائٹ ٹراؤزر پر بھی لگا لیا تھا۔

"ارے اللہ مومل منحوس ماری، یہ کیا کیا تو نے؟ سارے یونیفارم کا ناس کر لیا۔" بجائے اس کی ڈرائنگ دیکھنے کے میں نے اسی کی کمر پر ایک زوردار دھموکا جڑا، ڈرائنگ بک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گری۔

"کیوں، تیرے باپ نے لانڈری کھول رکھی ہے یہاں جو کپڑے دھلے دھلائے مل جاتے ہیں، یہ تیری ماں اپنی ہڈیاں گھستی ہے نامراد۔" میں مسلسل اس کی کمر پر تھپڑ لگاتی اسے واش روم میں لے کر گئی، اس نے بھی خوب واویلا مچایا ہوا تھا، گلا پھاڑ پھاڑ کر سر میں درد کر دیا تھا، لیکن میں نے پرواہ نہیں کی، کھینچ کھانچ کر کپڑے اتارے اور اسے شاور کے نیچے دھکیلا، اس کھینچا تانی اور دھکم پیل میں میرے بال بکھر گئے اور شاور کی پھوار نے کپڑوں کو بھگو دیا، ظہر کا ٹائم نکل رہا تھا اور میرے نماز پڑھنے کے دور دور تک کوئی آثار نہ تھے۔

لاؤنج میں ایک بھونچال آ چکا تھا، ٹیپو اور بلال گتھم گتھا تھے، صوفے پر نوڈلز کا پلیٹیں اوندھی پڑی تھیں۔

میں اپنا دل پکڑ کر رہ گئی، وہی ہوا جس کا ڈر تھا، الٹی پڑی پلیٹوں میں کھائے گئے کھانے کے نقش و نگار یقیناً صوفے کے کور پر رہ جانے تھے۔

میں خاموشی سے واپس مڑی اور جب دوبارہ ان دونوں کے سر پر پہنچی تو خالی ہاتھ نہ تھی، بلکہ میرے دائیں ہاتھ میں میرا مشہور زمانہ "مولا جٹ" لہرا رہا تھا، میرے دونوں جٹوں نے حواس

میں آ کر میری طرف دیکھا اور...... پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

☆☆☆

''آج آفس میں بھائی صاحب کا فون آیا تھا، کہہ رہے تھے تیمور سیونتھ کلاس میں فرسٹ آیا تھا تو اس کی کوئی خوشی نہیں کی تھی تو اس بار اس کی سالگرہ ذرا اہتمام سے منانے کا ارادہ ہے۔''

''ہاں آئی تھیں سیما بھابھی میرے پاس بھی۔'' میرے لبوں سے ایک آہ سی نکل گئی، صبح سے لے کر اب تک بات بے بات چڑھتے غصے کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی اور ایک الجھن کا سرا بھی مل گیا۔

''کہہ رہی تھیں، میٹرک میں تو پورے کراچی میں ٹاپ کرے گا تیمور، ہاں بھئی کہہ سکتی ہیں، کسی بڑے ہائی فائی ریسٹورنٹ میں پورے خاندان کی دعوت کا کہہ رہی تھیں، کر بھی سکتی ہیں، نہ ان کو پیسے کی کوئی کمی، نہ ان کی اولاد میں۔'' استری کا پلگ نکال کر میں بیڈ پر آ بیٹھی۔

''اوہ تو یہ وجہ تھی جو آپ نے آج بلال اور ٹیپو کو اس طرح دھنک کر رکھ دیا۔''

''اونہہ۔'' ناصر نے تو جیسے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔

''اپنے بچوں کا تو نام مت لیں، اس قدر ڈھیٹ اور بدتمیز ہیں کہ توبہ، اسی سے اندازہ لگا لیں کہ یا تو گھر سے باہر ہوں یا سوئے پڑے ہوں تو گھر میں سکون رہتا ہے ورنہ...... توبہ میری توبہ۔''

''وہ صرف میرے نہیں آپ کے بھی بچے ہیں۔''

''ہاں اسی بات کا تو رونا ہے سارا۔'' میرے تبصرے بڑے دل جلے تھے۔

''اب اس میں رونے کی کیا بات ہے خدا کا شکر کیا کرو۔''

''جی جی شکر ہی کرتی ہوں کہ صرف تین ہی دیئے اگر دے دیتا ناں ان جیسے دو بھی اور تو میں تو پاگل ہی ہو جاتی اور رونے کی کیا بات کر دی آپ نے، آپ خود تو سارا سارا دن آفس میں گزارتے ہیں، ذرا رہیں ناں چوبیس گھنٹے گھر میں لگ پتہ جائے کیا حرکتیں ہیں۔'' میں نے بمشکل اپنی چلتی زبان کو قابو میں کیا، بس نہیں چل رہا تھا کہ تینوں کو کچا چبا ڈالوں۔

''ارے بھئی ایسی بھی کیا حرکتیں ہیں، ساری دنیا کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''جی نہیں ساری دنیا کے بچے نہیں۔'' میرے تو تلووں سے لگی اور......

''ذرا اپنے بھائی صاحب کے بچوں کو ہی دیکھ لیں، مجال ہے جو ماں سے ذرا بھی بدتمیزی کر جائیں آنکھوں میں رکھتی ہیں وہ بچوں کو آنکھوں میں اور ان کی ابرو کے اشارے پر چلتے ہیں، چاروں اور پڑھائی میں بھی اے ون اور ایک یہ ہیں، اسکول سے آ کر جو بستہ کسی بوجھ کی طرح زمین پر پٹخیں گے تو پورا دن گزر جائے گا، دوسرے دن اسکول کا ٹائم آ جائے لیکن انہیں اسکول بیگ اٹھانے کیا ہلانے تک کا خیال نہیں آتا، تو جنہیں ہلانے کا خیال نہیں آتا، وہ پڑھائی کیا خاک کریں گے، بیگ کھلتے ہی منہ بسور لیتے ہیں، ٹیسٹ کے علاوہ کبھی کچھ یاد کرنا پڑ جائے تو باقاعدہ رونا پیٹنا مچ جاتا ہے...... ہونہہ...... ساری دنیا کے بچے۔'' میری بات ختم تو نہ ہوئی البتہ بڑبڑاہٹ میں ڈھل گئی۔

''بھائی صاحب کے بچے بڑے ہیں، انہیں تعلیم کی اہمیت کا شعور ہے یہ ابھی بچے ہیں سمجھ جائیں گے۔''

''ہیں......؟'' میں نے ان کی بات پر ان کو

یوں دیکھا جیسے اللہ معاف کرے کوئی کسی پاگل کو دیکھتا ہے۔

''بات سنیں، تیمور اور ٹیپو میں صرف دو سال کا فرق ہے، بیس سال کا نہیں، کہ بیس سال بعد شاید اسے کچھ شعور اور تمیز آ جائے جس کی مجھے تو کوئی امید نہیں۔''

''آپ تو ان کی ماں ہیں، آپ خود ہی ایسی مایوسی کی باتیں کریں گی تو انہیں ان کی تربیت کیسے کریں گی۔'' ناصر نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کر کے تفکر سے میری طرف دیکھا، میں ان کے انداز پر فدا ہی ہو گئی، ماشاء اللہ، یعنی انہیں کوئی بات اگر فکر آمیز لگی تھی تو صرف یہ کہ میرا انداز فکر مثبت نہ تھا۔

''میرے بارے میں بولنا اور سوچنا چھوڑ دیں آپ، میں آئندہ اگر کچھ سالوں تک زندہ بھی بچ گئی ناں تو بڑی بات ہ، پورا دن گزر جاتا ہے ان منحوسوں کے پیچھے اپنی ہڈیاں گھساتے ہوئے، ایک سے ایک فرمائشی کھانا ہمیشہ وقت پر تیار ملتا ہے اور ان کا یہ حال ہے کہ ٹی وی کے آگے کھڑی ماں کو ایک لمحے کے لئے برداشت نہیں کر سکتے ابھی سے...... ابھی سے یہ چھن ہیں تو پھر میرا بڑھاپا تو خوار ہی ہو گا ناں۔'' میں اتنے کمزور اعصاب کی عورت نہیں مگر اس وقت پتہ نہیں کیوں مجھے رونا آ گیا۔

''ارے کیا کر رہی ہو پاگل ہو گیا، بچوں کی بات پر یوں دلبرداشتہ نہیں ہوتے۔''

''اب تو صرف یہی کر سکتی ہوں میں، جب سے پیدا ہوئے ہیں تب سے پرورش اور تربیت کر رہی ہوں اور ایسا لگتا ہے الٹا اثر ہو رہا ہے، کم بختوں پر، لڑیں گے تو ایسے جیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں، اتنی بری طرح مکے، لاتیں چلاتے ہیں خدانخواستہ۔'' میں سوں سوں کرتی جلدی سے ناصر کے کندھے سے آن لگی، ہمدردی اور محبت بھری توجہ کے لئے لمحات کم ہی نصیب ہوتے تھے۔

''تو آپ انہیں پاس بٹھا کر بٹھا کر پیار سے سمجھائیں ناں۔''

''کیا؟'' میں بری طرح بدک گئی، کرنٹ کھا کر دور بھاگی۔

''سچ کہوں تو یہ سب آپ کی ڈھیل کا نتیجہ ہے، نہ آپ بچوں سے اتنے غافل رہتے نہ یہ دن دیکھنے پڑتے، ارے اگر دنیا کے سارے بچے ایسے ہوتے ہیں ناں تو دنیا کے سارے باپ آپ جیسے نہیں ہوتے، شیر کی نگاہ رکھتے ہیں بچوں پر، ماؤں کو تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' میری توپوں کا رخ ناصر کی طرف مڑ گیا تھا۔

ناصر نے کوئی جائے پناہ دیکھ کر جلدی سے ٹیبل لیمپ آف کر دیا، نیم اندھیرے کمرے میں اب بھی میری دل جلی بڑبڑائیں منمنا رہی تھیں۔

☆☆☆

اپنے بچوں سے میری شکایات اگر دیکھا جاتا تو کوئی غلط یا بے جا نہیں تھیں، اوپر سے اپنی جیٹھانی سیما بھابھی کے بچوں کو دیکھ دیکھ کر ان میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا، لوگ کہتے تھے آج کل لڑکیاں پڑھائی میں لڑکوں سے تیز ہیں مگر مجھے یہاں بھی ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے، بیٹی بھی مارے باندھے صرف اسکول کا کام نمٹا کر وہ کلرنگ کرنے بیٹھ جاتی۔

بے رنگ تصویروں میں رنگ بھرنا اس کا پہلا اور آخری شوق تھا، لاکھ سر پیٹنے پر وہ ہر کلاس میں آخری پانچ بچوں کی فہرست میں جگہ لے پاتی ہر بار اس کی رپورٹ کارڈ پر ''مزید محنت کی ضرورت ہے'' لکھا ہوتا۔

وقت گزری زندگی سے چند سال اور آگے

چرا کرلے گیا، ٹیپو ایٹتھ کلاس میں اور باقی دونوں اسی کے پیچھے پیچھے چلتے آگے بڑھ رہے تھے، جب ایک دن خبر ملی کہ سیما بھابھی کے تیمور نے میٹرک میں کراچی بورڈ میں ٹاپ کیا ہے نوے فیصد سے بھی کہیں آگے اس کی پرسنٹ ایج بن رہی تھی، انہوں نے اپنے بیٹے کے اعزاز میں ایک شاندار ڈنر خاندان والوں کو دیا، مٹھائیاں، تحفے، مبارکبادیں، پھولوں کے ہار اور بھائی صاحب اور بھابھی کے فخر وغرور سے تنتے، خوشی سے تمتماتے چہرے دیکھ کر صحیح معنوں میں میرے اوپر اوس سی گر گئی۔

میں نے رشتے دار خواتین کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے ہوئے ہال میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، بلال اپنے چند کزنز کے ساتھ کھڑا یقیناً کسی نئے کمپیوٹر سافٹ ویئر کے متعلق بات کر رہا تھا، جبکہ موی حسب عادت گپیں ہانک رہی تھی۔

بھلا میرے بچے کبھی تعلیم کے بلکہ تعلیم کو چھوڑ کے زندگی کے کسی بھی میدان میں اس طرح تیر مار سکیں گے؟ شاید کبھی نہیں، دل گرفتہ کی آزمائش کا سامان ہوا جاتا تھا، تیمور تو ان کا بڑا بیٹا تھا، تیمور سے چھوٹی الشبہ عرف شیبا بھی کسی سے کم نہیں تھی، پھر ٹیپو کے ساتھ کا تھا ہمایوں اور موبل کے ساتھ کی مفراح، جو ابھی سے ہر سال پورے سکول میں ٹاپرز اسٹوڈنٹ میں شمار ہوتی تھی۔

خیر اتنے اچھے آؤٹ اسٹینڈنٹ بچوں کے ں باپ کون سے کم تھے، بھائی صاحب کی جوانی ں ہی گورنمنٹ جاب لگ گئی تھی اور اب وہ ترقی رتے کرتے انیسویں گریڈ کے افسر بن چکے ے، بھابھی کی پرسنالٹی بھی دن بدن نکھرتی جا رہی ی اور ان کی عمر بھی کون سی زیادہ تھی، کاپر کلر کی فون سلک کی ساڑھی میں ہی ان کی شخصیت کا رم جھلک رہا تھا۔

"نوبل فیملی" بلا ارادہ میرے منہ سے نکلا اور میں جانے حسد کا شکار ہو کر یا رشک کا، کھانا کھاتے وہاں سے اٹھ آئی۔

☆☆☆

دو سال مزید گزرے تو تیمور نے انٹرمیڈیٹ ایگزام میں بھی نمایاں پوزیشن حاصل کی، ٹیپو اور بلال نویں، دسویں کے اسٹوڈنٹ تھے اور موبل آٹھویں میں، ٹیپو اور بلال کی کم و بیش وہی حرکتیں تھیں، بس ہاتھا پائی میں کمی آ گئی تھی، البتہ جب لڑائی ہوتی تو خوب زور دار بحث اور تکرار کے بعد بالآخر مجھے ہی درمیان میں کود کر انہیں خاموش کرانا پڑتا۔

"امی تیمور بھائی ہائیر اسٹڈیز کے لئے باہر جا رہے ہیں، ان کے ماموں بلا رہے ہیں، انہیں وہاں۔"

"ہاں تو ظاہر ہے اتنا قابل بچہ ہے، تم لوگوں کی طرح تھوڑی ایک سے بڑھ کر ایک۔" دل کو لگنے والے دھکے سے سنبھل کر میں نے اپنے تاثرات چھپائے اور دونوں بیٹوں پر ایک نظر ڈالی، وہ میری طنزیہ نظروں سے بے نیاز آپس میں ہی کسی بات پر الجھے ہوئے تھے۔

"یا اللہ ایک یہ میرے بچے ہیں، میری بات سننا تک گوارا نہیں کرتے۔" وہ چڑ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

پتہ نہیں کیوں لیکن میں ہر وقت اپنا، اپنے گھر اور بچوں کا موازنہ سیما بھابھی سے کرتی تھی، شاید اس لئے کہ ہماری بہت قریبی رشتے داری تھی اور دنیاوی کامیابی کی دوڑ میں وہ مجھ سے کہیں آگے تھیں، مگر مجھے خود ہر افسوس بھی ہوتا تھا، کیونکہ ان پر رشک کرتے کرتے میرے جذبات میں حسد کے رنگ گھل جاتے اور مجھے اندازہ تک نہ ہوتا تھا اور شاید اس لئے بھی کہ شوہر

کی آمدنی تو چلو عورت کی قسمت سے ہوتی ہے، لیکن میرے بچوں نے بھی مجھے کبھی خود پر اترانے کا موقع نہیں تھا، میرے لاکھ محنت کرنے اور شور مچانے پر بھی وہ ایوریج اسٹوڈنٹ تھے اور ایوریج ہی رہے۔

"امی سیما آنٹی کہہ رہی تھیں کہ وہ شیبا آپی کو بھی تیمور بھائی کی طرح باہر بھجوا دیں گی۔"

"ہوں...... ں۔" میں اندر سے ایک دم بجھ سی گئی، اگر میرے بچے اس قابل ہوتے بھی تب بھی ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں تھا کہ ہم ان کی تعلیم کا اتنا خرچ برداشت کرتے۔

"امی شیبا آپی! اتنی دور اکیلی رہ لیں گی۔" موبل کسی کے جی کے اسٹوڈنٹ کی طرح تھوڑا ڈر کر اور تھوڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی، میں ایک دم سے جیسے کسی گہری سوچ سے چونک گئی۔

☆☆☆

تیمور کے ملک سے باہر جانے پر مجھے جو جھٹکا لگا تھا وہ تو کچھ بھی نہیں تھا، ابھی تو اس سے کہیں بڑے جھٹکے میرے منتظر تھے۔

ایٹتھ اسٹینڈرڈ پاس کرتے ہی موبل نے اعلان کر دیا کہ وہ نائنتھ کلاس میں سائنس کے بجائے آرٹس جیکٹس رکھنے والی ہے، مجھے تو غش ہی آ گیا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے موی، کیا بکواس کر رہی ہو۔"

بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد جہاں ان کی بدتمیزیاں ذرا کم ہو گئی تھیں، وہیں میں نے ان کو گالیاں دینا بھی کم کر دی تھیں، خاص طور پر دونوں لڑکوں کو۔

اپنے کندھوں سے باہر نکلتی اولاد کو دیکھ کر ماں انہیں سرزنش کرتے وقت شاید یونہی سوچ و بچار میں پڑ جاتی ہے۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں ماما، میں اپنی مرضی اور پسند کے سبجیکٹس پڑھوں گی اور آپ تو جانتی ہیں مجھے فائن آرٹس کے علاوہ کسی شے میں انٹرسٹ نہیں۔"

میرا موڈ خراب ہو گیا، میں نے ناصر سے بات کی لیکن وہ بھی موبل کی طرفداری کر رہے تھے، میں نے خاموشی اختیار کر لی، کیونکہ میں جانتی تھی، کہ سائنس جیسے خشک اور مشکل مضامین کی پڑھائی موبل کے دماغ میں نہیں سما سکتی، موبل کا لیا گیا فیصلہ میرے لئے کسی کڑوے گھونٹ سے کم نہیں تھا، جو میں بہت صبر اور تحمل کے ساتھ ساتھ حلق سے اتارا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بھابھی کی گردن میں سریے کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی کافی دھار لگ چکی تھی، اب وہ جب بھی ملتیں بچوں کی پڑھائی کے حوالے سے کوئی نہ کوئی چوٹ کر جاتیں، میرے پاس دل مسوسنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اور پھر ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔

☆☆☆

"تم...... تم پاگل تو نہیں ہو گئے بلال۔"

یہی الفاظ میرے تب تھے جب موبل نے آرٹس لینے کی بات کی تھی، لیکن تب کی نسبت اب صدمہ بہت بڑا تھا، کیونکہ بلال کسی مضمون کی تبدیلی کی نہیں بلکہ پڑھائی چھوڑنے کی بات کر رہا تھا۔

"نہیں...... نہیں بلال! میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی، تمہارا دماغ چل گیا ہے، ارے انٹرمیڈیٹ تو جاہل کہلاتے ہیں آج کل اور تم......"

"ماما پلیز میں پڑھائی چھوڑ نہیں رہا پرائیویٹ پڑھ لوں گا ناں۔"

''نہیں تم نہیں پڑھو گے، ایک بار ان کام دھندوں میں لگ گئے تو بس پڑھ چکے تم، میں کیا جانتی نہیں ہوں تم کو، یہ سب کھڑاگ ہے ہی پڑھائی چھوڑنے کا بہانہ۔''

وہ اپنے کسی دوست کی مدد اور تعاون سے کمپیوٹر سوفٹ ویئر اور ہارڈ ویئر ریپرنگ کی دوکان کھولنا چاہ رہا تھا، ابھی سے اتنی جلدی صرف انٹر کے بعد، میں جتنا سوچتی میرا پارہ چڑھتا جاتا۔

''دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے اور انہیں دوکانداری سوجھی ہے۔''

وہ لاؤنج میں میرے سامنے ہی بیٹھا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا، گھسی ہوئی جینز اور پیروں کے بڑے ہوئے ناخن، تھکا ماندہ چہرہ، دھول مٹی ہوتے بال۔

آخر...... آخر وہ کرتا کیا پھر رہا تھا، کہاں کہاں کی دھول خاک چھان رہا تھا اور کیوں۔

''تم کتنے گندے حلیے میں پھر رہے ہو بلال، جاؤ جا کر باتھ لو اور چینج کرو۔'' میں نے ناگواری سے کہتے ہوئے اسے جھڑک دیا، وہ جو فون بند کر کے مجھ سے کچھ اور بات کرنے چاہ رہا تھا جھلا کر اٹھا۔

''اور یاد رکھنا اس بات کو یہیں ختم کر دو، تم کوئی دوکان وکان نہیں کھول رہے۔''

''میں نے آپ کو اطلاع دی ہے، اجازت نہیں لی ہے آپ سے۔'' میں صوفے پر بیٹھی تھی اور وہ سامنے ہی کھڑا تھا، اچانک جس طرح غصے میں اس نے مجھ سے بات کی، مجھے اس کا قد ہمیشہ سے زیادہ لمبا محسوس ہوا، مجھے لگا جیسے وہ مجھ پر حاوی ہو گیا، ایکدم ہی، اچانک سے میں نے اسے گھورنا چاہا لیکن اس کی طرف دیکھ نہیں سکی۔

''اپنے باوا کو آنے دو انہی کو سنانا یہ خوش خبریاں اور جاؤ جا کر نہاؤ۔''

''جا رہا ہوں۔'' اس نے میری بات درمیان سے کاٹ دی اور میں جملہ مکمل کرنے کی بجائے جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

رات کافی بھیگ چکی تھی، میں کب سے ایک ہی زاویے پر بیٹھی، شام میں ہونے والی ٹیپو کی تکرار اور تیمور کو یاد کر رہی تھی، تیمور جب انٹر کرنے کے بعد باہر جا رہا تھا، تو ایک دن ایسے ہی شام کے وت مجھ سے ملنے آیا تھا، اس وقت وہ کتنا ویل منیرڈ اور ایجوکیٹڈ لگ رہا تھا، سلیقے سے جمے ہوئے بال، نظر کا رم لیس چشمہ، بلیک جینز اور بہت ہی ہلکی انگوری رنگ کی ٹی شرٹ، وہ بے حد مہذب اور آہستگی سے سلام کر کے لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا تھا اور بڑے شوق سے میرے ہاتھ کی بنی چائے پی کر گیا تھا۔

''کیا بات پریشان کر رہی ہے بیگم صاحبہ کو۔''

''آپ نے سنا بلال کیا کہہ رہا ہے۔'' میں نے سوچوں میں سے ابھر کر معاملہ ان سے ڈسکس کرنے کا سوچا۔

''ہاں مجھ سے بات کر لی ہے اس نے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی برائی ہے۔''

''کیوں برائی نہیں ہے، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے ناصر، یہ عمر کوئی نوکری کرنے کی ہے کیا، آرام سے اپنی پڑھائی میں دل لگائے۔''

''جو فیلڈ اسے پسند ہے، اس میں آگے بڑھنے دو، ہم زبردستی کسی بچے کو اپنی مرضی کی پڑھائی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔''

''اونہہ...... اپنی مرضی کیا، ہم اپنے بچوں کو پڑھائی کرنے پر مجبور کر ہی نہیں سکے، آپ کو نہیں پتہ کتنی بدتمیزی کی ہے اس نے مجھ سے شام میں۔'' میرا گلا رندھ گیا، بچے مجھ سے بحث و تکرار تو کرتے تھے، لیکن یوں منہ ماری کرنے کی عادت نہیں تھی مجھے۔

''بچہ ہے سمجھ جائے گا، تم ناراض رہو تو شرمندہ ہو گا۔''

''رہنے دیں بس۔'' میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

☆☆☆

موحل فائن آرٹس میں ایف ایس سی کر کے بی ایس سی میں آ گئی، بلال صبح دوپہر کے وقت کہیں دوکان پر جانے کے لئے نکلتا اور رات کو بارہ کے بعد گھر میں داخل ہوتا، ٹیپو بھی صبح ایک اسکول میں پڑھانے لگا، ایوننگ کلاسز لے کر پھر ہوم ٹیوشنز بھگتا کر رات گئے کہیں اس کی شکل نظر آتی۔

ایسے ہی دنوں میں جب میں تنہائی، یاسیت اور بیزاری کا شدید شکار تھی، اچانک ہی سیما بھابھی چلی آئیں۔

صاف ستھرے گھر میں، میں کسی ملکہ کی طرح مٹرگشت کر رہی تھی، دن ڈھلنے کے قریب تھا انہیں دیکھ کر ایک لمحے کے لئے گھبرا سی گئی جانے کیوں۔

''کیا ہوا کیا میرا آنا پسند نہیں آیا۔'' ان کے لبوں پر طنزیہ کے بجائے ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

''نہیں نہیں بھابھی، ایسی بات نہیں۔'' میں انہیں بٹھا کر چائے بنا لائی۔

''دراصل دل بہت گھبرا سا رہا تھا آج، سوچا تم سے مل لوں، دن بھی تو کتنے ہو گئے تھے ملے ہوئے۔''

''خیریت بھابھی دل کیوں گھبرا رہا تھا۔''

''بس کچھ عرصے سے بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔'' وہ خاموش ہو کر گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگیں۔

''شیبا کیسی ہے، فون وون تو آتا ہو گا ان کا۔''

''ہاں۔'' وہی پھیکی مسکراہٹ پھر ان کے لبوں تک آئی۔

''آ جاتے ہیں، دونوں کے فون۔'' شیبا کو بھی انہوں نے اپنے بھائی کے پاس ہی لندن تیمور کے پیچھے پیچھے روانہ کر دیا تھا، وہ بھی وہاں سے ایم بی بی ایس کر رہی تھی اور تیمور ایف سی پی ایس (ماشاءاللہ)۔

''ایک بات بتانی تھی تم کو، بلکہ ایک مشورہ سمجھ لو۔''

''جی کہیں، میں سن رہی ہوں۔'' زندگی کے کسی معاملے میں انہوں نے ہم سے مشورہ تو دور ہوا لگانا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا، پھر آج یہ کایا پلٹ...... میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''تیمور کو تو اپنے ماموں کی بیٹی پسند ہے، اسی کی کلاس فیلو تھی، وہ شادی کر کے وہیں سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتا ہ، لیکن شیبا؟'' وہ ذرا کی ذرا رکیں۔

''اسے بھی وہیں ایک پاکستانی فیملی سے بلونگ کرنے والا سینئر ڈاکٹر پسند آ گیا ہے، بلکہ اس ڈاکٹر نے شیبا کو پرپوز کیا ہے۔''

''ارے یہ تو بہت خوشی کی بات ہے بھابھی۔''

''ہاں لیکن بیٹی کو اتنی دور پردیس بھیجتے ہوئے میں ڈرتی ہوں۔''

''لو یہ بھی خوب رہی۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''پڑھنے بھیج دیا جب ڈر نہیں رہا، اب جب لڑکی کا گھر بسنے جا رہا ہے تو۔''

''اور لڑکا کیا ہے بڑی عمر کا آدمی سا ہے،

اس نے تصویر بھیجی تھی مجھے۔"

"اگر آپ کا دل مطمئن نہیں تو انکار کر دیں۔" انہوں نے میری بات پر ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"میں کر تو دوں گی انکار لیکن شیبا نہیں مانے گی، اس کا ایم بی بی ایس کمپلیٹ ہوگا تو ظاہر ہے وہیں سے اسپیشلائزیشن کرے گی، پھر وہ کہتی ہے کہ اس کی انڈر سٹینڈنگ بہت اچھی ہے۔"

"ہوں...... یہ آج کل کے بچوں کو انڈر سٹینڈنگ کا پتہ نہیں کیا ضبط سوار ہے، بھئی ہمارے زمانے میں بھی رشتے ہوتے تھے، ہم تو ایک نظر دیکھنے کا ہی کہہ دیتے تو وہ جھاڑ پڑتی تھی کہ بس۔"

"اور باقاعدہ پردہ کرایا جاتا تھا، لڑکی اور لڑکے کا، کیا زمانہ تھا وہ بھی، چھوٹے بڑوں کی کتنی عزت کرتے تھے، کسی بات کو آگے سے انکار نہیں کرتے تھے۔" ان کے چہرے پر ایک جانا ان دیکھا سا دکھ بول رہا تھا، جانے مجھ پر ادراک کے لمحے کیسے وارد ہوئے میں نے بے ساختہ ان سے کہا۔

"کیا آپ کے بچوں نے آپ سے کوئی بدتمیزی کر دی بھابھی۔"

"ہیں۔" وہ جیسے کسی خواب سے جاگیں۔

"نہیں نہیں، بدتمیزی کہاں کرتے ہیں میرے بچے بس یوں سمجھ لو میں خود ہی یہ نوبت نہیں آنے دیتی۔" وہ ایک کھسیانی سی ہنسی ہنس کر اٹھ گئیں۔

"جا کہاں رہی ہیں، کھانا کھا کر جائیے گا ناں۔"

"ارے نہیں میں بس چلوں گی، مفراح اکیڈمی سے آ جائے گی تو شور کرے گی بھوک کی بہت کچی ہے اور میں روٹی بنا کر نہیں آئی۔"

"تو خود بنا لے گی آج، آپ ادھر ہی رک جائیں کھانے تک، ناصر بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔"

"نہیں مفراح کو کہاں آتا ہے کھانا پکانا یا روٹی ووٹی ڈالنا، وہ تو بس کتابوں اور کمپیوٹر تک ہی محدود ہے۔" وہ مسکرا کر کہتی ہوئیں دروازے کی طرف بڑھیں لیکن میں حیرت کے مارے وہیں جم گئی۔

"تو کیا وہ کچن میں آپ کا ہاتھ نہیں بٹاتی۔"

"نہیں کہاں، بالکل بھی نہیں۔" اب کی بار ان کی مسکراہٹ میں بے بسی کا رنگ تھا۔

"سوچا تھا بہو آئے گی تو کچھ ہاتھ بٹا دے گی لیکن اس کا بھی آسرا نہیں۔" وہ جا چکی تھیں اور میں وہیں کھڑی سوچ رہی تھیں، سیما بھابھی آج بھی ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی آئیں اور مسکراتی ہوئی چلی گئیں، لیکن آج ان کی مسکراہٹ میں کتنے رنگ چھپے ہوئے تھے اور ان کے سارے وجود پر اور ان سارے رنگوں پر ایک ہی رنگ غالب آ رہا تھا اداسی کا، بے بسی کا۔

☆☆☆

چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، پورے صحن میں گلاب کی مسلی ہوئی پتیاں پڑی تھیں، جن کی خوشبو سے صرف صحن ہی نہیں پورا گھر مہک رہا تھا۔

گہری نیند سونے میں اچانک ہی میری آنکھ کھلی تو صحن میں دھیرے دھیرے سے کسی کی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں چپل پیروں میں پھنسا کر باہر آئی تو صحن کے بیچوں بیچ وہ تینوں چاند کی دودھیا روشنی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے وہ تینوں، وہ تینو میرے بچے، جن سے میں ہمیشہ نالاں رہی، خفا رہی، ناراض رہی، لیکن آج...... آج کا دن گزشتہ

تمام دنوں سے مختلف اور روشن تھا، کیونکہ آج میں نے گھر میں ہی مومل کی منگنی کی رسم کی تھی، بے حد سادگی سے، میکے اور سسرال کے بے حد نزدیکی اور چیدہ چیدہ لوگوں کو بلا کر۔

میرا ہونے والا داماد ایک بے حد شریف النفس خوش شکل اور سمجھ دار بچہ ہے، سب سے بڑی بات یہ کہ میری خواہش کے عین مطابق مکینیکل انجینئر ہے۔

بلال کا انہی دوستوں کی شراکت سے کیا جانے والا معمولی دوکان کا آئیڈیا، اس کی اپنی کمپیوٹر اور موبائل شاپ میں بدل گیا اور سب سے بڑھ کر دن تو وہ تھا، جب مومی نے بی اے میں پورے کالج میں نمایاں پوزیشن حاصل کی، اس نے ہوم اکنامکس میں مجھ سے تو ڈگری لی ہی تھی لیکن فائن آرٹس کی فیلڈ میں اس نے کمال کر دیا، سالوں پہلے جو لڑکی اسکول یونیفارم بدلے بغیر کلر بکس لے کر بیٹھ جاتی تھی اور مجھ سے باقاعدہ مار کھاتی تھی، وہ ایک دن مصوری اور خطاطی کی دنیا میں اپنی کوئی پہچان بنا سکے گی، بھلا میں نے کب سوچا تھا۔

اس کے خطاطی کے فن پاروں اور خوبصورت لینڈ اسکیپس کو دیکھتے ہوئے اس کے کالج پرنسپل نے اس کی سولو ایگزیبیشن منعقد کروائی، میں نے بصد اصرار اور اہتمام اپنے تمام جاننے والوں کو فون کیا، وہاں وہ سب کچھ تھا جس کا خواب میں نے تیمور کی تقریب میں دیکھا تھا، بلکہ شاید اس سے بھی بہت بڑھ کر کیونکہ...... کیونکہ وہاں صرف پھولوں کے ہار اور مٹھائی کے ڈبے نہیں، بلکہ کیمرے کی فلش لائیٹس بھی تھیں اور نیوز کوریج کے لئے ایک نجی چینل سے آئے ہوئے صحافی حضرات بھی، گو کہ وہ چینل زیادہ مصروف نہیں تھا لیکن یہ کیا چھوٹی بات تھی میرے

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیئے

ابن انشاء
اردو کی آخری کتاب .... ☆
خمار گندم .... ☆
دنیا گول ہے .... ☆
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☆
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☆
چلتے ہو تو چین کو چلیے .... ☆
نگری نگری پھرا مسافر .... ☆
خط انشا جی کے .... ☆
بستی کے اک کوچے میں .... ☆
چاند نگر .... ☆
دل وحشی .... ☆
آپ سے کیا پردہ .... ☆

ڈاکٹر مولوی عبدالحق
قواعد اردو .... ☆
انتخاب کلام میر .... ☆

ڈاکٹر سید عبداللہ
طیف نثر .... ☆
طیف غزل .... ☆
طیف اقبال .... ☆

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور
فون نمبرز 7321690-7310797

لئے فخر و انبساط سے میری آنکھوں میں ستارے سے دمکنے لگے تھے، جب مول کی ٹیچرز فرداً فرداً میرے پاس آکر اس کی تعریفیں کرتی رہیں۔

اس روز میری شرمندگی کا کوئی سامان نہ تھا، احساس کمتری جیسا کوئی کیڑا میرے دماغ میں نہیں کلبلایا، ناصر میرے ساتھ تھے اور میرے دونوں بیٹے ہم ماں باپ کے بازو بنے دائیں بائیں کھڑے تھے، بلاشبہ وہ ایک مکمل اور حسین ترین شام تھی، جس نے میرے دل میں برسوں سے دبی ایک لاشعور اور معصوم سی خواہش کو پورا کر دیا۔

ہاں مگر اس روز ایک بات نے دل کو موہوم سا بے چین ضرور کیا، اس دن، تقریب میں سیما بھابھی نہیں آئی تھیں، میں جانتی تھی وہ آ بھی نہیں سکیں گی، کیونکہ مفراج نے اپنی پسند سے کسی بہت پیسے والے سیاسی تنظیم سے تعلق رکھنے والے اور کسی بہت بڑی عمر کے آدمی سے کورٹ میرج کر لی تھی، سیما بھابھی کی تو زندگی ہی اندھیر ہو گئی تھی۔

صرف ہمایوں ان کے پاس تھا، جس نے پاکستان کی سب سے ٹاپ کلاس یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا اور اب وہ نوکری کے بجائے کاروبار کرنا چاہتا تھا، جس کے لئے اسے ڈھیر سارا روپیہ چاہیے تھا اور وہ بھائی صاحب کے پیچھے پڑا تھا کہ گھر بیچ کر اس کا حصہ دیں۔

سیما بھابھی اور بھائی صاحب کی پریشانی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا، کیا فائدہ ہوا بچوں کو زندگی بھر کی جمع پونجی خرچ کر کے پڑھانے کا۔

اگر تعلیم یافتہ ہو کر باشعور ہو کر بچے اتنے منہ زور اور بے لگام ہو جاتے ہیں، اولاد ہاتھوں سے نکل جاتی ہے تو اس سے تو میرے بچے ہزار درجہ اچھے تھے، جو اتنی کم عمری میں جب بچوں کو نماز پڑھنے ور روزہ رکھنے کی پابندی کروائی جاتی ہے، انہوں ے یہ بھانپ لیا کہ ان کی مہنگی تعلیم کا مزید خرچہ ان کا باپ برداشت نہیں کر سکتا اور پھر بے حد خاموشی سے دونوں نے اپنے اپنے خرچے خود اٹھا لئے، ہزاروں روپے ایک سمسٹر کی فیس ٹیپو ناصر سے لینے کی بجائے اپنی ٹیوشنز سے پوری کرتا تھا اور بلال جس کے دوکان کھولنے پر مجھے شدید اعتراض تھا، چوبیں گھنٹے کمپیوٹر کے آگے بیٹھے بیٹھے وہ کب کمپیوٹر انجینئر بن گیا، مجھے پتہ ہی نہیں چلا، اس کے پاس بیچلرز کی ڈگری نہیں تھی، لیکن ڈپلومز کے سرٹیفیکیٹس تھے اور سب سے بڑھ کر اپنی فیلڈ میں اس کی مہارت، اس کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

چھٹکی ہوئی چاندنی میں ان تینوں کے وجود کسی ہیولے سے مشابہہ تھے اور میں اپنے خیالات کی رو میں بہتی اتنی دور نکل گئی تھی کہ پتہ ہی نہیں چلا، مجھے آواز دے کر کب وہ تینوں میرے نزدیک پہنچ گئے، میں نے اپنی آنکھوں میں نمی ابھرتی محسوس کی۔

''امی کیا ہوا، کیا طبیعت تو ٹھیک نہیں ہے، باہر کیوں آ گئیں...... کیا نیند نہیں آ رہی...... سر میں درد تو نہیں۔''

تینوں ہی میری فکر میں تھے، تینوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں تھی، وہ میرے بچے تھے اور یقیناً مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، ٹیپو نے میرے گرد بازو پھیلایا اور میں بے اختیار اس کے سینے میں منہ چھپا کر رو دی۔

☆☆☆

وطن سلامت رہے

حیاء بخاری

سید وارث علی شاہ کے گھر آٹھ سال کے صبر آزما عرصے کے بعد پوتا ہوا تھا، ان کے اکلوتے لڑکے حارث علی کا بیٹا، سارا گاؤں مبارک باد دینے ان کے گھر کے لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے دروازے کے باہر جمع ہو رہا تھا، گاؤں میں سید وارث علی شاہ کو جو اعلیٰ مقام حاصل تھا، وہ گاؤں کے وڈیروں کا نصیب بھی نہ تھا اور یہ عزت و تکریم سید وارث علی شاہ اور ان کے خاندان کی پاکستان کے لئے دی گئی بے تحاشا اور بے لوث محبت اور قربانی کے سبب تھا۔

سید وارث علی شاہ کے بابا تقسیم ہند سے پہلے نواب تھے، بادشاہوں جیسی زندگی گزارنے والے اس خاندان نے آزادی کے لئے نہ صرف اپنا مال دولت بلکہ اپنے کئی عزیزوں کی جانیں تک قربان کر دی تقسیم کے وقت صرف اور صرف پاکستان کے لئے انہوں نے سب مال و متاع کو قربان کر دیا، جائیداد، گھر بار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ خالی ہاتھ پاکستان کے لئے نکلے تھے، راستے میں ہندو شر پسندوں کے حملے میں انہوں نے اپنے کئی عزیزوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے لہو سے تر بتر ہوتے دیکھا، لیکن ان کے عزم میں کمی نہ آئی، ان کی دو جوان سال لڑکیاں اور دو بیٹے بھی اسی ہجرت کے دوران شہید ہوئے، لیکن وارث علی شاہ کے بابا لبوں پر ایک ہی ورد جاری رہا۔

''پاکستان زندہ باد۔''

اپنی باقی کی ساری زندگی انہوں نے اسی گاؤں کے اسی کچے گھر میں اپنے واحد بچ جانے والے بیٹے وارث علی شاہ کے ساتھ نہایت سادگی اور گاؤں کے لوگوں کی تعلیم و تربیت میں گزار دی، ان کی زیر تربیت رہنے والے بچے آج بڑے بڑے شہروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، تبھی ان کی ان شاندار قربانیوں کی وجہ سے تمام گاؤں ان کے چھوٹے سے خاندان کی عزت کرتا تھا اور ان کی خوشی غمی میں شریک ہوتا تھا۔

سید وارث علی شاہ نے بھی اپنے والد کی وفات کے بعد گاؤں والوں کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

آج سارا گاؤں ان کی خوشی میں خوش تھا، خود وارث علی شاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اللہ نے انہیں پوتے جیسی نعمت سے نوازا تھا اور گاؤں والوں کی محبت نے ان کی خوشی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

☆☆☆

''ابا! میں ذرا دو تین کپڑے کھنگال لوں، آپ شعیب کا خیال رکھیئے گا، کہیں گلی میں نہ نکل جائے۔'' ثمینہ نے پانچ سالہ بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کے دادا کے ساتھ زبردستی چارپائی پہ بٹھاتے ہوئے سسر کو بھی تاکید کی۔

''لو کیوں نہ جائے گلی میں، شیر ہے میرا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوتے کی پیٹھ تھپتھپائی، جس کا لٹکا منہ ان کی بات سن کر کچھ کھل اٹھا۔

''نہ بابا نہ، ایک ہی تو بیٹا ہے میرا، اللہ نہ کرے کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو۔'' ثمینہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''اللہ پہ بھروسہ رکھ بیٹا، اور پھر تقدیر سے بھلا کون جان چھڑا پایا ہے، اللہ نہ کرے اگر کچھ لکھا ہے اس کی قسمت میں تو کون روک سکتا ہے۔'' انہوں نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

''اللہ نہ کرے بابا، میں نے تقدیر سے کب انکار کیا ہے، مگر احتیاط تو کی جا سکتی ہے نہ۔'' وہ ہاتھوں سے شعیب کے بال بنانے لگی۔

''تو کیا اب اسے لڑکیوں کی طرح گھر میں

کام کاج سکھاؤ گی۔'' بابا نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، وہ منہ بنا گئی۔

''میں نے یہ کب کہا بابا، بس گھر میں کھیلے سارے لڑکوں والوں کھیل، مگر گلی میں ہرگز نہیں۔'' وہ قطعی لہجے میں کہتی باہر نکل گئی۔

''چل پتر، تیری ماں تو تجھے باہر نہیں جانے دے گی، گھر میں ہی کھیل لے۔'' دادا نے اسے پچکارا، وہ مزید منہ پھلا گیا۔

''مگر مجھے راجو لوگوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنی ہے۔'' معصوم سی خواہش۔

''تیری بات بھی ٹھیک ہے، مگر تیری اماں کو کون سمجھائے۔'' دادا نے جیسے مجبوری بتائی۔

''آپ چلیں نہ میرے ساتھ، تب تو امی بھی کچھ نہیں کہیں گی۔'' اس کی معصوم آنکھیں چمک اٹھیں، سید وارث علی شاہ نے چند پل سوچا اور پھر چار و ناچار اپنی بید کی چھڑی سنبھالے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چل میرے شیر خوش ہو جا۔'' اور وہ واقعی اچھلنے لگا تھا۔

''بہو میں شعیب کو لے کر جا رہا ہوں ذرا باہر، فکر نہ کرنا۔'' دروازے سے نکلتے ہوئے انہوں نے تیز آواز میں کیا اور باہر نکلتے چلے گئے، تیز آواز میں ہدایات دیتی ثمینہ کی آواز کہیں بہت پیچھے رہ گئی۔

☆☆☆

حارث علی شاہ اور ثمینہ کی تیز آوازوں سے ان کی نیند میں خلل پڑا تھا، مگر انہیں یہ بات ناگوار نہیں گزری تھی، انہیں تو یہ فکر لاحق ہوئی کہ آخر ایسی کون سی بات ہو گئی کہ ان دونوں میں جھگڑے کی نوبت آ گئی تھی، وہ تیزی سے اپنی چھڑی سنبھالتے باہر آئے تھے۔

''ابا! آپ سنبھالے اپنی بہو کو، دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔'' ان پہ نظر پڑتے ہی حارث علی نے جلدی سے بیٹے کے ساتھ چارپائی پہ جگہ سنبھالی اور اس کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔

''کیا ہو گیا بہو؟'' انہوں نے آنسو پونچھتی بہو سے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ابا یہ آج شعیب کو لینے سکول نہیں گئے، وہ اکیلا گھر آیا ہے۔'' اور اس کی بات سن کر وارث علی کا دل چاہا اپنا ماتھا پیٹ لیں۔

''بیٹا یہ دو تین گلیوں کے بعد ہی تو سکول ہے اور پھر سب اپنے جاننے والے ہیں، اپنے گاؤں میں بھلا کیسا خوف؟'' وہ جانتے تھے کہ ان کی باتیں مخالف کی سمجھ میں نہیں آنے والی تھیں، مگر پھر بھی انہوں نے سمجھانا ضروری سمجھا تھا۔

''آج کل حالات بہت خراب ہیں ابا جی، دیکھا نہیں کیسی کیسی خبریں لا کر سناتے ہیں شہر سے آ کر گاؤں والے۔'' وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔

''شہر بہت بڑے ہوتے ہیں، سو ان کے مسائل بھی بڑے، وہاں یہ اغواہ کاریاں اسی لئے آسان ہیں کہ جان پہچان کم ہوتی ہے، یہاں کوئی اتنی آسانی سے یہ کام نہیں کر سکتا، پگلی۔''

''نہ بابا نہ، بس تم مجھے ہی سمجھانا، بیٹے کو کچھ مت کہنا، ایک ہی تو کام ہے اسے، یہ بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ بگڑی۔

''ہاں ہاں میری جگہ سکول میں ماسٹری کرنے تو تم جاتی ہو ناں۔'' حارث بھی چیخا۔

''اچھا بس، تو زیادہ بات نہ بڑھا عورتوں کی طرح، کل سے یاد سے چلا جایا کر، تجھے ویسے بھی راستے میں پڑتا ہے، زیادہ نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں۔'' وارث علی نے بات نمٹائی۔

''ابا ہائی سکول کا استاد ہوں، کبھی کبھی دیر سویر ہو ہی جاتی ہے اب بچے میرے انتظار میں اکیلا وہاں سڑتا رہے۔'' حارث علی کمزور لہجے میں

بولا۔

”تیری بات بھی ٹھیک ہے، چل پھر جاتے وقت تو لے جایا کر، آتے وقت میں لے آیا کروں گا، اتنا دم ہے ابھی میری بوڑھی ہڈیوں میں۔“ وہ مسکرا کر پوتے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

”نہیں ابا! آپ بھلا اس عمر میں کیا خوار ہوں گے، چلو ٹھیک ہے، دیر سویر ہو جائے تو خیر لیکن ایسے لاپرواہی کی نہ تو اچھا نہیں ہو گا۔“ ثمینہ سسر کی بات پر فوراً نرم پڑی، حارث علی نے جاندار قہقہہ لگایا۔

”دیکھ کتنا خیال کرتی ہے میری پتری۔“ ابا خوش ہوتے ہوئے بولے۔

”دماغ کھا جاتی ہے، جیسے میں تو کچھ جانتا ہی نہیں نہ۔“ وہ لطف لیتے ہوئے بولا، ثمینہ تیز نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

”جی نہیں، میں جو بھی سوچتی ہوں نہ سب کے بھلے کے لئے ہی سوچتی ہوں۔“ وہ نروٹھے انداز میں بولی۔

”اوئے حارث تنگ نہ کیا کر میری بہو کو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے، ثمینہ کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا، وہ بھی ہلکی پھلکی ہو کر مسکرا دی۔

☆☆☆

ثمینہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور باقی تینوں نفوس بت بنے بیٹھے تھے۔

”نہ تو کیا چاہتی ہے، ہمارا بیٹا آج کی اس تیز رفتار دنیا سے پیچھے رہ جائے۔“ کافی دیر بعد حارث علی بولا تو وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو کیا آگے جانے کے لئے شہر جانا ضروری ہے، یہیں رہ کر بھی تو آگے جا سکتا ہے۔“ لال آنکھیں، لال چہرہ لئے وہ بھڑکی۔

”ہاں کیوں کہ جو تعلیم وہاں میسر ہے اب گاؤں میں نہیں، گاؤں میں جس قدر ممکن تھا کروائی نہ۔“ حارث علی کو بھی غصہ آنے لگا۔

”ثمینہ پتر، دیکھ گاؤں کے اور بچے بھی تو جا رہے ہیں نہ شہر پڑھنے، تو ہمارا شعیب کیوں نہیں۔“ وارث علی بولے تو ثمینہ کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔

”کیوں میرا تو ایک ہی بیٹا ہے ابا، اکلوتا، اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔“ وہ پھر تڑپی۔

”خیر مانگ اللہ سے، کیوں ہر وقت منحوس باتیں کرتی رہتی ہے۔“ حارث علی کو مزید غصہ آ گیا۔

”اماں!“ شعیب اٹھ کر ماں کے قریب چلا آیا۔

”تم نہیں چاہتی کہ تمہارا بیٹا آگے جائے، کچھ بن کر دکھائے، اپنے دادا اور پردادا کی طرح اس ملک کے کام آئے، تم سب کا نام روشن کرے۔“

خوبصورت سیاہ کالی آنکھیں اس کے چہرے پہ جماتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

”کیوں نہیں چاہتی بیٹا۔“

”بس تو خوشی خوشی مجھے اجازت دے دو اماں اور پھر اب میں بڑا ہو گیا ہوں، اپنا خیال رکھ سکتا ہوں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا، تو پہلی بار وہ کچھ مطمئن ہوئی اور اثبات میں سر ہلا گئی، حارث علی اور وارث علی کے چہروں پہ بھی تبسم مچل اٹھا تھا۔

☆☆☆

شعیب علی شاہ نے سی ایس ایس کے امتحان میں ٹاپ کر کے پورے پاکستان میں اپنے گاؤں کا نام روشن کر دیا تھا، وردی میں اس کی شاندار شخصیت مزید نکھر گئی تھی، سارا گاؤں اسے ہاتھوں پہ اٹھائے ہوئے تھا۔

مسکراہٹ اس کے والدین کے لبوں سے چپک کر رہ گئی تھی اس کی قابلیت اور محنت کی وجہ سے آج سارا گاؤں خوش تھا، گلاب اور چنبیلی کے ہار پہنے وہ گھر ماں کے پاس آیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی، شعیب مسکرا دیا۔

”دیکھ اپنے شیر کو، تم نے تو اسے بکری بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔“ وارث علی نے ثمینہ کا مذاق اڑایا، وارث علی کانپتا تن سنبھالتے اٹھ بیٹھے تو شعیب سیدھا ان کے پاس جا بیٹھا۔

”الحمدللہ! میرا اتنا بڑا ارمان پورا ہو گیا۔“ ان کی کمزور آنکھیں نمکین پانیوں سے جھلملانے لگیں۔

”ہاں دادا اور پتہ ہے مجھے حکومت کی طرف سے گھر اور گاڑی بھی ملی ہے شہر میں، تم سب کو اب اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ وہ ان کا کمزور ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامتے ہوئے محبت سے بولا۔

”نہ بابا نہ، میں نہیں کہیں جا رہی۔“ ثمینہ نے فوراً انکار کیا۔

”اور اب میں اس عمر میں بھلا کہاں شہر جا کر رہ پاؤں گا، بس کسی وقت بلاوا آیا اور اپنے سوہنے دیس کی سوندھی مٹی میں جا سماؤں گا۔“ دادا نے محبت سے کہا۔

”نہ کریں دادا، ابھی تو آپ جوان ہیں۔“ شعیب ان سے لپٹ گیا۔

”کہاں یار، اب تو تیرا ابا بھی بڈھا ہو گیا ہے۔“ وہ مذاقاً کہتے ہوئے حارث کی طرف دیکھتے ہوئے بولے، شعیب کے ساتھ ثمینہ بھی کھل اٹھیں۔

”توبہ ہے ابا، مجھے بھی نہ بخشا۔“ وہ واقعی چڑ گیا۔

”اچھا آج تو منہ نہ بناؤ، سارے خوش خوش رہو آج اور ہمیشہ۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے بیٹا اور پوتے دونوں کو ساتھ لگایا، تو وہ سب بھی مسکرا دیئے۔

☆☆☆

”اس بار تجھے میری بات ماننی پڑے گی بس۔“ ثمینہ نے گرم تنور والی روٹی پہ ساگ

اچھی کتابیں
پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء
اردو کی آخری کتاب .... ☆
خمار گندم .... ☆
دنیا گول ہے .... ☆
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☆
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☆
چلتے ہو تو چین کو چلیئے .... ☆
نگری نگری پھرا مسافر .... ☆
خط انشاء جی کے .... ☆
اس بستی کے اک کوچے میں .... ☆
چاند نگر .... ☆
دل وحشی .... ☆
آپ سے کیا پردا .... ☆

ڈاکٹر مولوی عبد الحق
قواعد اردو .... ☆
انتخاب کلام میر .... ☆

ڈاکٹر سید عبدللہ
طیف نثر .... ☆
طیف غزل .... ☆
طیف اقبال .... ☆

لاهور اکیڈمی
چوک اردو بازار لاہور
فون: 3710797، 042-37321690

ڈالتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات اماں؟'' شعیب چونکا۔

''میں کل ہی جاؤں گی بھائی رشید کے ہاں، ثناء کو مانگنے۔'' انہوں نے کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ دن ٹھہر جاؤ اماں، ابھی مجھے نہیں کرنی شادی، تھوڑا اسیٹل تو ہونے دو شہر میں۔'' وہ کھانا شروع کرتے ہوئے بولا۔

''ہو جائے گا، میں کون سا تیری شادی کرنے لگی ہوں، ابھی تو بس بات پکی ہو جائے، بڑی پیاری لڑکی ہے ثناء، پورے گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی اور سگھڑ، رشتے بہت آ رہے ہیں، ایسا نہ ہو میں ہاتھ ملتی رہ جاؤں۔'' شعیب نے دیکھا اماں کی آنکھوں میں اس لڑکی کی محبت چمک رہی تھی، وہ مسکرا دیا۔

''پھر جیسے آپ کی مرضی اماں۔'' اس نے ہمیشہ ماں کی خوشی کو مقدم جانا تھا، سو اس بار بھی کلی طور پر فیصلہ ماں پہ چھوڑ دیا، ثمینہ کا تو چہرہ کھل اٹھا۔

''جیتا رہ میرا بچہ۔'' انہوں نے فوراً اس کی بلائیں لے لیں، تبھی شعیب کے سیل فون پہ تیز بپ ہوئی، اس نے فوراً کال پک کی۔

''پکی خبر ہے۔'' پوری توجہ سے سننے کے بعد وہ مختصر بولا تھا۔

''ٹھیک ہے، دریا کے دونوں طرف ناکہ بندی کر دو اور ہاں میں جلدی پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن خیال رہے تب تک کوئی غفلت نہ برتی جائے، میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولا اور فون بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہو گیا، کھانا تو آرام سے کھا لے۔'' ثمینہ اسے یوں اچانک اٹھتا دیکھ کر فوراً اس کے پاس آئیں۔

''نہیں اماں، دہشت گردی کے ایک بہت بڑے منصوبے کی خبر ملی ہے، دعا کرنا، اللہ ان کو ناکام کرے اور ہمیں ان کے مذموم و مقاصد ناکام کرنے میں کامیابی عطا فرمائے۔'' وہ فوراً ماں کے سامنے جھکا تھا، ثمینہ نے نہ جانے کیوں اس دفعہ لرزتے دل کے ساتھ اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اسے دعا دی، لیکن اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ اس بار واقعی اس کا بیٹا کامیاب ہوگا، وہ دل سے دعا گو تھی۔

☆☆☆

پولیس کے چاق و چابند دستے نے جب سبز ہلالی پرچم میں لپٹا اس خوبصورت چوڑا وجود اس کے گھر کے سامنے اتارا تو جیسے سارے گاؤں میں قیامت برپا ہو گئی، دہشت گردوں کے عزائم خاک میں ملاتے ہوئے ایس پی شعیب علی شاہ نے جام شہادت نوش کیا تو گاؤں کے سبھی لوگ اس جوان سال شہید کے لئے اشکبار تھے، وارث علی زندہ ہوتے تو اپنے خاندان کی ایک اور قربانی دیکھ کر ضرور خوش ہوتے اور یہی فخر اس وقت ان کے کمزور سے بیٹے وارث علی کے چہرے سے عیاں تھے، وہ ثمینہ کو بڑی ہمت کے ساتھ اپنے بیٹے کے آخری دیدار کے لئے لائے اور ثمینہ بیٹے کا پرسکون مسکراتا چہرہ دیکھ کے خود بھی پرسکون ہو گئیں، انہوں نے نم آنکھوں کے ساتھ بیٹے کی پیشانی پہ ہاتھ پھیرا اور دھیمے لہجے میں بولیں۔

''زندگی تو آنی جانی ہے بیٹا، بس وطن سلامت رہے۔'' انہوں نے نرمی سے اپنی آنکھیں صاف کر لیں تھیں، اردگرد ٹھہرے سبھی لوگوں نے وطن کی اس بہادر ماں اور اس کے شہید بیٹے کو سلام عقیدت ادا کیا تھا۔

☆☆☆

اک لمحہ زیست

صبا جاوید

”ہم گذشتہ کئی برسوں سے ترقی ترقی کا ورد کر رہے ہیں لیکن ان چند برسوں کا تقابلی جائزہ لیں تو کرپٹ نظام، رشوت ستانی اور لوٹ کھسوٹ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا، اس کی وجہ صرف ایسے نااہل لوگوں کا انتخاب ہے جو کسی طور اسلامی ریاست کے سیاسی ڈھانچے کے لئے موزوں نہیں، آپ کے ووٹ بے حد قیمتی ہیں اور آپ کی رائے بے حد مقدم، پاکستان کا اصول ہمیشہ جمہوری اصولوں کی پاسداری کرتا رہا ہے، لہٰذا جمہوریت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ کو اپنے انتخاب میں مکمل آزادی ہو، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کو مطلوبہ پارٹیوں کی کارکردگی کی معلومات ہو۔“

”اگر آپ اس الیکشن میں ہماری پارٹی کو براسر اقتدار لانے میں مدد دیتے ہیں تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگا، بجلی گیس کے بحران، مہنگائی، بے روزگاری، رشوت ستانی، تعلیمی معیار کے نقائص، اجارہ داری، کمزور معشیت اور پسماندہ ٹیکنالوجی جیسے مسائل کو حل کرنے کی حتی المقدور کوشش کریں گے، ووٹ اور انتخاب دونوں آپ کے ہاتھ میں ہیں، بس اتنی سی درخواست ہے درست اور اہل لوگوں کو اپنی خدمت کا موقع دیں اور روشن مستقبل کو یقینی بنائیں، کسی نامور پارٹی کے کارندے نے لفظوں کی سحر خیزی سے میلہ لوٹ لیا، جب وہ تین حفاظتی گارڈز کے گھیراؤ میں اسٹیج سے اترا تو اس پسماندہ گاؤں کے سادہ لوح لوگ اس کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور تالیوں سے پورا ڈیرا گونج اٹھا۔“

”معصوم اور مسائل میں گھرے ان لوگوں کے لئے اس سیاست دان کی باتیں کسی روشنی کے دیے سے کم نہ تھیں، لہٰذا وہ من وعن اس کے تمام دعوؤں پر یقین کر چکے تھے، الیکشن کے دن نزدیک تھے تمام سیاسی پارٹیاں فتح سے ہمکنار ہونے کے لئے چھوٹے بڑے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں دورے کر رہی تھیں، ہری پور کے اس چھوٹے سے گاؤں میں آنے کا مقصد بھی یہی تھا۔“

”مبارک ہو عباد صاحب، آپ کا ہری پور کا جلسہ کامیاب رہا۔“ چوہدری سنگت نے عباد ولی کا کندھا تھپتھپا کر خوشخبری سنائی، جو ہری پور میں بھاری ووٹوں سے منتخب ہوا تھا۔

”یہ تو ہونا ہی تھا سنگت صاحب، ہماری پارٹی نے بہت پیسہ خرچ کیا ہے۔“ اس نے سینہ ٹھوک کر کہا۔

”لیکن ہم نے بھی آپ کی کم مدد نہیں کی۔“ چوہدری سنگت نے فوراً اپنا احسان باور کروایا۔

”بالکل چوہدری صاحب ہمیں اس سے اختلاف نہیں۔“

”تو پھر زمینوں کی منظوری کا معاملہ کب شروع کریں گے اب تو حکومت بھی آپ کی ہے۔“ چوہدری سنگت نے معاہدہ یاد دلایا جس کی بناہ پر اس نے عباد ولی کی بے حد مدد کی تھی۔

”پریشان کیوں ہوتے ہو سنگت، اب تمہارے احسان ہی اتارنے ہیں بس تھوڑا صبر کر لو۔“

”احسان زیادہ دیر تک رہے تو قرض بن جاتا ہے اور قرض وقت پر ادا ہو جائے تو بہتر ہے، ورنہ اگر ہمیں سرکار بنانی آتی ہے تو توڑنی بھی آتی ہے۔“ اپنے مخصوص جاگیردرانہ انداز میں کہتے ہوئے چوہدری سنگت نے گویا دھمکی دی اور باہر کی راہ لی، جبکہ عباد ولی پہلو بدل کر رہ گیا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے رشید، بہت خوش دکھائی دیتے ہو۔“ رقیہ نے رومال کھول کر روٹی نکالی اور چنگیر میں رکھ کر اس کے سامنے کی۔

”ہاں خوشی کی ہی تو بات ہے رقیہ، ولی صاحب نے پل کے ساتھ والی سرکاری زمین غریب کسانوں کو الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور فوری طور پر رجسٹری کے لئے کوئی کاغذ جمع کروانے کو بھی کہا ہے۔“ رشید خان اس اعلان پر پھولے نہیں سما رہا تھا اور اسے خوش دیکھ کر رقیہ نجانے کیوں کھلتی جا رہی تھی۔

”بس اب میں جاگیرداروں کی زمین پر کام نہیں کروں گا وجہ بے وجہ ذلت بھی دیتے ہیں اور کام بھی جانوروں کی طرح کرواتے ہیں۔“ روشن مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے وہ ماضی کے زخم دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بس رشید خان اب ولی صاحب کو دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے خدا کے نیک بندوں کی دنیا میں کمی نہیں خدا انہیں اس کا اجر دے۔“ غربت کے گراف میں جینے والے اس کنبے نے دل سے دعا دی۔

☆☆☆

”یہ کیا مذاق ہے ولی صاحب، برسر اقتدار آتے ہی آپ پل والی زمین ہماری ملکیت میں دیں گے اس بات کا معاہدہ کیا تھا آپ نے ہم سے، آپ ہمارے ساتھ سیاست مت کھیلیں ورنہ پچھتائیں گے۔“ اس کا اعلان سنتے ہی سنگت بپھرے ہوئے شیر کی طرح عباد ولی پر چڑھ دوڑا۔

”آرام سے چوہدری صاحب، اتنا غصہ کس چیز کا، سکون سے یہاں بیٹھیں اور میری بات سنیں۔“

”شیر کی کچھار میں آگ لگا کر کہتے ہو سکون سے رہیں۔“ اس کے لہجے میں تمسخر ناچ رہا تھا اور چہرے پر غصہ عود آیا تھا۔

”کیا ہے تمہاری حکومت، ہمارے ٹکوے چاٹنے والوں کو تم ہمارے سر پر بٹھاؤ گے ان سے ہماری برابری کرواؤ گے۔“ وہ مزید برہم ہوا۔

”ریلیکس چوہدری صاحب، یہ جاگیردارانہ نظام اور آپ جیسے وڈیرے ہی تو اس ملک کی پہچان اور شناخت ہیں کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ کی حیثیت کو زک پہنچے، یہ زمین آپ کی ہے اور آپ کی ہی رہے گی بس یہ عوام کا اعتماد حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔“ عباد ولی نے مکاری سے اپنا نقاب الٹ کر اصل چہرہ دکھایا۔

”اوہ تو جو زمین کا مجھ پر کیس ہوا ہے اس کا کیا؟“

”چوہدری صاحب، وکیل بھی اپنے، جج بھی اور انصاف بھی، پھر فکر کس چیز کی، فیصلہ آپ کے حق ہی ہوگا، بس اس بے وقوف عوام پر یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ زمین آپ ہی کی ملکیت ہے قانونی طور پر بھی اور ہم کچھ نہیں کر سکتے، کل سنوائی ہے اور......“ ولی بات ادھوری چھوڑ کر سفاکیت سے مسکرا دیا، تو چوہدری سنگت نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر جیسے اس کی بات کو سمجھ کر خود بھی مسکرا دیا۔

☆☆☆

خزاں کی دھیمی چال کو الوداع کہنے بہار کی تیزی چلی آئی تھی، چند روز قبل پیروں تلے کچلے جانے والے خزاں رسیدہ پتے ماضی کی داستان بن کر رہ گئے اور نئی نکلنے والی کونپلوں نے سبزے کا سمندر فضا میں سمو دیا، رقیہ نے ان گزرتے شب و روز میں برپا ہونے والی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیا۔

ان کی گزر بسر کا ذریعہ زمینداروں کی قطعہ اراضی تھی جس پر کاشت کر کے حاصل ہونے والی

ناکافی آمدنی سے وہ پیٹ کا دوزخ بھی بمشکل بھر پاتے تھے، کچھ عرصہ قبل سرکاری قطعہ اراضی فی ایکٹر کے حساب سے غریب کسانوں کے درمیان منقسم ہونا قرار پائی، غربت کی ڈور سے بندھے اس خاندان کے لئے یہ اعلان خوشیوں کا در ہی ثابت ہوا، رقیہ بھی مستقبل کی تابناکیاں بڑی صاف دکھائی دینے لگیں۔

مگر حیف صد حیف، صدیوں سے دہرائی جانے والی تاریخ ایک بھر پھر قدموں کی زنجیر بن کر پاؤں روکے کھڑی تھی، گاؤں کے وڈیرے اور زمیندار پہلے ہی سرکاری ملازمین کی ملی بھگت سے اس زمین پر اپنا تسلط قائم کر چکے تھے، گو کہ اس پر غبن کا مقدمہ ثابت ہو چکا تھا، مگر نتائج وہی جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا حساب تھا، سرکاری قطعہ اراضی کی رجسٹریشن کی فیس لاکھوں کی مد میں جا پہنچی تھی جو کہ دو وقت کی روٹی کا بمشکل بندوبست کرنے والے خط غربت سے بھی نیچے زندگی گزارنے پر مجبور انسان کے لئے ناقابل رسائی امر تھا، چند ایک خواندہ اور فہم و فراست لوگوں نے کورٹ میں مقدمہ درج کروایا تھا چنانچہ غربت کے طوفان سے بجھتے ان لوگوں کے زندگی کے دیے کو روشنی کی کچھ امید ہوئی، آج کورٹ میں تیسری سنوائی تھی، رقیہ سورج کی پھیلتی کرنوں کے ساتھ ساتھ دعا کے الفاظ بڑھاتی جاتی تھی، اس کے لبوں کی جنبش میں کامیابی کی التجا تھی۔

شدت غم میں ڈوبا انتظار کا پردہ ہٹا اور اسے دہلیز پر کھڑا، رشید خان نظر آیا، وہ چند لمحے اس کی حالت کا تجزیہ کرتی رہی، اس کی جھکی آنکھیں، ہونٹوں پر جمی سفیدی، خم دار گردن اور شکستہ چال شاید نتائج سے آگاہ کرنے کو کافی تھا، رشید خان چپ چاپ برآمدے میں بچھی چارپائی پر ٹک گیا، دھول میں اٹے پیروں پر نگاہیں جمائے وہ جیسے کسی گہری سوچ کے دامن میں سر پٹختا دکھائی دیتا تھا، اس کے قدموں کی تھکاوٹ دیکھ کر رقیہ سے کچھ پوچھنے یا باز پرس کرنے کی ہمت باقی نہ تھی۔

”کھانا لاؤں۔“

مقدمے کے متعلق سوال کرنے کی بجائے وہ معمول کے مطابق اس سے مخاطب تھی۔

”نہیں۔“ اس نے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا، چند لمحے وہ خالی خالی نظروں سے اس کی ناگفتہ بہ حالت کا تجزیہ کرتی رہی، ہر سو مہیب سناٹے کا راج تھا، سر پر چمکتے سورج کے باوجود آنکھوں کے آگے اندھیری رات کا سا منظر تھا، اچانک رشید خان نے مٹی سے اٹی چپل پاؤں میں اڑسی اور اٹھ کھڑا ہوا، رقیہ کا ارتکاز ٹوٹا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ وہ ٹھٹھک کر بولی۔

”کام کرنے وڈیرے کی زمینوں پر۔“ اس جملے نے شاید اس کی شکست پر مہر ثبت کر دی، امید کا عکس آنکھوں سے جھلملا کر بہہ گیا۔

ارباب اختیار لوگ پھر جیت گئے، طاقت ور ایک بار پھر کمزور کو سرنگوں کر دیا، جمہوریت اور انصاف پر نعرے لگانے والے لوگوں کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم گئے، تاریخ وہی، مسائل وہی، انجام وہی، کہانی وہی، بس لوگ اور کردار مختلف جبکہ زندگی شاید تغیر و تبدل میں غوطہ زن۔

اس نے آنکھوں میں خود ساختہ بہہ آنے والے آنسوؤں کو بے دردی سے پونچھ ڈالا اور چھوٹے سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی، ایک طرف رکھے برتنوں کو دھونے لگی اور معمول کے کام سرانجام دینے لگی، وہی شب و روز اس کے منتظر تھے یہ تو اک لمحہ زیست کی تصویر ہے پوری حیات تو ابھی باقی ہے۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں:۔
✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
We Are Anti Waiting WebSite
واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook
fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety1

شگفتہ شاہ

کب تک؟

اچھے رشتے ٹھکرانے کی وجہ......
کبھی ذات برادری پر اعتراض
کبھی زبان اور قومیت کا مسئلہ
کبھی مسلک پر تردد
کبھی سوشل اسٹیٹس پر

پھر یہ شکایت کہ......
"لڑکیوں کی عمریں نکلی جا رہی ہیں......
اچھے رشتے ملتے ہی نہیں۔"
......ہم نے اپنی زندگی کو خود مشکل بنایا ہے
کسی اور نے نہیں

☆☆☆

محور اور مدار

وہ دونوں محبت کے محور کے گرد گھومنے والے دو سیارے ہیں جو کبھی مل نہیں پاتے، کیونکہ ......مدار دونوں کے جدا جدا ہیں۔

☆☆☆

ٹریجڈی

کچھ خوبصورت گیت اور شاعری کبھی سروں میں نہیں بکھر پاتی۔
کچھ آنسو بہہ نہیں پاتے۔

کچھ سسکیاں ٹوٹے ہوئے دلوں کے اندر ہی دفن ہو جاتی ہیں۔
کچھ باتیں ان کہی ہی رہ جاتی ہیں۔
کچھ یادیں کبھی شیئر نہیں کی جاتیں۔
کچھ خوبصورت آنکھیں اور دل بہت جلد بھلا دیئے جاتے ہیں۔
ان لفظوں اور وعدوں کی طرح جنہیں لوگ بھول جاتے ہیں۔
کیونکہ۔
کچھ لوگ "محبوب" کو اس طرح جلد بدل دیتے ہیں جیسے وہ لباس بدلتے ہیں۔

☆☆☆

متضاد

"ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔" (ایک مشہور قول)
"ہر کامیاب عورت کے پیچھے مرد ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔" (ایک تلخ حقیقت)

☆☆☆

گالی

اس معاشرے میں عورت کا مرتبہ بلند نہیں ہو سکتا جس میں مردوں کی آپس کی لڑائیوں میں بھی گالی اس کی ماں اور بہن کو دی جاتی ہو۔

☆☆☆

ایک صوفی کی موت

(ترجمہ)

جب میں اس دنیا سے رخصت ہوں گا
اور میرا جنازہ اٹھایا جا رہا ہو
تو کبھی مت سوچنا
کہ میں اس دنیا کو یاد کر رہا ہوں گا
آنسوں مت بہانا نہ ہی ماتم کرنا
کیوں کہ میں کسی عفریت کی
آغوش میں نہیں جا رہا ہوں گا
میرے جانے پر مت رونا کیونکہ
میں تو اپنے لافانی محبوب کے پاس جا رہا ہوں گا
جب مجھے میری لحد میں اتار چکو
تو مجھے الوداع نہ کہنا
کیونکہ قبر تو فقط ایک پردہ ہوتا ہے
جس کے پیچھے جنت ہوتی ہے
تم تو فقط مجھے لحد میں اترتا دیکھو گے
پھر میری پرواز بھی دیکھنا ذرا
میرا خاتمہ کیسے ہو سکتا ہے
چاند اور سورج کی طرح جب وہ غروب ہوتے ہی، ڈھلتے ہیں
بظاہر تو لگتا ہے کہ سورج غروب ہو گیا
مگر وہ ایک نئی سحر کے لئے طلوع ہو گا
اسی طرح دفن ہونے کے بعد
میری روح کی آزاد پرواز دیکھنا
تم نے بیجوں کو زمین میں دھنستے دیکھا
اور پھر انہیں تناور درخت بن کر ابھرتے بھی دیکھا ہے
تو پھر انسان کے نئے جنم میں شک کیوں ہے
وہ بھی تو ایک بیج ہے
کبھی بھی تم نے کنویں میں ڈالے ہوئے ڈول کو خالی اوپر آتے دیکھا......؟
تو پھر ماتم کاہے کا؟ ایک روح کی خاطر؟
وہ بھی یوسفؑ کی طرح
کنویں سے نکلے گی
جب تم آخری سانس لو گے اور منہ بند کرو گے
تب تمہارے الفاظ اور روح ایک
ایسی دنیا میں داخل ہو جائیں گے
جو وقت اور جگہ سے مبرا ہو گی

(رومی)

☆☆☆

ادھورے خواب

سالوں تک بے روزگار رہنے اور نوکری حاصل کرنے کی جان توڑ کوششوں کے بعد اسے نوکری ملی اور پہلی تنخواہ کو لئے وہ خوشی خوشی گھر آ رہا تھا، کہ موٹر سائیکل پر سوار دو لڑکوں نے ایک سنسان گلی میں اسے گھیر کر اس سے تنخواہ کی رقم چھیننی چاہی تو اس نے جان توڑ مزاحمت کی جس کے نتیجے میں انہوں نے فائر کر کے اسے گولی مار دی اور پیسے لے کر چلتے بنے۔

اور...... اس کے خون میں لت پت بکھری چیزیں اس کی تلاش کے گرد پڑی تھیں۔
...... ماں کی دوائیں
......بچوں کے فیس کے چالان
......چھوٹے منے کا کھلونا
......اور...... جوان بیوی کی سونی کلائی کے لئے پیار سے خریدی ہوئی شیشے کی چوڑیاں......!۔

☆☆☆

گمشدہ بچی

اسے آج بھی تلاش ہے اپنے اندر کی اس معصوم بچی کی، جس کا من بہت اجلا تھا اور خواب شفق رنگ تھے، پھول، تتلیاں اور پرندے اس کے ساتھی تھے اور وہ ان کی زبان سمجھتی تھی۔

مگر......آج......

جب وہ خوبصورت رنگ بکھیرتے، برش اٹھا کر کینوس پر پرندے، پھول اور تتلیاں پینٹ کرنا چاہتی ہے تو کر نہیں پاتی، اس مشینی دور کی کثافتوں، تیز رفتار زندگی، ٹریفک کے شور، بارود کی بو، خون اور آنسوؤں سے بھیگی ہواؤں، روبوٹ نما انسانوں، نفرت، جھوٹ، منافقی اور خود غرضی سے گھبرا کر کہیں چھپ گئی ہے۔

اسے معلوم ہے کہ وہ اس بچی کو اب کہیں ڈھونڈھ نہ پائے گی......اور نہ ہی وہ اب اس کا ساتھ قبول کرے گی، کیونکہ وہ تو تقدس کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی جب کہ وہ اب اس دور کی سچائی سے عاری، منافقت، جھوٹ اور دھوکہ باز اور مشینی طرز زندگی سے کمپرومائز کر کے اس زندگی کا ایک اہم پرزا بن چکی ہے۔

☆☆☆

خوشی

خوشی نے مجھ سے کہا تھا۔

''میں پانچویں دن لوٹ کر آ جاؤں گی۔''

اور......جب......

میں نے زندگی کی کتاب کھول کر دیکھی تو اس کے ورق صرف چار دن کے تھے۔ (ماخوذ)

☆☆☆

کانفرنس

''بھئی!...... یہ کانفرنسیں کیوں بلائی جاتی ہیں آخر؟''

''اس لئے کہ جب ایک شخص کچھ نہیں کر پاتا تو وہ کانفرنس بلاتا ہے، جس میں پھر سب متفقہ طور پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ...... کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا؟''

☆☆☆

غیرت

اس کے شوہر کو اس کا ''میڈیا'' پر آنا پسند نہیں تھا اس لئے اس نے اپنے وقت کی مقبول کمپیئر ہونے کے باوجود شوہر کی خواہش پر ریڈیو اور ٹی وی کو چھوڑ دیا مگر ایسے مردوں کے ساتھ آفس میں جاب کرنا پڑی جہاں باس اسے بہانوں، بہانوں سے اپنی آفس میں بلاتا تھا اور اس کے مرد کلیگ اس سے دوستی رکھنا چاہتے ہیں تو ان سب کی نظروں کو برداشت کرتے کرتے وہ بکھر جاتی ہے اور جاب کو چھوڑنا چاہتی ہے مگر اس کے دکھ اور مسائل شیئر کرنے کے بجائے ہر ماہ اس کی تنخواہ کے پیسے لے کر گننے والے شوہر کو سمجھانا چاہتی ہے کہ وہ صرف اس سے اور اپنے بچوں سے محبت کرتی ہے، وہ فقط اس کے لئے سجنا اور سنورنا چاہتی ہے نہ کہ ''آفیشل پارٹیز'' میں اسے ہوس بھری نظروں سے دیکھنے والے کرپٹ آفیسروں کے لئے، مگر وہ ایسا کر نہیں پاتی کیونکہ شادی کے بعد اس کے شوہر نے میڈیا چھوڑنے کے لئے کہا تھا اتنی اچھی جاب چھوڑنے کے لئے نہیں۔

☆☆☆

حاصل مطالعہ

تحریم محمود

حدیث نبویؐ

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''رات گئے قصہ کہانیوں کی محفلوں میں نہ جایا کرو کیونکہ تم میں سے کسی کو بھی خبر نہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کس کس کو کہاں کہاں پھیلایا ہے اس لئے دروازے بند کر لیا کرو، مشکیزوں کا منہ باندھ لیا کرو، برتنوں کو اوندھا کر دیا کرو اور چراغ گل کر دیا کرو۔''

(بخاری، الادب المفرد)

سعدیہ جبار، ملتان

اقوال حضرت علی المرتضیٰؓ

- O اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس نے تمہارے گناہوں کو اس طرح چھپایا کہ گویا بخش دیا۔
- O اللہ پاک کے نزدیک وہ غلطی جو تمہیں تکلیف دے اچھی ہے، اس خوبی سے جو تمہیں مغرور بنا دے۔
- O معافی دینے کا حق اسی کو ہے جو سب سے زیادہ سزا دینے پر قادر ہو۔
- O جب عقل پختہ ہو جاتی ہے تو گفتگو کم ہو جاتی ہے۔
- O جو تم کو بری بات سے ڈرائے وہ تم کو خوشی کی بشارت دیتا ہے۔

آنسہ ممتاز، رحیم یار خان

ایوان صدر

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ سادگی، قناعت پسندی اور عجز و انکساری میں اپنی مثال آپ تھے ایک مرتبہ ایک غیر ملکی وفد آپؓ سے ملنے آیا آپؓ کا خادم انہیں شہر سے باہر لے گیا، آپؓ اس وقت حسب معمول دوپہر کے کھانے کے بعد ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے وہ لوگ آپؓ کے خادم سے کہنے لگے۔

''ہم آپ کے خلیفہ سے ملنے آئے ہیں۔''

اس شخص نے جواب دیا۔

''یہ ہیں ہمارے خلیفہ اور جہاں آپؓ آرام فرما رہے ہیں یہ ہی جگہ ہمارا ایوان صدر ہے۔''

فریال امین، ٹوبہ ٹیک سنگھ

آپ بھی سنیئے

- O کچھ لوگ ہوا کی مانند ہوتے ہیں چپکے سے زندگی میں آتے اور چپکے سے زندگی کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔
- O انسان کو فنا ہے لیکن محبت کو نہیں، تو کیا مرنا محبت کے لئے اختتام کا نام ہے؟
- O محبت پربتوں کے دامن سے پھوٹنے والے چشمے کی طرح اپنی سمت اور اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے لیکن کچھ محبتیں درگاہ پہ تقسیم ہونے والی نیاز کی طرح ہوتی ہیں جنہیں خالی ہاتھوں سے ننگے پاؤں چل کر حاصل کرنا پڑتا ہے۔

میری ڈائری سے

صائمہ محمود

سعدیہ جبار: کی ڈائری سے ایک نظم
اے عشق ہمیں برباد نہ کر
ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں
ہم تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم تو نہیں
یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر بیدار نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر
جس دن سے ملے ہیں دونوں کا
سب چین گیا آرام گیا
چہروں سے بہار صبح گئی
آنکھوں سے فروغ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا
ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگین نہ بنا ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد کر
وہ راز ہے یہ غم آہ جسے
پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں
آ جائے کوئی تو خیر نہیں
ظالم ہے یہ دنیا دل کو یہاں
بھا جائے کوئی تو خیر نہیں
ہے ظلم مگر فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر
آنسہ ممتاز: کی ڈائری سے ابن انشاء کی غزل
اس دل کے جھروکے میں اک روپ کی رانی ہے
اس روپ کی رانی کی تصویر بنانی ہے
ہم اہل محبت کی وحشت کا وہ درماں ہے
ہم اہل محبت کو آزار جوانی ہے
یاں چاند کے داغوں کو سینے میں بساتے ہیں
دنیا کہے دیوانہ یہ دنیا دیوانی ہے
اک بات مگر ہم بھی پوچھیں جو اجازت ہو
کیوں تم نے یہ غم دے کر پردیس کی ٹھانی ہے
سکھ لے کے چلے جانا دکھ دے کر چلے جانا
کیوں حسن کے ماتوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہدیہ دل مفلس کا چھ شعر غزل کے ہیں
قیمت میں تو ہلکے ہیں انشاء کی نشانی ہے
فریال امین: کی ڈائری سے محسن نقوی کی نظم
''میرے نام سے پہلے''
اب کے اس کی آنکھوں میں
بے سبب اداسی تھی
اب کے اس کے چہرے پر
دکھ تھا بے حواسی تھی
اب کے یوں ملا مجھ سے
یوں غزل سنی جیسے
میں بھی ناشناسا ہوں جیسے
وہ بھی اجنبی جیسے
زرد خال و خد اس کے
سوگوار دامن تھا
اب کے اس کے لہجے میں
کتنا کھردرا پن تھا
وہ کہ عمر بھر جس نے

شہر بھر کے لوگوں میں
مجھ کو ہم سخن جانا
دل سے آشنا لکھا
خود سے مہرباں سمجھا
مجھ کو دلربا لکھا
اب کے سادہ کاغذ پر
سرخ روشنائی سے
اس نے تلخ لہجے میں
میرے نام سے پہلے
صرف ''بے وفا'' لکھا
نازیہ کمال: کی ڈائری سے امجد سلام امجد کی نظم
''آبلہ''
اداسی کے افق پر جب تمہاری یاد
کے جگنو چمکتے ہیں
تو میری روح پر رکھا ہوا یہ ہجر کا پتھر
چمکتی برف کی صورت پگھلتا ہے
اگرچہ یوں پگھلنے سے یہ پتھر، سنگریزہ تو نہیں بنتا
مگر اک حوصلہ سا دل کو ہوتا ہے
کہ جیسے سر سبز تاریک شب میں بھی
اگر اک زرد رو، سہما ہوا تارا نکل آئے
تو قاتل رات کا بے اسم جادو ٹوٹ جاتا ہے
مسافر کے سفر کا راستہ تو کم نہیں ہوتا
مگر تارے کی چلمن سے
کوئی بھولا ہوا منظر اچانک جگمگاتا ہے
سلگتے پاؤں میں اک آبلہ سا پھوٹ جاتا ہے
مریم رباب: کی ڈائری سے خوبصورت غزل
یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر میں رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
نہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو
ابھی راہ میں کئی موڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی جائے گا
تمہیں جس نے دل سے بھلا دیا اسے بھولنے کی دعا کرو
مجھے اشتہار سی لگتی ہیں یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سنا کرو جو سنا نہیں وہ کہا کرو
کبھی حسن پردہ نشیں بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں میرے ساتھ تم بھی چلا کرو
نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا کوئی اثر نہ ہو
اسے اتنی گرمی شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا کرو
یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو
اُم خدیجہ: کی ڈائری سے ایک غزل
وہی قصے ہیں وہی بات پرانی اپنی
کون سنتا ہے بھلا رام کہانی اپنی
ستم گر کو یہ ہمدرد سمجھ لیتی ہے
کتنی خوش فہم ہے کم بخت جوانی اپنی
روز ملتے ہیں دریچے میں لئے پھول مجھے
چھوڑ جاتا ہے کوئی روز نشانی اپنی
تجھ سے بچھڑے ہیں تو پایا ہے بیاباں کا سکوت
ورنہ دریاؤں سے ملتی تھی روانی اپنی
دشمنوں سے ہی غم دل کا مداوا مانگیں
دوستوں نے تو کوئی بات مانی اپنی
آج پھر چاند افق پر نہیں ابھرا محسن
آج پھر رات نہ گزرے گی سہانی اپنی
ثناء حیدر: کی ڈائری سے ایک غزل
غرور و نازو نخوت چھوڑ کر انسان ہونا ہے
بہت دشوار ہوں اب تک مجھے آسان ہونا ہے
یہ دانائی تو گمراہی کی جانب کھینچ لیتی ہے
اسی سے دست کش ہو کر مجھے نادان ہونا ہے
بہت کچھ جان کر جانا کہ اب تک کچھ نہیں ہونا
یہی جانا کہ بہتر جان کر انجان ہونا ہے
جو الجھی سوچ رکھتا ہو الجھنا اسی سے بے معنی
مجھے سلجھی سی اک تحریر کا عنوان ہونا ہے
یہ کیسے فاصلے کردار و شخصیت میں ملتے ہیں
بکھر کر مر رہا ہوں میں سو اب یکجان ہونا ہے

یہ انسانوں نے اخلاقی بلندی ہی سے سیکھا ہے
تمہیں احسان کرنا سر تا پا احسان ہونا ہے
زمیں سے اس قدر اچھی تمہیں وابستگی میری
عدم سے توڑ کر رشتہ مجھے امکان ہونا ہے

درثمین: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم

''بلاوا''

چلو اس کوہ پر ہم بھی چڑھ جائیں
جہاں پر جا کے پھر کوئی واپس نہیں آتا
سنا ہے اک ندائے اجنبی بانہوں کو پھیلائے
جو آئے اس کا استقبال کرتی ہے
اسے تاریکیوں میں لے کر آخر ڈوب جاتی ہے
یہی وہ راستہ ہے جس جگہ سایہ نہیں جاتا
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا
جو سچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر ہارتے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطرے سے کانپتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے
آئے
ہمیشہ دوسروں کے سائے میں اک دوسرے کو
چاہتے آئے
برا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا
کہاں تک اپنے بوسیدہ بدن محفوظ رکھیں گے
کسی کے ناخنوں ہی کا مقدر جاگ لینے دو
کہاں تک سانس کی ڈوری سے رشتے جھوٹ
کے باندھیں
کسی کے پنجہ بے درد ہی سے ٹوٹ جانے دو
پھر اس کے بعد تو بس اک سکوت مستقل ہوگا
نہ کوئی سرخرو ہوگا نہ کوئی منفعل ہوگا

آسیہ وحیدر: کی ڈائری سے ایک نظم

آخر چند دن دسمبر کے
ہر برس ہی گراں گزرتے ہیں
خواہشوں کے نگار خانے سے
کیسے کیسے گماں گزرتے ہیں
رفتگاں کے بکھرے سایوں کی
ایک محفل سی دل میں سجتی ہے
کتنے نمبر پکارتے ہیں مجھے
جن سے مربوط بے نوا گھنٹی
اب فقط میرے دل میں بجتی ہے
کس کس پیارے پیارے
ناموں پر رینگتی بدنما سی لکیریں
میری آنکھوں میں پھیل جاتی ہیں
دوریاں دائرے بناتی ہیں
دھیان کی سیڑھیوں پر کیا کیا عکس
مشعلیں درد کی جلاتے ہیں
نام جو کٹ گئے ہیں ان کے حرف
ایسے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں
حادثے کے مقام پر جیسے
خون سوکھتے نشانوں پر
چاک سے لائنیں لگاتے ہیں
پھر دسمبر کے آخری دن
ہر برس کی طرح اب کے بھی
ڈائری ایک سوال کرتی ہے
کیا خبر اس کے آگے تک
میرے ان بے چراغ صفحوں سے
کتنے ہی نام کٹ گئے ہوں گے
کتنے نمبر بکھر کے رستوں میں
گرد ماضی میں اٹ گئے ہوں گے
خاک کے ڈھیروں کے دامن میں
کتنے طوفان سمٹ گئے ہوں گے
ہر دسمبر میں سوچتا ہوں
ایک دن اس طرح بھی ہوتا ہے
رنگ کو روشنی میں رکھی ہوئی
ڈائری دوست دیکھتے ہوں گے

☆☆☆

رنگ حنا

بلقیس بھٹی

ایسی حالت

بیکر کا انگوٹھا زخمی ہو گیا، وہ اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے انگوٹھے کو دیکھ کر کہا۔

''گھر جاؤ اور انگوٹھے کو دو تین گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں ڈبوئے رکھو۔''

گھر جا کر بیکر نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا، اسی اثناء میں اس کی بیوی آ گئی اور پوچھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' شوہر نے کہا۔

''میرے انگوٹھے میں تھوڑی سی چوٹ آ گئی ہے ڈاکٹر کا کہنا ہے، اگر میں دو تین گھنٹے تک اسے ٹھنڈے پانی میں رکھوں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیسا بے وقوف ڈاکٹر ہے؟'' بیوی نے کہا۔

''زخمی انگوٹھے کو ٹھیک کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے گرم پانی میں ڈبویا جائے۔''

بیوی کے کہنے پر بیکر نے دو تین گھنٹے تک انگوٹھے کو گرم پانی میں رکھا اور انگوٹھا واقعی ٹھیک ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد اس کی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا۔

''میں نے تمہارے کہنے پر عمل نہیں کیا تھا بلکہ بیوی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے انگوٹھے کو گرم پانی میں ڈبویا تھا، جس کی وجہ سے انگوٹھا ٹھیک ہو گیا۔''

''عجیب بات ہے۔'' ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

''میری بیوی تو ایسی حالت میں ہمیشہ انگوٹھا ٹھنڈے پانی میں ڈبونے کو کہتی ہے۔''

ام ایمن، گوجرانوالہ

ٹاس

مچھلی کے شوقیہ شکاری نے اتوار کی صبح دریا میں ڈور ڈالتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

''میں کوئی کام ٹاس کیے بغیر نہیں کرتا اس لئے کبھی ناکام نہیں ہوتا، آج صبح بھی ٹاس کر کے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ مجھے شکار کو جانا چاہیے یا چرچ؟''

''اور تم جیت گئے ہو گے؟'' دوست نے حیرت سے پوچھا۔

''بڑا سخت مرحلہ تھا مجھے چھ مرتبہ سکہ اچھالنا پڑا پھر کہیں جا کر شکار کے حق میں فیصلہ ہوا۔''

عابدہ سعید، گجرات

نشانہ باز

ایک ماہر نشانہ باز کے پاس ایک اخباری نمائندہ انٹرویو کرنے گیا کمرے میں بہت سی آنکھیں بنی ہوئی تھیں اور ہر آنکھ پر صحیح نشانہ لگا تھا اخباری نمائندے نے نشانوں سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔

''آخر آپ ایسا اچھا نشانہ کس طرح لگا لیتے ہیں؟''

''یہ کون سا مشکل کام ہے پہلے ہم نشانہ لگاتے ہیں اور پھر اس نشانے پر آنکھ بنا لیتے ہیں۔''

فرح عامر، جہلم

درخواست

سمیرا نے اپنی دوست کو بتایا۔

''مجھ سے ہزاروں مرتبہ درخواست کی جا چکی ہے کہ میں شادی کرلوں۔''

''کون کرتا ہے تم سے یہ درخواست؟'' سلمٰی نے تجسس سے پوچھا۔

''میرے والدین۔'' سمیرا نے جواب دیا۔

فائزہ قاسم، سکھر

اصلاح

''میں اور میرے بہترین دوست ازمیر نے جب پڑھا کہ تمہارا سچا اور حقیقی دوست وہ ہے جو تمہیں تمہارے عیبوں سے آگاہ کرے، تو ہم اس پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔''

''اس سے تم دونوں کو اپنی اصلاح کرنے میں کافی مدد ملی ہوگی۔''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ پچھلے پانچ سال سے ہماری بول چال بند ہے۔''

نعیم امین، کراچی

ناقدری

امیر گھرانوں میں عجیب عجیب نسل کے کتے پالنے کا رواج ہوتا ہے، ایک امیر خاتون کا لمبے لمبے بالوں والا چھوٹا سا گول مٹول کتا گم ہوگیا، جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا، انہوں نے بہت تلاش کرایا، انعام بھی رکھا مگر کتا نہ ملا، آخر انہوں نے بھاری معاوضے پر ایک سراغ رساں کی خدمات حاصل کیں، سراغ رساں کتے کو ڈھونڈ لایا، مگر اس کی حالت اچھی نہیں تھی، وہ گیلا تھا اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔

''یہ تمہیں کہاں ملا؟'' خاتون نے کتے کو سینے سے لگا کر روتے ہوئے پوچھا۔

''قریبی مارکیٹ سے۔'' سراغ رساں نے جواب دیا۔

''ایک بلڈنگ کے چوکیدار نے اسے لمبے ڈنڈے کے سرے پر باندھا ہوا تھا اور اس سے کھڑکیاں اور روشن دان صاف کر رہا تھا۔''

ہما رائے، کراچی

فہرست

کسی بادشاہ نے اپنے وزیر کو حکم دیا ہے کہ اس ملک کے بے وقوفوں کی فہرست تیار کی جائے۔

وزیر نے عرض کیا۔

''اگر جان کی امان ہو تو سب سے پہلے آپ کا نام ہونا چاہیے، کیونکہ آپ نے اسی ہفتے ایک غلام کو دو لاکھ دینار دے کر دوسرے شہر بھیجا ہے اگر وہ واپس نہ آیا تو......''

''اور اگر وہ خوش قسمتی سے واپس آجائے تو تم کیا کرو گے۔'' بادشاہ نے پوچھا۔

''تب میں آپ کا نام فہرست سے کاٹ کر اس کا نام لکھ دوں گا۔''

نبیہ آصف، قصور

رازداری

''ڈیڈی! میں آپ سے یہ بات کہہ تو رہا ہوں لیکن ممی کو بتایئے گا مت، میرا خیال ہے انہیں بچے پالنے نہیں آتے۔''

''تمہیں یہ خیال کیوں آیا بیٹا؟''

''آپ خود یہ دیکھیں نا، وہ اس وقت مجھے سونے کے لئے بھیج دیتی ہیں جب میں جاگ رہا ہوتا ہوں اور اس وقت مجھے جگا دیتی ہیں جب میں سو رہا ہوتا ہوں۔''

ثمینہ رفیق، گوٹھی کراچی

جواب

اردو کے پروفیسر سے اس کی محبوبہ نے دل لگی کرنے کے لئے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''میں تم جیسے کتابی کیڑے سے شادی تو دور کی بات ہے، بات کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی، نہ تمہارے دل میں کوئی امنگ ہے نہ ترنگ اس لئے میرے خطوط واپس کردو۔''

پروفیسر نے جواباً کہا۔

''مجھے بھی تمہارے لکھے ہوئے خط رکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری اردو کی لکھائی بہت خراب ہے، تمہارا خط پڑھنے کے لئے اگر میں صبح بیٹھوں تو شام ہو جاتی ہے اور اللہ کی پناہ! تم ایک پیرے میں چھ سات غلطیاں کر لیتی ہو، تم بے فکر رہو، میں ابھی گھر جا کر تمہارے خطوط نما نقشے لے کر آتا ہوں۔''

رمشہ ظفر، بہاول پور

فرق

شادی کے ایک ہفتے بعد دولہا، دلہن ہنی مون کے لئے روانہ ہوئے رستے میں دلہن کو ٹھوکر لگی تو دولہا نے فوراً اس کو بانہوں میں تھام لیا اور بولا۔

''ڈارلنگ آرام سے۔'' شادی کے دس سال بعد پھر ایک جگہ جاتے ہوئے دلہن کو ٹھوکر لگی تو دولہا نہایت غصے کے عالم میں بولا۔

''اندھی ہوگئی ہو دیکھ کر نہیں چل سکتیں۔''

عاصمہ سرور، وہاڑی

نمکین غزل

کاغذ گراں ہوا تو بڑا ہی غضب ہوا
اعمال ناموں والا فرشتہ طلب ہوا
اور بارگاہ غیب سے ارشاد رب ہوا
کاغذ کی اس کمی کا بتا کیا سبب ہوا
اس وقت جب زمین پہ اک قتل عام ہے
اعمال لکھے جانے کا کیا انتظام ہے
وہ بولا ہاتھ جوڑ کے اے صاحب کرم
کاغذ کے کارخانوں میں اب بن رہے ہیں بم
کاتب سے کہہ دیا ہے باریک ہو قلم
مضمون مختصر کرو بین السطور کم
ملحوظ رکھو رات دن اس انتظام کو
لکھو تو حاشیہ نہ ہو کاغذ میں نام کو

رابعہ ارشد، فیصل آباد

انتظار

ایک صاحب نے قسطوں پر ٹی وی لینے کے لئے ایک کمپنی کے دفتر میں درخواست فارم جمع کروایا کمپنی نے ریکارڈ چیک کیا تو پتا چلا کہ احسان صاحب کے ذمے پہلے بھی ایک ٹی وی کی چند قسطیں واجب الادا ہیں کمپنی کے مینجر نے احسان صاحب کو فون کیا۔

''جب تک آپ پہلے ٹی وی کی قسطیں نہیں دیں گے ہم آپ کو دوسرا ٹی وی نہیں دے سکتے۔''

''ٹھیک ہے......تو پھر آرڈر کینسل کر دیں میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔'' احسان صاحب نے ذرا خفگی سے کہا۔

مسرت مصباح، لاڑکانہ

☆☆☆

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | PAKSOCIETY

حنا کی محفل

عین غین

ثوبیہ منیر ---- شیخوپورہ

س: باہر کا موسم اندر کے موسم سے کب ملتا ہے؟

ج: دل کی مراد بھر آنے پر۔

س: اگلے موسم بہار میں بھلا ہم کہاں ہوں گے؟

ج: ایک شخص کی لڑکی گھر سے بھاگ گئی، دوسرے دن وہ افسوس کرنے والے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ایک بات ہے کہ میری وہ لڑکی بڑی اللہ والی تھی بھاگنے سے ایک رات پہلے وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ ابا دو دن بعد ہمارے ہاں ایک شخص کم ہو جائے گا، اب تم؟

س: ہر شوہر کی بیوی اچھی لگتی ہے مگر دوسرے کی کیوں؟

ج: اس کو تو کہتے ہیں کہ گھر کی مرغی دال برابر۔

ناعمہ عثمان ---- وہاڑی

س: آپ کو کبھی کسی نے دن میں تارے دکھائے؟

ج: کیوں تمہارا ارادہ ہے۔

س: اگر انسان ریموٹ کنٹرول سے چلنے لگیں تو؟

ج: لگیں تو کیا مطلب، ابھی بھی چلتے ہیں یقین نہیں آتا تو کسی بھی شوہر کو دیکھ لو۔

س: نفرت کی زمین پر بھی پیار لکھنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟

ج: اس دور میں تو پاگل ہی ہوتے ہیں۔

س: کس موسم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے؟

ج: جس میں اندر اور باہر کا موسم یکساں خوشگوار ہو۔

وفا حیدر ---- سرگودھا

س: السلام علیکم! جناب کیا کر رہے ہیں؟

ج: آپ کے سوال پڑھ رہا ہوں۔

س: ہمیں تو حنا کی محفل سے محبت ہے اور آپ کو؟

ج: محفل والوں سے۔

س: کبھی غصہ آیا؟

ج: بے تکے سوال پڑھ کر۔

س: کس بات پر زیادہ غصہ آیا؟

ج: جس بات پر بھی غصہ آیا۔

س: زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

ج: برا مان جاؤ گی پڑھ کر۔

س: کیا دوستی پیار ہے؟

ج: نہیں۔

س: کیا زندگی گزارنے کے لئے لو میرج ضروری ہے؟

ج: اچھے بچے ایسی باتیں نہیں سوچتے۔

س: میرے بی اے کے پیپرز ہونے والے ہیں، دعا کریں گے؟

ج: کس کے لئے؟ تمہارے لئے یا ممتحن کے لئے۔

رضا فاطمہ ---- سادھوکی

س: آداب عین غین جی کیسے مزاج ہیں؟

ج: اللہ کا شکر ہے۔

س: میرے بغیر کیسا رہا؟

ج: سچ سچ بتائیں، برا تو نہیں مانوں گی۔

س: عین غین جی تو مائنڈ بتائیں؟

ج: بہت سکون رہا۔

بیاض

تسنیم طاہر

جویریہ ناصر ---- گلبرگ لاہور

ضبط کرتا ہوں تو ہر زخم لہو دیتا ہے
آہ کرتا ہوں تو اندیشہ رسوائی ہے
دیکھتا ہوں تو ہزاروں سے شناسائی ہے
سوچتا ہوں تو وہی غم وہی تنہائی ہے

…………

پہاڑ اپنی جگہ ساکت کھڑا ہے
مگر یہ جبر بھی کتنا کڑا ہے
میں اس سے روٹھنا چاہوں بھی کیسے
کہ وہ میرے لئے مجھ سے لڑا ہے

…………

کسی نے دی نہیں آواز مجھ کو
مگر پھر بھی یہاں رکنا پڑا ہے
بہت چاہا مگر کب مانگ پائی
کہ وہ میری دعاؤں سے بڑا ہے

اُم ایمن ---- گوجرانوالہ

شہر کراچی یاد ہے تجھ کو
تیرے شب بیداروں میں
مرزا سا چغتائی بھی تھا
یار ہمارا یاروں میں

…………

میری خطا پہ سنگ زنی کیجئے مگر
اپنے گناہ تول کر پتھر اٹھایئے

…………

پھر دیے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں
آج دروازہ دل کا کھلا دیکھ کر
اس کی آنکھوں کا ساون برسنے لگا
بادلوں میں پرندہ گھرا دیکھ کر

عابدہ سعید ---- گجرات

پھر کون بھلا داد تبسم انہیں دے گا
روئیں گی بہت مجھ سے بچھڑ کر تیری آنکھیں
میں سنگ صفت ایک ہی رستے میں کھڑا ہوں
شاید مجھے دیکھیں گی پلٹ کر تیری آنکھیں

…………

کسی بھی بات پر ابھی بھیگتی نہیں آنکھیں
کہ اپنا حال بھی سوکھے چناب جیسا ہے
کسے سناؤں میں اس دل کی داستاں واثق
شب فراق کا ہر پل عذاب جیسا ہے

…………

تھی جاں بہت عزیز مگر درد درد تھا
حد سے بڑھا جو درد تو جاں سے گزر گئے
تقدیر کا یہ حسن توازن بھی خوب ہے
بگڑے نصیب اپنے کسی کے سنور گئے

فرح طاہر ---- جہلم

پھولوں کے نشیمن میں رہا ہوں صدا سے
دیکھو کبھی خاروں سے میرا ذکر نہ کرنا
وہ میری کہانی کو غلط رنگ نہ دے دیں
افسانہ نگاروں سے میرا ذکر نہ کرنا

…………

نرم لفظوں سے بھی لگ جاتی ہے چوٹیں اکثر
دوستی ایک بڑا نازک سا ہنر ہوتی ہے

…………

دل میں نہ کبھی جھانکا نہ مساکین کو دیکھا
تسبیح کے دانوں میں خدا ڈھونڈ رہے ہیں

فائزہ قاسم ---- سکھر
یہ میرا حوصلہ ہے تیرے بغیر
سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

…………

کتنے ستم ظریف ہیں یاران خوش مذاق
آواز مر گئی تو مجھے ساز دے دیے

…………

ہوئے جاتے ہیں کیوں غم خوار قاتل
نہ تھے اتنے بھی دل آزار قاتل
مسیحاؤں کو جب آواز دی ہے
پلٹ کر آ گئے ہر بار قاتل
نعیم امین ---- کراچی
ہر اک شہر کا ماحول ایک جیسا ہے
تو اس دیار میں کتنے مکان بدلے گا

…………

آخری بار ملاقات کی حسرت ہے مگر
تم سے کچھ اس کے سوا اب نہیں کہنا مجھ کو
مجھ کو جاتے ہوئے آواز نہ دینا ہرگز
دیکھنا اور فقط دیکھتے رہنا مجھ کو

…………

کی تھی محبت میں نے سکون دل کے لئے
وہ سینے میں اٹکا رہا چبھن کی طرح
بڑھائے تھے میں نے قدم روشنی کے لئے
وہ جلاتا رہا مجھے بس اگن کی طرح
ہما رائے ---- کراچی
میری دیوانگی پہ اس قدر حیران ہوتے ہو
میرا نقصان تو دیکھو محبت گم شدہ میری

…………

ہمارے دل بہت زخمی ہیں لیکن
محبت سر اٹھا کر جی رہی ہے

…………

اب تو تنہائی کا یہ عالم ہے فراز
کوئی ہنس کر بھی دیکھے تو محبت کا گماں ہوتا ہے
نبیہ آصف ---- قصور
وہ جس کا ضبط تھا بلند پربتوں کی طرح
کسے خبر تھی روئے گا اک دن بادلوں کی طرح
جانے کیوں گریزاں ہیں مجھ سے احباب میرے
میں تو مخلص تھا ماں کی دعا کی طرح

…………

آنکھیں مصروف ہو جاتی ہیں بھلا دیتے ہیں لوگ
دور بہت دور نکلتے ہیں منزلیں گنوا دیتے ہیں لوگ
دست طلب اٹھا کے مانگتے ہیں محبت خدا سے
جو ہو دسترس میں تو خود ہی گنوا دیتے ہیں لوگ

…………

جگر ہو جائے گا چھلنی یہ آنکھیں خون روئیں گی
وصی بے فیض لوگوں سے نبھا کر کچھ نہیں ملتا
ثمینہ رفیق ---- کورنگی کراچی
کچھ اس لئے بھی میں اسے ضرور مناؤں گا محسن
کہ پھر سے روٹھنے والا بھلا نہ دے مجھے

…………

مشکل کہاں تھے ترک تعلق کے مرحلے
اے دل مگر سوال تیری زندگی کا تھا

…………

تمہیں خبر ہی نہیں کہ کوئی ٹوٹ گیا ہے
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے
رمشہ ظفر ---- بہاولپور
نہیں آتی نیند بھی موت بھی چین بھی
نہیں آتا وہ بھی کچھ دنوں سے
ہلکا ہو گیا آج کھل کے رونے سے
بہت بوجھل تھا جی کچھ دنوں سے

…………

کیوں طبیعت کہیں ٹھہرتی نہیں
دوستی تو اداس کرتی نہیں
جس طرح تم گزارتے ہو فراز

زندگی تو اس طرح گزرتی نہیں

…………

بارش سے کھیلتی رہیں پختہ عمارتیں
بجلی گری تو شہر کے کچے مکان پر
عاصمہ سرور ---- وہاڑی
غم و سفاک ستم کا قطرہ ہے
جو رگوں میں اتر کے بس جائے
زندگی وہ اداس جوگن ہے
جس کو ساون میں سانپ ڈس جائے

…………

تیری یاد اور برف باری کا موسم
سلگتا رہا دل کے اندر اکیلے
ارادہ تھا جی لوں گا تجھ سے بچھڑ کر
گزرتا نہیں دسمبر اکیلے

…………

ہمیں تو بس یہ پتا ہے کہ جس شب مجھے چھوڑ کر تم چلے گئے
آسمانوں سے شعلہ نکلتا رہا چاند جلتا رہا
وہ دسمبر کو جس میں کڑی دھوپ بھی میٹھی لگنے لگی
تم نہیں تو دسمبر سلگتا رہا چاند جلتا رہا
رابعہ ارشد ---- فیصل آباد
گزرے لمحوں کو بھلانے میں کچھ وقت لگے گا
اپنی ذات سے باہر نکلنے میں کچھ وقت لگے گا

…………

ٹوٹ جاتے ہیں سبھی رشتے مگر
دل سے دل کا رابطہ اپنی جگہ
دل کو ہے تجھ سے نہ ملنے کا یقین
تجھ کو پانے کی دعا اپنی جگہ

…………

پچھلے برس تھا خوف تجھے کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو
مسرت مصباح ---- لاڑکانہ
میں کیا چنتی تھی شب و روز محبت کے گلاب
مجھ کو معلوم نہ تھا درد کسے کہتے ہیں

…………

اس دل کے بہلنے کو یہ سامان بہت ہے
وہ اپنی جفاؤں پہ پشیمان بہت ہے
اب کے بھی اجڑ جائیں گے بستی کے کئی گھر
اس سال بھی برسات کا امکان بہت ہے

…………

یہ ہی نہیں ہے کہ ہمیں توڑ کر گیا ہے کوئی
اسے بھی خود کو بہت دیر جوڑنا ہو گا
سعدیہ جبار ---- ملتان
دوسروں کے سپرد کرکے اسے
خود کو دھوکا دیا تھا خود میں نے
کس قدر یادگار لمحہ تھا
اس کو رخصت کیا تھا خود میں نے

…………

دکھ ہزاروں دیے ہیں گئے سال نے
دیکھو دینا ہے کیا اس نئے سال نے

…………

سانحہ ایک ہو تو بتلائیں
اس کو کھونے کا اس کو رونے کا
بس یہی زندگی کا حاصل ہے
ایک احساس اپنے ہونے کا
آنسہ ممتاز ---- رحیم یار خان
ایک تیری تمنا نے کچھ ایسا نوازا ہے
مانگی ہی نہیں جاتی اب کوئی دعا ہم سے

…………

اس ایک سال میں کیا کیا نہ ہوا عادل
کچھ الفتیں بھی ملیں کچھ الفتیں بھی گئیں

…………

پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بننے پایا
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے پائی

☆☆☆

حنا کا دسترخوان

افراح طارق

کھٹا پلاؤ

اشیاء

چاول	ایک کلو
گوشت	ایک کلو
املی	125 گرام
نمک	حسب ذائقہ
ادرک، لہسن پیسٹ	دو کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لونگ	چار عدد
ثابت سیاہ مرچیں	ایک کھانے کا چمچہ
بڑی الائچی	دو عدد
دار چینی	ایک عدد
پیاز (درمیانے سائز کی)	دو عدد
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	چھ عدد
دودھ	آدھا کپ
زردے کا رنگ	تھوڑا سا
لیموں (رس نکال لیں)	دو عدد
تیل	آدھا کپ

ترکیب

چاولوں کو دھو کر بھگو دیں، املی کو بھی پانی میں بھگو دیجئے، پیاز کے باریک لچھے کاٹ لیں، ایک دیگچی میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر گولڈن براؤن کر لیں، اب اس میں زیرہ، لونگ، بڑی الائچی، سیاہ مرچیں اور دار چینی ڈال کر بھون لیں۔

اس کے بعد اس میں ادرک، لہسن پیسٹ اور نمک ڈال کر اچھی طرح بھونیں، اس کے بعد گوشت اور کٹی ہوئی ہری مرچیں ڈال کر بھونیں جب گوشت کا پانی سوکھ جائے تو دو کپ پانی ڈال کر ڈھکنا بند کر دیں اور پکنے دیں۔

جب پانی خشک ہو جائے اور گوشت گل جائے تو بھگوئی ہوئی املی میں سے بیج نکال کر تمام گودا اور پانی ہنڈیا میں ڈال کر پکنے دیں، جب املی کا آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو آنچ ہلکی کر دیں۔

اب ایک دیگچی میں ایک تہ چاولوں کی لگائیں اور پھر اس کے اوپر سارا گوشت مسالے سمیت ڈال دیں، اب آدھی پیالی دودھ میں تھوڑا سا زردے کا رنگ ملائیں اور اسے چاولوں کی اوپری تہ پر چھڑک دیں اور لیموں کا رس اس پر چھڑک کر دم پر رکھ دیں، پندرہ بیس منٹ بعد لذیذ کھٹا پلاؤ گرم گرم سرو کریں۔

چنے کی دال مسالا

اشیاء

چنے کی دال	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچیں	ایک چائے کا چمچہ
لہسن، ادرک پیسٹ	دو چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (چوپ کر لیں)	ایک عدد
تیل	آدھا کپ
پودینہ، ہری مرچیں	چوتھائی چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	ایک عدد

ترکیب

دال کو صاف کر کے پانی میں ڈال کر تیس منٹ کے لئے بھگو دیں ایک پتیلی میں دال ڈال کر اس میں نمک، کٹی لال مرچیں، لہسن، ادرک پیسٹ، ثابت گرم مسالا، پیاز اور حسب ضرورت پانی شامل کر کے دال کے گل جانے تک پکائیں، اس کے بعد اس میں پودینہ، ہری مرچیں اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال دیں۔

فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر براؤن کریں اور دال پر اس کی بگھار لگا دیں مزے دار چنے کی دال مسالا تیار ہے۔

کڑاہی قیمہ انڈے والا

اشیاء

قیمہ (ہاتھ کا موٹا کٹا ہوا)	ایک کلو
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
انڈے (سخت ابلے ہوئے)	دو عدد
سرخ مرچ کٹی ہوئی	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک، لہسن پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ٹماٹر	آدھا کلو
قصوری میتھی	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لمبائی میں کٹی ہوئی	دو کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا، ہری مرچیں	گارنشنگ کے لئے
تیل	ڈیڑھ کپ

ترکیب

سوس پین میں تیل گرم کر کے اس میں قیمہ ڈال کر بھونیں، براؤن ہو جانے پر اس میں نمک، کٹی ہوئی سرخ مرچ، ادرک، لہسن پیسٹ، ہلدی پاؤڈر، ادرک، ٹماٹر ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔

انڈوں کے کٹر سے ٹکڑے کر لیں قیمہ گل جائے تو اسے خوب اچھی طرح بھون کر اس میں قصوری میتھی ڈال کر دو منٹ تک بھونیں اب احتیاط سے انڈے مکس کر کے ڈش میں نکال کر ادرک، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر گرما گرم نان کے ساتھ سرو کریں۔

ہرے مسالے کی بوٹی

اشیاء

گوشت (بوٹیاں بنا لیں)	آدھا کلو
ہری مرچیں (پسی ہوئی)	دس عدد
پودینہ (پسا ہوا)	چوتھائی کپ
ہرا دھنیا	آدھا کپ
کوکونٹ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
کچا پپیتا (پیس لیں)	دو کھانے کے چمچ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
سرکہ	چوتھائی چائے کا چمچ
کھانے کا رنگ	چند قطرے
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچ
تیل	تین کھانے کے چمچے

ترکیب

گوشت دھو کر خشک کر لیں اب اس میں ہری مرچیں، پودینہ، ہرا دھنیا، کوکونٹ پاؤڈر، نمک، پپیتا، زیرہ، لہسن، ادرک پیسٹ، گرم مسالا پاؤڈر، سرکہ، کھانے کا ہرا رنگ، لیموں کا رس اور تیل لگا کر دو تین گھنٹے کے لئے چھوڑ دیں، میرینیٹ کیے ہوئے گوشت کو سیخوں پر لگا کر باربی کیو کر لیں یا سوس پین میں ڈال کر پکا لیں اور بھون کر کوئلے کا دھواں دے دیں، پراٹھے اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں

☆☆☆

کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

اکتوبر کے شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ۔

انسان کو زندگی کتنی ملتی ہے، شعور آتے آتے زندگی کا کچھ حصہ تو گزر چکا ہوتا ہے، باقی زندگی کو بھی ختم ہونا ہی ہے، اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اس فانی دنیا میں اپنی خواہشات کا پیچھا کرتے کرتے انسان اپنے جیسے دوسروں انسانوں کی زندگی سے آسانی سے کھیل جاتا ہے۔

دوسروں پر سبقت حاصل کرنے کی خواہش اور جذبہ برا نہیں، لیکن اس حد تک کہ اس کے لئے اپنے ملک کی ساکھ اور قومی اداروں کی اساس کو داؤ پر لگا دینا کہاں کی سبقت ہے۔

وطن عزیز اس وقت جس انتشار اور بحران سے گزر رہا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی یکجہتی اور اجتماعی سوچ بہت ضروری ہے، انفرادی غلطیوں کا سدھار تو ممکن ہے لیکن جب بات قومی وسلامتی کی ہو تو اس کا خمیازہ نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے کاش ہمارے اہل سیاست اس بات کو جان سکیں کہ اقتدار کی اس جنگ نے ہماری قومی معیشت پر تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔

دوسری طرف قدرتی آفات کا سلسلہ بارش وسیلاب کی صورت ملک پر مسلط ہے، ابھی پچھلی تباہی کے نشان مٹے نہ تھے کہ ملک کا ایک بڑا زرعی حصہ پھر زیر آب آ گیا، پانی جو زندگی ہے بارش جس کے لئے دعائیں مانگی جاتی ہیں یہ آب رحمت ارباب اقتدار کی بے حسی، ناقص منصوبہ بندی کی بدولت تباہی و بربادی کی ان گنت داستانیں رقم کرتا سمندر کی نظر ہو جائے گا۔

آیئے اس مشکل گھڑی میں ہم سب کو اپنے حصے کا دیا جلائیں کھلے آسمان تلے بیٹھے یہ بے سرو سامان لوگ ہمارا ہی حصہ ہیں، ان حالات میں ان کی مدد نہ صرف ہمارا دینی واخلاقی فریضہ ہے بلکہ ہمارا فرض بھی ہے ہماری تھوڑی سی مدد ہماری ذرا سی توجہ ان کی مشکلات کم کر سکتی ہے۔

کسی انسان کو بچانا سب سے بڑی نیکی ہے جس نے کسی ایک انسان کی زندگی بچائی اس نے پوری انسانیت کو بچایا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے ہمارے ملک کو اس میں بسنے والوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔

آیئے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں اور چلتے چلتے درود پاک، تیسرا کلمہ اور استغفار کا ورد زبان پر جاری رکھتے ہیں اسی میں ہماری دین ودنیا کی کامیابی ہے، اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا اور اپنا بہت سا خیال رکھئے گا اور ان کا بھی جو آپ کا خیال رکھتے ہیں۔

یہ پہلا خط ہمیں سرگودھا سے عاصمہ بخاری کا ملا ہے عاصمہ اپنی محبتوں کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

ستمبر کا شمارہ خوبصورت بلکہ خوبصورت ترین

ٹائٹل سے سجا ملا، حمد ونعت پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں ہمیشہ کی ایمان افروز تھیں، انشاء نامہ میں انشاء جی کے اجازت نہ دینے کے باوجود ہم نے کالم پڑھا اور لطف اندوز ہوئے، ایک دن میں عزہ خالد سے ملاقات کی اور پھر جلدی سے ”آخری جزیرہ“ میں جا پہنچے، اُم مریم یہ یکا یک آپ کو ڑالے کو اتنا دکھ دینے کی کیا سوجھی اور زینب زیادہ لاڈلی ہے آپ کی جو اس کو اتنی رعایت دے رہی ہیں، پلیز اس پر غور کریں۔

”اک جہاں اور ہے“ میں سدرۃ المنتہیٰ نے کچھ اسرار کھولے تو ہیں اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔

مکمل ناول میں سب بہترین تحریر ”بند مٹھی میں خواہش“ معصومہ منصور کی تھی، اگرچہ مصنفہ کا نام نیا تھا مگر تحریر کی پختگی بتا رہی تھی کہ آگے چل کر حنا کے لئے اچھا اضافہ ثابت ہوں گی، فرح طاہر کا ناول کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا، فرح طاہر چھوٹی تحریر افسانے وغیرہ تو لکھ لیتی ہیں مکمل طویل تحریر ابھی ان کے بس کی بات نہیں، ناولٹ میں ”کاسہ دل“ اپنے اختتام کو پہنچا، سندس جبیں اگرچہ ہر کردار کے ساتھ انصاف کیا مگر پھر بھی کچھ تشنگی محسوس ہوئی، یوں لگتا ہے کہ سندس نے آخری قسط انتہائی عجلت میں لکھی ہو۔

سباس گل ”ھذا من فضل ربی“ بھی بس ٹھیک تھی افسانوی موڑ کچھ زیادہ ہی تھے، سباس گل جملوں کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش میں تحریر کو غیر دلچسپ کر دیتی ہیں یہ چیز اس تحریر بے جا نظر آئی، افسانے سبھی اچھے تھے، خصوصاً عظمیٰ شاہین کا ”تجھ پہ جان نثار“ تو بے حد پسند آیا اللہ پاک ہماری افواج کو اپنی حفظ وامان میں رکھے، مستقل سلسلوں میں شگفتہ شاہ کا سلسلہ ”چٹکیاں“ ہمیشہ کی طرح شاندار رہا، ہمیں کرن نے کتاب نگر میں ”شہاب نامہ“ پر اچھا تبصرہ لکھا۔

حاصل مطالعہ، بیاض، میری ڈائری سے، حنا کی محفل، رنگ حنا، حنا کا دستر خوان اور کس قیامت کے یہ نامے اپنی مثال آپ تھے، تمام سلسلوں میں قارئین کی دلچسپی عروج پر نظر آئی۔

فوزیہ آپی فرحت شوکت، شازیہ رفیق، شگفتہ بھٹی یہ سب کہاں غائب ہیں بہت عرصے سے ان کی تحریریں نظر نہیں آئیں پلیز آپ ان کو بھی آواز دیں کہ وہ لوٹ آئیں، نبیلہ ابر راجہ سے کوئی سلسلے وار ناول لکھوائیں اب، ایک دن حنا کے ساتھ میں سدرۃ المنتہیٰ سے بھی ضرور ملوائیں۔

عاصمہ بخاری کیسی ہو اتنے لمبے عرصے کے بعد اس محفل میں آئی ہو کہاں غائب تھیں، مجھے تو آج بھی تمہارے خطوط میں پھولوں کا ملنا یاد ہے، ستمبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ تمہاری رائے مصنفین کو پہنچا دی ہے اور فرمائش نوٹ کر لی ہے، تمہارے ساتھ ان مصنفین کی تحریروں کے ہم بھی منتظر ہیں، ہمیں یقین ہے کہ فرحت شوکت، شازیہ رفیق، نبیلہ ابر راجہ اور شگفتہ بھٹی کو جب بھی کار ہائے زندگی کی مصروفیت سے موقع ملا وہ پہلی فرصت میں حنا میں اپنی تحریروں کے ساتھ جلوہ افروز ہوں گی، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہنا ہم تمہاری محبتوں، تمہاری رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

ثمینہ بٹ: لاہور سے لکھتی ہیں۔

فوزیہ جی طبیعت کے اپ سیٹ ہونے کی وجہ سے اس بار حنا مکمل نہیں پڑھ پائی ابھی تک، سیلابی صورت حال پر کہانی لکھ رہی تھی، آپ کو بھجوا رہی ہوں، اگر جگہ ہو تو ضرور لگایئے گا مہربانی ہوگی، ویسے میری پہلی تحریروں کو کب جگہ ملے گی مجھے شدت سے انتظار ہے۔

سندس جبیں کا ''کاسہ دل'' اس بار اپنے اختتام کو پہنچا، سندس نے کہانی کا اختتام بہت اچھا کیا، سب کے ''کاسہ دل'' اپنی مرادوں سے بھر گئے، کسی کو دکھ اور اذیت نہیں ملی اور یہ اس کہانی کی خوبصورتی اور سندس کی بڑی کامیابی ہے، بہت خوب سندس، ماشاء اللہ آپ کو اتنا خوبصورت ناولٹ لکھنے پر مبارک ہو اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو اور زیادہ لکھنے کی صلاحیت عطا کرے تاکہ آپ اسی طرح خوبصورت اور سحر انگیز کہانیاں تخلیق کرتی رہیں، جزاک اللہ۔

سردار سر کی باتیں ہمیشہ کی طرح اثر انگیز تھیں، اسلامیات والا حصہ بھی ہمیشہ کی طرح روح پرور رہا اور انشاء جی کا اجازت نہیں دی جا سکتی، ہمیشہ کی طرح زبردست اور بہترین رہا۔

ایک دن حنا کے ساتھ ''عزہ خالد'' کے ساتھ ملاقات بہت اچھی رہی، سیمیں کرن کی ''تالے چابیاں'' بہت خوب سیمیں ہمیشہ کی طرح آپ کی یہ تحریر بھی مجھے بہت اچھی لگی۔

شگفتہ شاہ کی ''چٹکیاں'' بھی غضب کی تھیں اور سیمیں کرن کا کتاب نگر بے حد زبردست، اس بار شہاب نامے پر تبصرہ بہت اعلیٰ تھا، میری موسٹ فیورٹ کتاب ہے یہ۔

اور آخر میں فوزیہ جی میں اس بار کے خطوط میں ''سارا رانی'' کے خط کی بات کرنا چاہتی ہوں، سارا جی آپ کو میرے تبصرے میں کیا ایسا لگا کہ آپ نے مجھے خود پسند کا خطاب دے ڈالا، نہیں بھئی، میں بالکل بھی خود پسند خود غرض وغیرہ وغیرہ نہیں ہوں، اگر آپ کو ایسا کچھ محسوس ہوا تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔

ثمینہ جی بہت شکریہ آپ کی آمد کی، ستمبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، حالات خواں کیسے بھی ہوں وہ ایک دن بدلتے ضرور ہیں، ظلم کا دور زیادہ عرصہ نہیں چلتا الحمد للہ پاکستان کی عوام اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہے آپ یہ مت دیکھیں کہ یہ ڈری سہمی عوام کو لیڈ کون کر دیا ہے آپ یہ دیکھیں آج اپنا حق مانگنا سکھایا کس نے ہے انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب عوام اور حکمران ایک ہی صف میں آ کھڑے ہوں گے، قانون غریب اور امیر کے لئے ایک سا ہی ہو گا، انشاء اللہ بہت جلد بس اک ذرا انتظار۔

فرح زیاد: گجرات سے لکھتی ہیں۔

ستمبر کا شمارہ چمکتے دمکتے سرورق کے ساتھ ملا، ٹائٹل پر اب ادارہ حنا کی خصوصی توجہ نظر آتی ہے، آگے بڑھے اور فہرست میں اپنی من پسند مصنفین نظر آئیں، سب سے پہلا اسلامیات کا حصہ لفظ بہ لفظ پڑھا، ماشاء اللہ بے حد خوبصورت سلسلہ ہے، یہ انشاء نامہ کے بعد عزہ خالد کے شب و روز کو جانا آگے بڑھے اور مکمل ناول والے حصے میں پہنچے، معصومہ منصور نے کمال کیا اتنی اچھی سلجھی ہوئی تحریر لکھی کے بے حد پسند آئی، معصومہ دل جیت لیا آپ نے، آپ کی مزید تحریروں کا انتظار رہے گا، دوسرا ناول فرح طاہر کا تھا کہانی کا آغاز اچھا تھا مگر بہت سی جگہ پر تحریر فرح کی گرفت سے باہر نظر آئی، یقیناً آگے چل کر فرح مزید محنت سے اپنی تحریر کو بہتر بنائے گی اس کے بعد ناولٹ کی باری آئی ''کاسہ دل'' میں سندس جبیں نے سب کرداروں کو خوشیاں مہیا کر دی ہیں اور سب کی دعائیں سمیٹ لیں، سندس جبیں ایک بات جو میں آپ سے کہنا چاہوں گی آٹھویں قسط کے بعد آپ کی تحریر میں وہ چاشنی نظر نہیں آئی جو آپ کی تحریر کا خاصہ ہے سٹارٹ کی اقساط میں آپ کا فوکس اپنے ایک ایک کردار پر تھا لیکن پھر یوں لگا جیسے آپ الجھ گئی ہوں جو لکھنا

چاہ رہی تھی وہ لکھ نہیں پائی، بظاہر آپ کا ناولٹ مکمل ہو گیا مگر مکمل ہو کر بھی نامکمل لگ رہا ہے پلیز آپ اس کی وضاحت ضرور کیجئے گا۔

سباس گل کا ناولٹ بھی رمضان کے حوالے سے اچھی تحریر تھی، سلسلے وار ناول ''اک جہاں اور ہے'' کو سدرۃ المنتہیٰ بڑی خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھا رہی ہیں ایک ایک کردار پر ان کی محنت نظر آتی ہے ہر بار ایک نیا واقعہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرواتا ہے۔

اُم مریم کی تحریریں میں نہیں پڑتی اس لئے اس کے ناول کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی، افسانوں میں شاہین بھٹی کا افسانہ ستمبر کے حوالے سے بہترین تحریر تھی، بے حد پسند آئی، ''لوبرڈ'' قرۃ العین ہاشمی نے بھی اچھی کوشش کی، سیمیں کرن نے ''تالے چابیاں'' میں ادبی لوگوں کی صحیح تصویر کشی کی، جتنا بڑا ادیب ہو گا اتنا ہی اس کے قول و فعل میں تضاد ہو گا، مریم ماہ منیر کا افسانہ بالکل متاثر نہ کر سکا کہانی کی سمجھ ہی نہیں آئی، اب بات ہو جائے عابی ناز کی عابی ناز کی جب حنا میں آمد ہوئی تھی لگا تھا کہ مزاح کی دنیا میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوں گی مگر وہ اپنا معیار دو تین تحریروں میں ہی برقرار رکھ پائی، آپ تو مزاح کے پیدا کرنے کے چکر میں وہ تھیٹر کی تحریر بنا رہی ہیں پلیز عابی ناز آپ طرف توجہ دیں۔

حنا کا بہترین سلسلہ ''چٹکیاں'' کی شکل میں ہے سید شگفتہ شاہ بڑی محنت سے اس سلسلے کو لکھ رہی ہے اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں مبارک باد۔

سیمیں کرن کتاب نگر میں اس بار شہاب نامہ کے تبصرے کے ساتھ آئیں سیمیں جی معذرت جتنی طویل کتاب ہے اس کے مقابل آپ کا تبصرہ انتہائی مختصر تھا۔

حاصل مطالعہ میں حفصہ خان، رملہ ملک اور علینہ طارق کا انتخاب بے حد پسند آیا۔

بیاض میں بھی قارئین کی پسند اعلیٰ تھی میری ڈائری میں فرح راؤ اور افشاں زینب کا انتخاب دل میں اتر گیا، رنگ حنا اور حنا کی محفل کا اپنا ہی مزہ ہے، دستر خوان میں افرا طارق مزے مزے کے پکوان لے کر آتی ہے اور داد پاتی ہے رہی بات کس قیامت کے یہ نامے کی تو فوزیہ آپی آپ کسی کا بھی دل نہیں توڑتی سب کو اتنی محبت سے

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیئے

ابن انشاء

اردو کی آخری کتاب .... ☆
خمار گندم .... ☆
دنیا گول ہے .... ☆
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☆
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☆
چلتے ہو تو چین کو چلئے .... ☆
نگری نگری پھرا مسافر .... ☆
خط انشاجی کے .... ☆
بستی کے اک کوچے میں .... ☆
چاند نگر .... ☆
دل وحشی .... ☆
آپ سے کیا پردہ................ ☆

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قواعد اردو .... ☆

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبرز 7321690-7310797

ایک لڑی میں پرو کر رکھا ہے ہر بندہ ہی اپنی جگہ اہم ہے میں آپ کی اس محفل میں پہلی بار آئی ہوں جگہ ملی تو آئندہ بھی آتی رہوں گی۔

فرح زیاد خوش آمدید ڈیئر ستمبر کا شمارہ آپ کے ذوق پر پورا اترا ہمیں جان کر خوشی ہوئی آپ کی تعریف اور تنقید دونوں ہمارے لئے اہم ہے اور آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ ہم شائع بھی کرتے ہیں، فآپ کی محبتوں اور تفصیلی رائے کے ہم اگلے ماہ بھی منتظر رہیں گے شکریہ۔

آنسہ زاہد: کمالیہ سے لکھتی ہیں۔

ستمبر کا شمارہ اپنی خوبصورتی میں بے مثال تھا ٹائٹل سے لے کر تحریروں تک بہترین تھا، حمد و نعت پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح دل کی آنکھ سے پڑھیں۔

آگے بڑھے اور عزہ خالد کی روداد سنتے ہوئے اُم مریم کے جزیرے میں جا پہنچے جہاں وہ نئے واقعات کے ساتھ جلوہ گرھیں اُم مریم کی ناول کے سٹارٹ سے لے کر اب تک میں ساری ہمدردیاں فرینب کے ساتھ رہیں اور مجھے یقین ہے آئندہ بھی وہ زینب پر ہی فوکس رکھیں گی، سدرۃ المنتہیٰ کی تحریر کچھ الجھی سی محسوس ہوتی ہے میں نے ایک عرصے سے سدرۃ المنتہیٰ کو پڑھ رہی ہوں، حنا میں شائع ہونے والی ان کی یہ تحریر کچھ پر اسرار سی ہے، مکمل ناول میں ''بند مٹھی میں خواہش'' بے حد اچھا تھا، فرح طاہر کی تحریر اگر اتنی طویل نہ ہوتی تو شاید زیادہ بہترین ہوتی، ''کاسہ دل'' میں اپنے اختتام کو پہنچا اور سندس نے اس کا وہی اینڈ کیا جو پریوں، شہزادیوں کی کہانیوں کا ہوتا ہے یعنی سب خوشی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

پورے ناولٹ میں سندس نوفل کا کردار ضرورت سے زیادہ اہم دکھایا آپ نے اس کے علاوہ ناولٹ کے دوران آپ نے ذکر کیا تھا کہ شاہ بخت کا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے جس میں اس کا وہ خوبصورت چہرہ جس پر اس کو غرور ہوتا ہے وہ مسخ ہوگیا، آگے چل کر کر آپ نے کہیں بھی اس چیز کا ذکر نہیں کیا، ''ھذا من فضل ربی'' میں سباس گل نے اس بے حس معاشرے کی درست تصویر کشی کی ہم سب واقعی اس معاشرہ کا حصہ ہیں جہاں ہمیں یہ نہیں پتا ہوتا کہ ہمارے ہمسائے کے گھر کتنے دن سے چولہا نہیں جلا ہاں یہ ضرور پتا ہوتا کہ آج اس کے گھر کون آیا اور کیوں آیا؟ اللہ پاک ہم سب کو درد دل عطا کرے کہ ہم اپنے آس پاس رہنے والوں کے دکھ درد کو جان سکیں ان کی مدد کریں، سباس مبارک باد آپ نے بے حد اچھا لکھا۔

افسانے چھ تھے اور سبھی اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھے تھے مگر شاہین بھٹی کی تحریر نے آنکھیں نم کردیں، بے شک شہید کی موت قوم کی حیات ہے، ''تالے چابیاں'' ہمیں سیمیں کرن کی آپ بیتی لگی جبکہ عابی ناز نے آخری عشق کی پہلی عید میں بھی مزاج کا اچھا تاثر پیدا کیا۔

مستقل سلسلے سبھی بہترین تھے، فوزیہ آپیف ایک دن حنا کے ساتھ میں کیا صرف مصنفین ہی لکھ سکتے یا قارئین بھی حصہ لے سکتے ہیں ضرور بتایئے گا۔

آنسہ زاہد خوش آمدید، ستمبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ حنا کے ساتھ ایک دن ابھی تو مصنفین ہی گزار رہی ہیں لیکن انشاء اللہ ہم جلد ایک ایسا سلسلہ شروع کریں گے جس میں حنا کے قارئین بھی حصہ لے سکیں اور بتا سکیں کہ وہ اپنی زندگی کن خطوط پر گزارتے ہیں، آئندہ بھی اپنی رائے سے نوازتی رہیے گا شکریہ۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں:۔
✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
We Are Anti Waiting WebSite
واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety1